مختلف مضامین

۱۳

علّامہ نصیرالدّین نصیر ہونزائی

کے ٹرانسکرائب لیکچرز

تمہید

استادِ بزرگوار علامہ صاحب ؒ نے اپنی صد سالہ عمرِ گرانمایہ میں اپنی زبانِ فیض باراور قلمِ جواہر نگار سے کتابوں کے علاوہ آڈیو لیکچرز کی صورت میں ایک بیش بہا خزانہ عالمِ انسانیت کے لئے عطا کیا ہے۔ اِن لیکچرز کی اہمیت کے حوالے سے آنجناب خود فرماتے ہیں:

''ہمارے کیسٹوں میں جو تقاریر ہیں وہ بنیادی اور اساسی مواد کا کام دیں گے، یعنی اُن سے اسماعیلی مذہب پر ریسرچ میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ میرے نزدیک ہر کیسٹ کا مواد ایک کتابچہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں بڑی اہم باتیں ریکارڈ ہوئی ہیں۔ کیسٹوں کے قیمتی مواد کو محفوظ کر لینا ضروری ہے، کیونکہ یہ ہماری پیاری جمعیت کی دولت ہے، یہ ہمارے علمی سرمایے کا ایک اہم حصّہ ہے، اور ہم کو یقین ہے کہ مستقبل میں ہمارے ان علمی کاموں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہونے والا ہے، ہماری تحریروں کے ایک ایک پُرزے پر ریسرچ ہوگی، کیونکہ ہماری نگارشات میں امامِ عالیمقامؑ کی نورانیت و روحانیت براہِ راست کار فرما ہے''۔ (غیر مطبوعہ)

استادِ گرامی ؒ کی اِس روشن ہدایت کے پیشِ نظر اِن گرانمایہ دُرّ و مرجان کو ضبطِ تحریر میں لانے کا انتہائی اہم اور دقیق کام استاد بحرالعلوم صاحب کی سرپرستی میں شروع کیا گیا ہے۔ اور آپ نے اِس سلسلے میں خانۂ حکمت کے تمام سینٹرز میں جا کر اس کام کی اہمیت کے حوالے سے آگاہی اور رہنمائی فرمائی ہے اور ناچیز کو اِن لیکچرز کو تحریر میں لانے اور منظم کرنے کی ذمہ داری دی ہے اس سلسلے میں کئی احباب انتہائی جانفشانی سے کام کر رہے ہیں۔ ان خزائن کو جماعت اور دنیائے انسانیت تک پہنچانے کے لئے محترم مصطفیٰ مومن صاحب نے اسے (ebook) کی صورت میں پیش کرنے میں ہماری مدد فرمائی ہے۔

ناچیز نسرین اکبر

مختلف مضامین ۔٦

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضمون	لیکچر نمبر	صفحہ نمبر
۱	روح جنّت کا ایک پھل، درختِ زقوم (۵۶:۵۲)، مُذَکِّر (۸۸:۲۱) کی حکمت، ہر مخلوق کا تسبیح پڑھنا (۲۴:۴۱)، خدا کا ایک نام سیڑھیوں والا (۷۰:۳)	۵۱	۱
۲	کچھ اعلیٰ سوالات کے جوابات	۵۲ الف	۹
۳	کچھ اعلیٰ سوالات کے جوابات	۵۲ ب	۲۳
۴	قربانی کی حکمتیں	۵۳	۳۰
۵	مومن کی قوّتیں نور بن جاتی ہیں، قرآن علمی کائنات	۵۴	۳۵
۶	خصوصی بندگی، شوریٰ کا حقیقی تصوّر	۵۵	۵۰
۷	شیطان کا حملہ اور مومن کا دفاع، اختیار	۵۶	۶۱
۸	معرفت کی اہمیت	۵۷	۷۶
۹	دین کی تمام خوبیوں کا فائدہ مومنین کے لئے ہے، قسمت و اختیار	۵۸	۹۳
۱۰	بہانۂ رحمت	۵۹	۱۱۰
۱۱	گنجِ مخفی = امامِ زمانؑ	۶۰	۱۲۴

استادِ بزرگوار علامہ نصیر الدین نصیرؔ ہونزائی (ق) کا پُرحکمت بیان

عنوان: رُوح جنّت کا ایک پھل، درختِ زقوم (۵۲:۵۶)، مُذَکِّر (۲۱:۸۸) کی حکمت، ہر مخلوق کا تسبیح پڑھنا (۴۱:۲۴)، خدا کا ایک نام سیڑھیوں والا (۳:۷۰)

کیسٹ نمبر: ۵۱   تاریخ: ۱۰/ستمبر ۱۹۸۱ء کراچی

Click here for Audio

باغ وگلشن میں سے اچھے اچھے پھلوں کو اور تازہ تازہ گلوں کو چُن کے پیش کیا۔ غور سے دیکھا جائے تو اِن کی باتوں میں بہت گہرائی کی حقیقتیں تھیں، انہوں نے بہت اچھی طرح سے دلیل پیش کی کہ خداوندِ عالم نے مومنین کو بہشت میں پھلوں سے رزق دینے کا وعدہ کیوں کیا؟ ویسے تو دُنیا کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اور بھی بہت ساری غذائیں، چیزیں ہیں جو کھانے سے متعلّق ہیں، لیکن دُنیا کے کسی اور کھانے سے مثال نہیں دی ہے خدا نے صرف پھلوں سے بہشت کے رزق کی مثال کیوں دی؟ پھر انہوں نے فرمایا کہ اِس کی وجہ یہ ہے کہ پھل سے رُوح مُراد ہے کیونکہ رُوح بھی ایک طرح کے پھل کی طرح ہے، پھل ہے۔ جسم درخت ہے رُوح پھل ہے کیونکہ جس طرح پھل کو درخت پر ہونا ہے، درخت پر پکنا ہے مرحلہ بمرحلہ تکمیل کو پھل پہنچتا ہے درخت پر، اِس طرح رُوح کی تکمیل بھی اِس شخصیّت کے ساتھ ہے۔ شخصیّت یعنی جسم گویا ایک درخت ہے اور انسان کی رُوح ایک پھل ہے صرف انسان کی رُوح نہیں بہت ساری چیزوں کے اندر جو حقیقت ہے تو وہ حقیقت گویا اُس چیز کی رُوح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بہشت کے اندر رُوح کی صورت میں مومن کو زندہ حقیقتیں ملیں گی جن میں دُنیا کی کسی غذا سے بڑھ کر لذّت اور حلاوت ہے تو پھر انہوں نے اِس کو (explain) کیا۔

اُس کے بعد آگے چل کر انہوں نے فرمایا کہ درختِ زقوم (۵۲:۵۶) کا پھل جو دوزخیوں کو نصیب ہوگا وہ پھل شیاطین کے سروں کی طرح ہے۔ اب دیکھیں کہ قرآن کی زبان بھی کس قدر عجیب ہے اور کس طرح خداوندِ عالم حکمت کو پہنچانا چاہتا ہے، تو شیاطین کے سَر کو کس نے دیکھا کہ کوئی سمجھے کہ خدا کیا سمجھانا چاہتا ہے اور زقوم کا پھل شیاطین کے سَروں کی طرح ہے تو یہاں شیاطین سے امامؑ کے دُشمن مُراد ہیں اور امامؑ کے دُشمن بھی تو انسان ہیں، اُن کا سَر کچھ اور طرح سے نہیں ہے بس وہ ایک انسانی سَر ہے لیکن پھر فرق کیا ہے؟ امامؑ کے دوستوں کے سَر میں کیا ہے اور امامؑ کے دُشمن جو شیاطین ہیں اُن کے سَروں میں کیا ہے؟ امامؑ کے دُشمنوں کے سَر میں جہالت ہے اور امام کے دوستوں کے سروں میں علم ہے، حقیقت ہے، معرفت ہے، تو خدا اِس اشارے میں یہ فرمانا چاہتا ہے کہ جو جہنمی لوگ ہوں گے اُن کو جہالت نصیب ہوگی،

اُن کو نادانی نصیب ہوگی اُن کو کبھی علم معرفت نصیب نہیں ہوگی، اُن کو کسی زمانے میں حقیقت نصیب نہیں ہوگی تو درختِ زقوم کا جو پھل ہے وہ شیاطین کے سروں کے مشابہ ہیں، سے مُراد جہالت ہے۔لہٰذا غور کرنے کی ضرورت ہے ہمارا دین باطنی دین ہے تاویلی دین ہے اور اِس میں خزانے کے خزانے ہیں، خزانے کے خزانے ہیں۔

پھر آپ نے سُنا کہ خانۂ کعبہ سے متعلّق کیا فرمایا گیا ہے تو خانۂ کعبہ ایک ایسا مقام ہے جہاں پر دُنیا بھر کے پھل کھینچ کھینچ کر پہنچ جاتے ہیں (۲۸:۵۷)۔کیا کسی نے ظاہر میں یہ بات دیکھی ہے، اِس وقت کیا دُنیا بھر کے پھل کھینچ کھینچ کر اُڑ کر معجزانہ طور پر پہنچتے ہیں، یہ بات نہیں ہے، یہ امامؑ کے نور کی بات ہے جو حقیقت کا کعبہ ہے، اور جو شخص امامؑ کے نور کو پہنچتا ہے تو وہ خانۂ کعبہ میں جا چکا ہوتا ہے اُسی مقام پر دُنیا بھر کی رُوحیں پہنچتی ہیں، دُنیا بھر کی رُوحیں جو پھل ہیں وہ وہاں پر کھینچ کھینچ کر پہنچتی ہیں اور ہر چیز کی رُوح سے مُراد ہر چیز کی حقیقت، ہر چیز کی شناخت، ہر چیز کی معرفت جو کہ رُوحِ مومن کے لئے رزق کی حیثیّت سے ہیں، تو یہ چیزیں مرتبۂ امامؑ میں پہنچ جاتی ہیں۔مقصد یہ ہے کہ اسمٰعیلی مذہب تاویلی مذہب ہے سب ہی مانتے ہیں، اسمٰعیلی مذہب باطنی مذہب ہے، تو ہمیں یہ اقرار ہے کہ اسمٰعیلی مذہب باطنی مذہب ہے لیکن ہمارے جو مخالفین ہیں وہ طنز کے طور پر کہتے ہیں فرقۂ باطنیہ، یعنی وہ طنز کرتے ہوئے مانتے ہیں کہ ہم بیشک باطنی ہیں یعنی ہم وہ لوگ ہیں جو قرآن کی گہرائی تک جا سکتے ہیں اور ہر چیز کے باطن سے ہمارا تعلّق ہے صرف ظاہر نہیں، تو ظاہر تک ہر شخص رسا ہو سکتا ہے، بات یہ ہے کہ کوئی باطن کو پہنچے تو اِس لئے ہم کو باطنی کہا جاتا ہے اور یہ غلط نہیں ہے بیشک ہم باطنی ہیں، لوگ کس طرح سے بھی کہیں، کچھ بھی کہیں ہم باطنی ہیں کوئی شک نہیں ہم رُوحانی ہیں اور تاویلی ہیں، اِس لئے قرآن کے اندر تاویل کا جتنا حصّہ ہے اُس سے ہم فائدہ اُٹھاتے ہیں اور یہ امامؑ کی رحمت اور مہربانی ہے۔اب میں اِس مقام پر رُکتا ہوں اور چونکہ ہماری دُوسری بیٹی یہاں آئی ہوئی ہیں وہ آپ کو بہت اچھی اچھی باتیں بتائیں گی۔اب میں اُن سے عرض کروں گا، وہ اپنی علمی باتیں آپ کو پیش کریں۔

"مُذَکِّر" (۸۸:۲۱) کا انہوں نے مطلب بتایا (reminder) یاد دلانے والا، یاد دہانی کرانے والا تو سوچا جائے کہ جنہوں نے کلمہ پڑھایا جو اُس سے بھی آگے بڑھ کر حقیقی مومن ہو گئے اُن کو رسولؐ نے کیا کیا چیزیں یاد دلائی تھیں۔یاد دلانا یوں ہوتا ہے جیسا کہ شاہدہ بیٹی نے بتایا کہ آگے کوئی چیز دیکھی ہو، کوئی چیز پائی ہو، کسی شئ کا مشاہدہ ہو چکا ہو اُسی کی طرف توجّہ دلانا، اُسی کو دوبارہ یاد کرانا یہ ہوتا ہے یاد دہانی لیکن جن مومنوں نے ایمان کو قبول کیا تھا اُن کو دُنیا کے لحاظ سے ظاہری اعتبار سے کون سے واقعات کو یاد دلانا تھا، سوائے اِس کے کہ ہم مانیں کہ رُوح ایک ازلی حقیقت ہے اور رُوح پر عالمِ رُوحانیت میں بہت سے واقعات گزرے ہیں، مثلاً اَلست کے موقع پر اور اُس سے قبل کہ رُوح کہاں تھی اور رُوح کا وہ سر اکس طرح خدا کی حقیقت کے ساتھ مل کر ہے وغیرہ یا یوں کہا جائے کہ علمِ لدُنّی یعنی وہ علم جو (direct) خدا سے

ملتا ہے یعنی رُوحانی علم، اُس علم کو یاد دلانا ہی یاد دہانی ہے اور اسی کام کرنے والے کا نام" مُذَکِّر " ہے عربی میں (reminder)،(reminder) دوبارہ یاد دلانے والا۔ تو جہاں پیغمبرؑ کا ٹائیٹل " مُذَکِّر " ہے یاد دلانے والا تو آج دُنیا کے سب مسلمین رسولؐ کو مانتے ہیں اُن پر رسولؐ کے اِس نام کا اطلاق کس طرح ہوگا؟ یعنی اِن لوگوں کو رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ والہٖ وسلّم کس طرح حقائق کو یاد دلائیں گے، کیا یہ صحیح ہے کہ روایات و حکایات اور کتابوں کے وسیلے سے یہ کام ہوگا، نہیں، نہیں ہوگا۔ (reminder) کا کام اِس کے بغیر نہیں ہوسکتا ہے کہ رسولؐ کا جانشین دُنیا میں موجود ہو اور پھر اِس کے بغیر بھی ناممکن ہے کہ یہ کام رُوحانی طور پر ہو جائے، ورنہ ظاہر میں یہ بات نہیں بنتی ہے کہ پیغمبرؑ کے قریب سب لوگ جمع ہو جائیں اور اجتماع بنائیں اور رسولؐ اُن کو لیکچر دیں، سبق پڑھائیں، درس دیں، کتاب کھولیں اور حرف بہ حرف اُنگلی سے بتائیں کہ یہ ہے۔ یہ بات بننے والی نہیں ہے پیغمبرؑ کے لئے بھی اور امامؑ کے لئے بھی، سوائے اِس کے کہ اِس میں ایک فارمولا ہو، ایک اُصول ہو، ایک چابی کی طرح کام بنے، ایک کلید ملے وہ یہ کہ جیسا کہ اسی ٹائٹل کے اندر ایہ اشارہ ہے " مُذَکِّر " ذکر کروانے والا، تو امامؑ اپنے مومنین کو عام عبادت کے بعد اسپیشل عبادت دے، اُن کو بول دے، اُن کو ذکرِ خدا دے، اُن کو اسمِ اعظم دے تو یہ ہوا " مُذَکِّر " ذکر دینے والا، بول دینے والا، اسمِ اعظم دینے والا، بالکل صاف معنی ہیں اِس میں ذرا بھی فرق نہیں ہے، تو پیغمبرؑ " مُذَکِّر " ہے یعنی بول دینے والا، اسمِ اعظم دینے والا اور آپ کی جگہ پر امامؑ " مُذَکِّر " ہے اور وہ (reminder) ہے۔

جب اسمِ اعظم دیتے ہیں، بول دیتے ہیں تو ازلی حقیقتوں کو یاد دلاتے ہیں اور کسی مومن کے پاس اگر رُوحانی علم آتا ہے تو وہ رُوحانی علم کوئی نئی شئی نہیں ہوتا وہ بہت پُرانی شئی ہے، وہ ازلی حقیقت ہے، وہ قدیم چیز ہے تو یہ یاد دہانی کے طور پر علم آتا ہے اور جو مومن حقیقت کو پاتا ہے، رُوحانیت کے مقام پر حقیقتوں کا مشاہدہ کرتا ہے وہ (reminder) کے طور پر کرتا ہے کہ اُس کی رُوح اِن ہی حقائق میں تھی اب بھی ہے پہلے بھی تھی، تو اِن کی طرف سے جو ہادیٔ برحق ہے خواہ وہ رسولؐ ہو یا امامؑ وقت جس کا ہو وہی تو وہ مومنین کو یاد دہانی کراتا ہے، (remind) کراتا ہے، دوبارہ اُن کو اُن حقیقتوں تک پہنچا کے اُن کا مشاہدہ کراتا ہے اِس معنی میں، تو انہوں نے سورۂ اعلیٰ (۸۷) کو اِس لئے لیا کہ وہاں پر بہت سی حقیقتیں ہیں، ویسے تو قرآن کی ہر آیت میں حقیقتیں ہیں، اسمٰعیلی حقیقتیں کہنا چاہئیں کیونکہ دُوسرے لوگ قرآن کے باطن کو نہیں مانتے ہیں وہ تو ظاہر کے ساتھ تعلّق رکھتے ہیں لہٰذا قرآن کا جو باطن ہے، قرآن کی جو تاویل ہے، قرآن کی جو حکمت ہے وہ اسماعیلیوں کے نصیب میں ہے تو اِس لئے یہاں اِس سورہ کے اندر اور ہر مقام پر اسمٰعیلی حقیقتیں ہیں۔

کتنی اچھی بات تھی انہوں نے جو بتایا، کہ تسبیح کی انہوں نے تشریح کی کتنی اچھی بات ہے اور تسبیح کے بارے میں انہوں نے کہا کہ تسبیح ہر مخلوق کی ہے، قرآن کی ایک آیت ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ ہر چیز اپنی تسبیح جانتی

ہے(۴۱:۲۴)توتسبیح ایک نہیں ہے، پتّھر کی بھی تسبیح ہے ۔آپ پوچھیں گے تعجّب سے کہ پتّھر جو بے زبان ہے کیا وہ تسبیح پڑھتا ہے؟ تو میں کہوں گا ہاں! پتّھر زبانِ قال سے نہیں پڑھتا، زبانِ حال سے ۔زبان دو ہیں ایک ہے زبانِ قال گفتگو کی زبان، ایک ہے کیفیت کی زبان تو اِس کو زبانِ حال کہتے ہیں، حال یا حالت یعنی پتّھر کی جیسی حالت ہے و ہی حالت (interpret) کرتی ہے، ترجمانی کرتی ہے کہ کیا کہنا چاہیئے، تواسی طرح دُنیا کے اندر جتنی مخلوقات ہیں اور مخلوقات کے جتنے درجات ہیں تو ہر درجے کی مخلوق خدا کی ایک تسبیح پڑھتی ہے لیکن بحیثیتِ مجموعی انسان کا جو درجہ ہے وہ اُوپر ہے لہٰذا انسان کی تسبیح اِن دیگر مخلوقات سے بڑھ کر ہے لیکن انسان میں بھی اتنے درجات ہیں جتنے کہ دیگر مخلوقات میں پھر درجہ جیسے جیسے اُوپر کو جاتا ہے تسبیح بھی ایسی اعلیٰ سے اعلیٰ بنتی ہے، تواِس کی ایک مثال یہ کہ سبحان کے معنی عوام کیا کرتے ہیں میں آپ کو بتاؤں، ہر عیب سے پاک، ہر نقص سے پاک تو یہ بھی کوئی معنی ہے، خدا کا ذکر عیب کے ساتھ نقص کے ساتھ ہو یہ بہت کمزور بات ہے ۔اہلِ ظاہر سبحان اللہ کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ خدا ہر عیب سے پاک ہے، ہر نقص سے پاک ہے یہ تو خدا کی شان میں ایک گستاخی سے کم نہیں ہے یہ بھی کوئی تعریف ہے! یہ بھی کوئی صفت ہے! یہ بھی کوئی حمد وثناء ہے! نہیں!! خدا ہر صفت سے بالا ہے جولوگ خدا کے لئے اوصاف بیان کرتے ہیں اُن سے بالاتر اُن سے بلند و بالا اور ناموں سے بھی بلند و بالا، یہ نام عارضی ہیں، وقتی ہیں ۔

آپ کو تعجّب ہوگا کہ یہ کیوں ایسا ہے، میں عرض کروں گا کہ علم کے (stages) ہوتے ہیں، مدارج ہوتے ہیں، مراتب ہوتے ہیں، ہر شخص کو اُس کے درجے کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے جب اُس درجے کی تعلیم وہ مکمّل کرتا ہے تو اُس کو اُوپر کے درجے کی تعلیم دی جاتی ہے ۔قرآن کا کہنا ہے کہ خدا سیڑھیوں والا ہے (۷۰:۳) سیڑھی (upstairs) خدا کی سیڑھیاں ہیں یعنی کوئی خدا کی طرف جاتا ہے تو زینہ بہ زینہ جاتا ہے (stage by stage) جاتا ہے، اور جو انسان یا جو گروہ یا جو مذہب جس (stage) پر جس (step) پر کھڑا ہے اُس کو اُس (step) کے مطابق خدا کی تعریف کرنی ہے لیکن اُوپر کے (step) پر جائے گا تو یہ تعریف بیکار ہو جائے گی یہی تو خدا کی شان ہے، بیکار ہو جائے گی ۔جس طرح کوئی قاعدہ پڑھتا ہے تو پہلی کلاس میں جانے کے بعد تعلیم کام تو آتی ہے لیکن وہ باتیں نہیں رہتی ہیں (standard) اُونچا ہو جاتا ہے، تو جیسے جیسے تعلیم آگے بڑھتی ہے ویسے ویسے (standard) یا معیار بڑھتا چلا جاتا ہے، اسی طرح رُوحانیت میں بھی ہے کہ یہ حدودِ دین انہوں نے آپ کو بیان کیا، حدودِ دین کیوں ہیں؟ یہ تعلیم کی وجہ سے ہیں ایک مُرید یا ایک مسلمان کو لیجئے جو صرف ’’لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ ‘‘ کہہ کر مسلمان بن جاتا ہے تو وہ کیا جانتا ہے وہ ایک مستجیب یعنی مُرید ہے وہ تو مُرید ہے، ماذون اِس سے اُوپر ہے اور ماذونِ اکبر اُس سے بھی اُوپر ہے اور چھوٹا داعی اُس سے بھی اُوپر ہے اور بڑا داعی اُس سے بھی بالا ہے اور جزیرے کا حجّت اُس سے اُوپر ہے اور جو حضوری حجّت ہے وہ اُس سے بھی بالا ہے اور وہاں چار حجّت ہیں

پھر باب ہے یعنی امام کا گیٹ۔

دیکھیں یہاں گیٹ کا تصور ہے خدا کا گیٹ، پیغمبرؐ کا گیٹ، امامؑ کا گیٹ کیوں؟ گیٹ سے جایا جاتا ہے، گیٹ کا تصوّر صحیح ہے گیٹ کے بغیر کوئی رستہ نہیں ہے تو پھر امامؑ کا گیٹ ہوتا ہے گیٹ سے گزر کر آپ کو امامؑ میں جانا ہوگا پھر امامؑ میں جانے کے بعد پھر بھی مراتب ہو سکتے ہیں، لیکن ایک بات یاد رکھیئے درجات ہیں پھر آخر میں اُن درجات کی (unity) بھی ہے جس طرح کوئی سیڑھی ہے اُس میں زینے ہیں (steps) ہیں لیکن اُن کے اندر (unity) بھی ہے، اُن سب کا ایک مقصد بھی ہے، ایسا نہیں کہ سیڑھی کے جو اجزاء ہیں جو (stairs) ہیں وہ الگ الگ ہیں، وہ مل کر یں وہ مل کر ایک شئ بن جاتے ہیں، چنانچہ یہ حدود یا یہ درجات سب ایک مقام پر مل جاتے ہیں، اگر ہم تعلیم کے طور پر آپ کو خدا کا درجہ الگ اور امامؑ کا درجہ الگ بتاتے ہیں تو آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ خدا اور ہے اور امامؑ اور ہے یہ بات نہیں ہے، یہ تعلیم کی بات ہوئی ہے۔ اب اِس سے اُوپر جائیں گے تو پھر پتہ چلے گا کہ یہ درجات کس طرح آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ تو جہاں پر وحدت ہوتی ہے یا جہاں پر (stages) کی (unity) ہوتی ہے تو اُس مقام پر ایک ہی درجہ ہوتا ہے۔ یہ مصلحتی بات ہے کہ خدا کا درجہ الگ اور امامؑ کا درجہ الگ بتا دیا جاتا ہے، یہ تعلیم کے لئے ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی بتایا اُوپر جاتے جاتے جو نچلی تعلیمات ہیں وہ کسی حد تک بیکار ہو جاتی ہیں یعنی کام آتیں ہیں جس طرح کسی سیڑھی چڑھتے ہوئے جو پہلا زینہ ہے وہ ضروری ہے لیکن اُس زینے کو پس پشت چھوڑنے کے بعد وہ چنداں کام نہیں آتا ہے اور پھر انسان کو اگلا زینہ چاہیئے، اُس سے اگلا زینہ چاہیئے، اُس سے اگلا زینہ چاہیئے۔

قرآن کے اندر مجھے کہنے دیجئے کہ ناسخ اور منسوخ کا تصوّر ہے اِس کو لوگ نہیں سمجھتے ہیں، اُن کا یہ خیال ہے کہ کچھ آیات ہمیشہ کے لئے اور سب کے لئے منسوخ ہیں یہ بات نہیں ہے۔ بات اصل یہ ہے کہ بات حقیقت میں یہ ہے کہ انسان کو خدا کی طرف جانا ہے اور خدا کی طرف جاتے جاتے بہت سی چیزیں پس پشت رہ جاتی ہیں اور انسان کو یہ حکم ہے کہ وہ ہمیشہ سامنے کو دیکھے اُوپر کو دیکھے اور آگے بڑھے، تو جو انسان ہم سے بہت آگے ہیں اُس کے لئے ہم جو کرتے ہیں وہ بیکار ہے کیونکہ ہمیں معلوم نہیں ہے کہ وہ کس طرح عبادت کرتا ہے، کس طرح بندگی کرتا ہے ہم کو معلوم نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ بندگی میں بھی مراحل ہوں، ہوسکتا ہے کہ کوئی سوچتے سوچتے عبادت کرتا ہو، ہوسکتا ہے کہ کوئی علمی طور پر بندگی کرتا ہو، ہوسکتا ہے کہ کوئی مناجات کے طور پر عبادت کرتا ہو تو بہت سی چیزیں ہیں۔ ابھی انہوں نے بتایا کہ حضرت ابراہیمؑ کو قرآن میں توحید کا نمونہ قرار دیا ہے، یہاں تک کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ والہٖ وسلّم سے فرمایا گیا ہے کہ اے رسولؐ! آپ ابراہیمؑ کی پیروی کیجئے توحید کے معاملے میں اور بہت سی باتوں میں (۶۸:۳)۔ اب اِس کے نتیجے میں ہم ابراہیمؑ کے احوال کو قرآن کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو وہی بات ہے کہ ابراہیمؑ پہلے ایک ستارے کو ربّ مانتا ہے، جب وہ ڈوب جاتا ہے تو چاند کو پروردگار قرار دیتا

ہے، جب وہ بھی ڈوب جاتا ہے تو سورج کو ربّ مانتا ہے جب وہ بھی ڈوب جاتا ہے تو کہتا ہے کہ: ’’لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ‘‘ (۶:۷۶) میں ڈوبنے والوں سے دوستی نہیں رکھتا۔ اسی صورتحال کے باوجود خداوند نے اُس کو توحید کا نمونہ قرار دیا تو پھر خدا کا مقصد یہ ہوا کہ انسان بھی ابراہیمؑ کی طرح خدا کے معاملے میں آگے بڑھے۔ مثال کے طور پر یہ کچھ خاص باتیں ہو رہی ہیں اگر امامؑ خدا نہیں ہے (suppose) تو پھر بھی اِس میں کوئی شرک نہیں ہے اِس لئے کہ قرآن نے ایسا بتایا کہ تمہارے سامنے جو ہے اُس کو ربّ مانو جس طرح ابراہیمؑ نے پہلے ستارے کو مانا تو ستارے نے اُس کو چاند تک پہنچایا یعنی ستارے کے آگے بڑھنے نے اور ستارے کے ڈوبنے نے دکھایا کہ چاند بھی ہے تو چاند نکلا اور چاند نے اِس کی ہدایت کی سورج تک پہنچایا اور سورج نے اُس مقام تک ہدایت کی جہاں تک کہ ہدایت کرنی تھی، اسی طرح اگر بفرضِ محال امامؑ خدا نہیں ہے تو بھی کسی مومن کا امامؑ کو ربّ ماننا قرآن کی رُوح سے کفر نہیں ہے توحید ہے۔ میں نے بہت استحکام کے ساتھ ابراہیمؑ کی مثال کو پیش کرتے ہوئے یہ بات کی، ایسا نہیں کہ ہم نہیں جانتے ہیں لیکن ہم نے ایک مثال اِس طرح سے دینا چاہی اور دُوسری صورت میں اگر امامؑ خدا ہے تو بھی وہی بات ہے دو باتوں میں سے ایک تو ہوگی، یہ کتنی اچھی (logic) ہے یا تو امامؑ خدا ہے یا نہیں ہے دونوں صورتوں میں امامؑ کو اپنا ربّ ماننا ہے۔

ربّ معنی پروردگار پرورش کرنے والا یعنی آپ کو رُوحانی غذا مہیّا کرنے والا، علم کی غذا، ہدایت کی غذا، رُوحانیت کی غذا اور عقل کی غذا، حکمت کی غذا تو امامؑ ہی مہیّا کرتے ہیں، اور یہ تو ایک مثال کی بات تھی ایسا نہیں ہے کہ آپ اور ہم اِس بارے میں ابھی تک نہیں جانتے ہیں، ہم جانتے ہیں اور بڑے استحکام کے ساتھ جانتے ہیں اور جاننے کی مثال میں آپ کو بتاؤں وہ یہ کہ اسلام کے اندر شریعت ہے، طریقت ہے، حقیقت ہے، معرفت ہے اِس اعتبار سے، ویسے تو مسلمانوں کی تقسیم مختلف اعتبارات سے ہے لیکن اِن چار مراحل کے اعتبار سے کچھ تو اہلِ شریعت ہیں، کچھ اہلِ طریقت ہیں اور ہم ماشاء اللہ اور انشاء اللہ اہلِ حقیقت ہیں اور ہمارے بزرگانِ دین اہلِ معرفت ہیں، تو اگر اسلام کے سلسلے میں بات کرنی ہے شریعت والوں کے ساتھ، تو ہم صوفیوں کی بات کریں گے کیونکہ اُن کے اور ہمارے درمیان وہی لوگ ہیں، شریعت والے تو ابتداء میں ہیں ہم اپنے کہنے کے مطابق آگے ہیں اور صوفی اُن کے اور ہمارے درمیان ہیں، تو ہم صوفیوں سے اِس کی (example) پیش کر سکتے ہیں وہ یہ کہ بہت سے صوفیوں نے خود کو خدا قرار دیا، اب اِس کے لئے کیا کیا جائے؟ اور حالانکہ آج ایسے لوگوں کی عزت کی جاتی ہے صوفیوں کو چھوڑ کر اہلِ شریعت میں بھی، مثلاً منصور نے ’’اناالحق‘‘ کہا، اِس کے دو معنی ہیں، ایک معنی تو یہ ہیں کہ اُس نے کہا کہ میں سچائی ہوں، صداقت ہوں، صدق ہوں اور دُوسرے معنی اِس کے یہ ہیں کہ میں خدا ہوں کیونکہ ’’حق‘‘ عربی لفظ ہے اِس کے دو معنی ہیں یہ خدا کے ناموں میں سے بھی ہے اور یہ سچّائی کے معنی میں بھی ہے لیکن ایک ایسا لفظ جو مشترک المعنیٰ ہے یعنی دونوں معنوں کے درمیان مساوی ہے اِس کو ایک عالم شخص جو

منصور تھے وہ ایک صوفی شخص کس طرح ایک ایسے لفظ کو استعمال کر سکتے تھے اِس (sense) میں کہ وہ معنی نہیں یہ معنی، دونوں معنی صحیح ہیں، مقصد یہ ہے کہ اُس نے خود کو خدا قرار دیا۔

دیکھئے! دوسرا ثبوت اگر اُس نے خود کو سچّائی کہا ہوتا تو اُس زمانے کے ملّا مولویوں نے اُس کو کیوں پھانسی دی؟ کوئی شخص کہتا ہے کہ میں سچّا ہوں یا سچّائی ہوں تو اِس میں کیا عیب ہے، اِس میں کیا اعتراض ہوسکتا ہے، اُنہوں نے جانا اُن کو معلوم ہوا کہ اُس نے خود کو خدا قرار دیا تھا اسی وجہ سے وہ برہم ہو گئے اور اسی وجہ سے اُس کو سُولی پر چڑھایا گیا، تو ہمارا مقصد اِس میں یہ (example) پیش کرنا ہے کہ ایک صوفی نے خود کو خدا کیوں قرار دیا۔ میں آپ کو گِنا سکتا ہوں ایک منصور نہیں ہے اور بھی بہت سارے ہیں، بہت سارے ہیں جنہوں نے خود کو خدا قرار دیا صوفیوں میں سے اور بعضوں نے اپنے مُرشد کو خدا کہا اور بعضوں نے خود کو خدا نہیں کہا، مُرشد کو بھی خدا نہیں کہا لیکن جس نے اُن سے آگے خدا کہا تھا اُس کی تصدیق کی اُس کی تعریف کی، اب جتنے لوگ اپنی نظموں میں یا نثروں میں منصور کی تعریف کرتے ہیں وہ گویا اُس کے نظریے کی تصدیق کرتے ہیں اِس کے لئے کیا کیا جائے۔ چونکہ میں نے ایک ایسی مثال دی تھی کہ اگر اِس پر آپ نے غور نہیں کیا تو آپ کو یوں لگے گا کہ میں اپنے دین کے بارے میں یا امامؑ کے بارے میں شک میں ہوں، میں ہرگز شک میں نہیں ہوں، مجھے یقین ہے اور آپ کو بھی یقین ہے انشاء اللہ، کہ ہم امامؑ کو مانتے ہیں جس طرح ماننا چاہئے اور جانتے ہیں جس طرح کہ جاننا چاہئے اور امامؑ کے علاوہ ہم اپنے پیروں کو بزرگوں کو بھی پہچانتے ہیں، اپنی رُوح کو بھی پہچانتے ہیں تو امامؑ تو امامؑ ہی ہیں، ہم اُس کے بچّے ہیں اُس کے مُرید ہیں، اُس کے غلام ہیں تو ہم کو معلوم ہے کہ اپنی رُوح کو کس مرتبے پر ماننا چاہئے۔ امامؑ کی ہدایت کی روشنی میں ہم مانتے ہیں، امامؑ کے فرمانوں کی روشنی میں مانتے ہیں کیا امامؑ نے دارالسّلام مشن کانفرنس میں یہ نہیں فرمایا ایک آقا اور ایک غلام کی تمثیل دیتے ہوئے رُوحانی آزادی کی بات نہیں کی آپ کو وہ فرمان پڑھنا چاہئے آپ کو وہ فرمان ضرور پڑھنا چاہئے، کیا امامؑ نے یہ نہیں فرمایا کچھ بزرگوں کا تذکرہ فرماتے ہوئے کہ وہ اپنی رُوح کے عاشق تھے [جو وہاں پہنچے وہ اپنی روح کے عاشق تھے (دارالسّلام ۲۹۔۹۔۱۸۹۹)]۔ اگر رُوح، مومن کی رُوح خدا کے ساتھ متّحد نہیں ہے، اگر رُوح کا وہ سرا نورِ خدا کے سرچشمے میں واصل نہیں ہے اور ہمیشہ سے ازلی طور پر، تو پھر امامؑ نے یہ کیوں فرمایا کہ وہ اپنی رُوح کے عاشق تھے، رُوح الگ اور اگر خدا الگ ہوتا تو اُس صورت میں مومن کو صرف خدا کا عاشق ہونا چاہئے تھا۔ لہٰذا یہ ایسی حقیقتیں ہیں کہ جن کو مومنین بڑی خوشی کے ساتھ قبول کر سکتے ہیں تو خیر یہ ضمناً کچھ باتیں ہوئیں۔

اب میں ایک اور بات اپنے طور سے کرنا چاہتا ہوں اور میرے نزدیک وہ بہت اچھی بات ہے وہ بہت ہی اعلیٰ بات ہے۔ مختصر ہو یا طویل میں وہ بات آپ کو بتاؤں گا جو بہت ہی شاندار بات ہے وہ قرآن کی بات ہے کہ خداوندِ عالم نے قرآن میں حجاب کا تصوّر دیا ہے، حجاب کا مطلب پردہ، خداوندِ عالم نے قرآن کے اندر حجاب کا تصوّر دیا ہے، پردے کا تصوّر دیا

ہے تو اِس کا مطلب کیا؟ خدا نے اپنے لئے ایک پردہ اختیار کیا ہے، اب میں اِس کی تشریح کروں گا کہ اِس خدائی پردے کے دو مقام ہیں، دو مراحل ہیں یعنی خدا کا ایک پردہ ظاہر میں ہے، ایک پردہ رُوحانیت میں ہے۔آپ اچھی طرح سے اِس کو ذہن نشین کرلیں اور بعد میں جب بھی چاہیں آپ اِس پر مجھ سے سوال بھی کریں، میں نے کہا کہ حجاب عربی میں پردے کو کہا جاتا ہے یہ قرآن کی زبان میں حجاب کہا گیا ہے تو یہ حجاب یعنی پردہ دو مقام پر ہے۔ایک عالمِ ظاہر میں اِس جہان میں جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور دُوسرا پردہ عالمِ رُوحانیت میں تو جب خدا نے اپنے لئے ایک پردہ اختیار کیا تو اِس کے یہ معنی ہوئے کہ مشقّت کے بغیر، تاویل کے بغیر، باطن میں جائے بغیر اور گہرائی میں اُترے بغیر خدا کی حقیقتوں کو کوئی نہیں سمجھتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اسماعیلیوں کا دین باطنی دین ہے کیونکہ ظاہر میں تو کچھ نہیں ہے ظاہر میں تو پردہ ہے اور پردے سے کوئی کچھ نہیں پاتا، پردے سے کچھ نہیں پاتا تو یہ ہے کہ جب پردہ ہے تو تاویل بھی صحیح ہے جب پردہ ہے تو ظاہر سے باطن میں جانا بھی [صحیح ہے]۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپ: یاسمین یاقیم　　　نظرِ ثانی: اکبر علی　　　پرُوف: نسرین اکبر

Click here
for Audio

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان
عنوان: کچھ اعلیٰ سوالات کے جواب
کیسٹ نمبر: ۵۲۔اے   تاریخ: ۲۴ رستمبر ۱۹۸۱ کراچی

اگر تفصیل سے بحث کی جائے تو اِن سوالات کے لئے کافی وقت چاہیئے۔ عزیزانِ من! سب سے پہلے میں گزارش کروں گا کہ اِن سوالات کی طرف اور جوابات کی طرف کس طرح توجہ دینی چاہیئے اور اِن کی اہمیّت کیا ہے۔ ہمارے عزیزوں سے یہ سوالات آئے ہیں جو سب سے بڑے کورس میں ہیں تو اِس بارے میں پوچھے بغیر کہ یہ سوالات کیسے آئے ہیں، بہر حال سوال تو آتے رہتے ہیں اور اپنے عزیز اُستاد کے سامنے ہر کوئی سوالات رکھتا ہے، اِس میں بڑی خوشی ہوتی ہے، بڑا اعتماد آتا ہے اور شاید اِس سلسلے میں ہم کو بھی کچھ دریوزہ ملے کیونکہ اِس بہانے میں مولا کچھ کرم کرتا ہے، کچھ مہربانی کرتا ہے اگر ہمارا باطن صاف ہے اور آپ سب کی دُعائیں شاملِ حال ہیں، تو اِن شاءاللہ ہم کوشش کریں گے اور جیسے بھی جوابات ہم سے مہیّا ہوسکیں وہ آپ کے سامنے آئیں گے، لیکن سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ اِس میں ہم اپنے خداوند سے توفیق و یاری چاہتے ہیں اِس میں آپ کی دُعا کی ضرورت ہے۔

عزیزانِ من! سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسماعیلی تعلیمات درجہ وار ہیں، کیونکہ خداوندِ عالم نے اپنی عزیز کتاب میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ سیڑھیوں کا مالک ہے (۷۰:۳)۔ یہاں اِن سیڑھیوں سے دَرجات اور مراتب مُراد ہیں اور مراتب کا مطلب حدود ہیں۔ ہمیں جو کچھ حدود کے سلسلے میں تعلیم دی گئی ہے، آپ تک حدود کے سلسلے میں جو معلومات آچکی ہیں تو کیا معلوم حدود کا سلسلہ اِس سے بھی کچھ لمبا ہو۔ یہاں جو سوالات درج ہیں وہ دس (۱۰) ہیں، میرے خیال میں بہتر یہ ہوگا کہ ہم اپنی عزیز بیٹی شہناز سے ایک بار اِس (paper) کی عبارت کو پڑھائیں گے تاکہ آپ کو اِس کا اندازہ ہو کہ کتنے اُونچے سوالات ہیں اُس کے بعد ہم کوئی طریقہ اختیار کریں گے کہ کس طرح اِن سوالات کے حل کو پیش کرنا ہے۔ ابھی آپ کے سامنے بیٹی سوالات پڑھ کر سناتی ہیں۔

سوال نمبر ۱:   ابداع، مُبدِع اور مبدا سے کیا مُراد ہے، نیز دُنیا کو ابداع سے وُجود میں لانے کے کیا معنی ہیں؟
سوال نمبر ۲:   امر، خدا کی تخلیق ہے یا اُس کی خاصیّت؟

سوال نمبر ۳:	امر، کلمہ، عقلِ کُل اور عرش سے کیا مُراد ہے؟

سوال نمبر ۴:	خدا کے ارادے (will) سے کیا مُراد ہے اور اِس ارادے سے دُنیا کو خلق کرنے کے کیا معنی ہیں؟

سوال نمبر ۵:	امامِ مستودع کا تصوّر دین میں کب سے ہے اور اِس کا فعل کس طرح سے ہے اور یہ امامِ مستقر سے کس طرح مختلف ہے؟

سوال نمبر ۶:	امام کیا پیدائشی امام ہیں اگر ایسا ہے تو پھر قدرتی طور پر وہ اپنی پوری زندگی پاک بازی سے گزارتے ہیں اور اِس صورت میں وہ لوگوں کے لئے کس طرح نمونہ ہیں؟

سوال نمبر ۷:	کیا امام کو امام بننے کے لئے ایک مومن کی طرح مختلف درجات سے گزرنا پڑتا ہے اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ان پر ہر طرح کی تکالیف گزرنے میں کیا حکمت ہے؟

سوال نمبر ۸:	عقلِ کُل اور نفسِ کُل، ناطق واساس جو دوجسمانی حدود ہیں کے مقابلے میں دورُوحانی حدود ہیں۔ رسولِ اکرمؐ کے بعد اب اِن کا وجود کس طرح سے ہے نیز خود ناطق کا ذکر کئی جگہ پر حکمت وتاویل کے مقام پر ہے اور اب وہ کس طرح سے سمجھا جاسکتا ہے؟

سوال نمبر ۹:	خدائی ہدایت کی تکمیل کے لئے دورِ رسالت اور دورِ امامت تاریخی طور پر الگ الگ کیوں ہیں؟ نیز کئی پیغمبر امام بھی تھے، اِس کا کیا مطلب ہے؟

سوال نمبر ۱۰:	ازراہِ کرم نظریۂ جبر وقدر کی اسمٰعیلی نکتۂ نگاہ سے تشریح فرمائیں؟

میں ذرا مکمّل توجّہ سے بات کرنے کے لئے کھڑا ہوتا ہوں اور میرے جسم کو شاید کھڑے ہونے میں مزہ آئے گا۔ عزیزانِ من! اِن سوالات سے متعلّق جو بنیادی بات ہے وہ یوں ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ کسی بھی مضمون میں جو بنیاد ہوتی ہے اُس بنیاد سے مضمون پر اثر پڑتا ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ کوئی بھی نظریہ ہے، کوئی بھی (concept) ہے، کوئی بھی عقیدہ ہے تو اُس عقیدے کی بنیاد میں اگر تھوڑی سی غلطی رہی ہے یا غلطی نہیں ہے، کوئی اُس میں راز کی بات ہے یا کچھ اختلاف ہے، تو اُس اختلاف کو (findout) کرنے کے بعد آپ باور کریں کہ اُس عقیدے میں، اُس نظریے میں اُوپر سے لے کر نیچے تک تبدیلی آجاتی ہے یہ پوائنٹ، یہ نکتہ آپ ذہن نشین کرلیں۔ مثال کے طور پر دُنیا کے اندر بڑے بڑے مذاہب میں یہ مانا گیا ہے کہ پہلے خدا کی بادشاہی میں کوئی دُنیا نہیں تھی، کوئی مخلوق نہیں تھی، کوئی چیز نہیں تھی نام کے لئے بھی کوئی چیز نہیں تھی پھر خدا کو خیال آیا، تو اُس نے اِس کائنات کو پیدا کیا، ایک یہ نظریہ ہے۔ دوسرا یہ نظریہ بھی ممکن (possible) ہے کہ اِس مذکورہ نظریے کے برعکس اور برخلاف خدا کی بادشاہی میں، اُس کی کائنات اُس کی مخلوق میں، اُس کے منشاء کے مطابق ہر

چیز ہمیشہ سے موجود ہے تو یہ دو نظریے آپ کے سامنے میں نے پیش کئے۔ اب میں اِس دُوسرے نظریے کو ترجیح دوں گا اور اِس کو آخری حقیقت کے طور پر میں مانوں گا، جیسے ہی میں اِس کو (proof) کروں گا تو یہ سوالات گو کہ اُونچے درجے کے سوالات ہیں اور یہ سوالات ایسے اُونچے ہیں، کہ اِن کے لئے کسی کے پاس کوئی جواب نہیں ہے سوائے امامؑ کے خزانے کے۔ ہمارے بزرگانِ دین نے اپنے زمانے کے مطابق یا مصلحت کے مطابق اِن کو حل ضرور کیا ہے لیکن اِن کے سوا کسی کے بس کی بات نہیں ہے، کہ اِن سوالات کے لئے جواب مہیّا کرے، لیکن اس دُوسرے نظریے کی بدولت آپ تعجّب کریں گے کہ یہ سوالات دس کے دس ایک ایک ہو کر حل ہو جائیں گے تو آپ کو مزہ آئے گا۔

میں دوبارہ تشریح کرتا ہوں اور بالکل (clear) کر کے بتانا چاہتا ہوں کہ دو نظریے کیسے؟ ایک وہ نظریہ جس کے تحت یہ مانا جاتا ہے کہ کائنات نہیں تھی مخلوق نہیں تھی خدا کی بادشاہی میں کوئی شیٔ کوئی چیز نہیں تھی، ایک دَور ایسا تھا اور اُس دَور کے بعد یعنی (nothingness) کے بعد کچھ نہ ہونے کے بعد خدا نے اِس کائنات کو وُجود دیا، (nothingness) سے (existence) میں لایا یہ تصوّر ہے یہ (concept) ہے یہ نظریہ ہے۔ دُوسرا نظریہ جو میں اب بیان کر رہا ہوں اور جس کے سہارے سے میں دعویٰ کرتا ہوں مولا کی رحمت سے یہ سوالات حل ہو جائیں گے تو دُوسرا نظریہ یہ ہے کہ خدا کی بادشاہی میں کسی ابتدا کے بغیر کسی (begining) کے بغیر اور کسی وقت میں نہ ہونے کے بغیر ہمیشہ سے ہر چیز، ہر چیز، ہر چیز موجود اور مہیّا ہے۔ ہم اِس دُوسرے [نظریے] کو مانیں گے، اِس کے لئے (proof) کیا ہے؟ بہت ہیں، بہت ہیں، بہت ہیں، ایک (proof) آپ کو ہم کو چاہیے۔ میں کسی تاخیر کے بغیر آپ کو لے جاؤں گا ایک بہت پیاری کتاب کی طرف اُس کے ایک (chapter) کی طرف ''اسلام میرے مورثوں کا مذہب'' اور اسلام میرے آباؤ اجداد کا مذہب، اُس (chapter) کے اندر حضرت مولانا امام سلطان محمّد شاہؑ نامدار نے سراسر انقلاب لایا ہے، اِن تمام نظریات کے اندر ایک قیامت برپا کر دی ہے۔ آپ تعجّب کریں گے جو میں اِس مختصر سی بات کو قیامت قرار دے رہا ہوں اور ہاں! میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ گو کہ ظاہر میں ایک چھوٹی سی بات ہے لیکن یہ قیامت کا انقلاب ہے اِس کے اندر، تو اِس نظریے کے اندر اتنی مضبوط حقیقت ہے اور ایسی اہم بات ہے، کہ اِس کی وجہ سے نظریات کی بنیادیں ہل گئیں، زلزلہ آیا، قیامت برپا ہو چکی ہے جو مولانے فرمایا کہ یہود کا وہ نظریۂ تخلیق صحیح نہیں ہے، اسلام کا نظریۂ تخلیق یہ ہے کہ خدا وند نے کسی ایک مخصوص وقت میں دُنیا کو پیدا نہیں کیا، جیسے اُس نے ایک عجیب کام کر دیا جو کبھی نہیں کیا تھا، ایسا نہیں، خدا جیسے ہمیشہ سے خدا ہے اِس طرح اُس کی تخلیق ہمیشہ سے ہوتی رہتی ہے [اسلام میرے مورثوں کا مذہب، ص ۱۶]۔

یہ تخلیق کوئی (accident) نہیں ہے یعنی ایک دفعہ کا کوئی واقعہ نہیں ہے یہ ایک سلسلۂ لاانتہا۔ اب ہم نے جو بات کہی تھی، اِس کے لئے اگر قرآن کا کوئی اشارہ چاہئے تو اُس میں بہت سے اشارے ہیں اور اگر آپ کو مختصر اشارہ چاہئے تو

لیجئے: ''كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَسْبَحُوْنَ ''(۲۱:۳۳)اور ہر چیز ایک (circle) کے اُوپر گھومتی رہتی ہے،تو (circle) کی کوئی ابتدا نہیں،کوئی انتہاء نہیں،تو اُس کی کوئی (begining) نہیں،کوئی (ending) نہیں ۔اِس (reference) میں خدا سب سے پہلے دین کی چیزوں کو بتاتا ہے،لوگ اِس کو چاند،سورج پرلے جاتے ہیں وہ تو ذیلی بات ہے،خدا اِس آیت میں تخلیق کی طرف توجّہ دلاتا ہے،خدا کی بادشاہی کی طرف توجّہ دلاتا ہے ۔صرف یہ نہیں کہ چاند کی گردش کی بات کرتا ہے اور زمین کی گردش کی بات کرتا ہے،ستاروں کی گردش کی بات کرتا ہے اور ہر چیز آپ دیکھیں گے گردش میں ہے،تو یہ ہر چیز اِس لئے گردش میں ہے کہ قانونِ قدرت خود گردش میں ہے،ایک (circle) پر واقع ہے ۔میں اُن چیزوں کو بھی ایک (circle) پر (proof) کر کے بتاؤں گا جن کے متعلّق آپ کو گمان نہیں ہے کہ وہ (circle) پر ہیں ۔پانی کے (circle) کو تو ہر کوئی جانتا ہے اور جو چیز مٹّی سے پیدا ہوتی ہے آخر میں سڑ کر مٹّی بن جاتی ہے،پھر اُسی سڑی ہوئی مٹّی سے دوبارہ وہ چیز پیدا ہو سکتی ہے (possible) ہے،یہ بھی (circle) ہے ۔درخت سے پھل پیدا ہوتا ہے اور پھل سے پھر درخت پیدا ہوتا ہے یہ بھی (circle) ہے،تو انسان والدین سے پیدا ہوتا ہے اور پھر خود بعد میں جا کر والدین بن جاتا ہے یہ بھی (circle) ہے ۔مرغی سے انڈا پیدا ہو جاتا ہے پھر انڈے سے مرغی پیدا ہو جاتی ہے یہ بھی (circle) ہے،تو غرض کہ دُنیا کے اندر کوئی چیز نہیں ہے جو (circle) پر واقع نہ ہو ۔

اب آئیے کہ عالم دو ہیں،دُنیائیں دو ہیں،ایک کا نام دُنیا ایک کا نام آخرت ۔آخرت کے اور بھی نام ہیں یعنی آخرت کا دُوسرا نام عالمِ امر ہے،عالمِ امر ایک دُنیا ہے اور اِس کے مقابلے میں عالمِ خلق یہ جہان ہے ۔اب میں عرض کروں گا کہ اِس میں اور اُس میں کیا فرق ہے؟ اِس میں اور اُس میں یہ فرق ہے کہ وہ قدیم ہے،آپ مجھ سے پوچھیں کہ قدیم کے کیا معنی؟ قدیم کے معنی پُرانی چیز یہ نہیں،قدیم ایک (term) ہے،فلسفے کی اصطلاح ہے،قدیم ایسی چیز کو کہتے ہیں جس کے نہ ہونے کا سوال ہی نہ ہو اور وہ ہمیشہ ہمیشہ سے ہو تو اِس کو قدیم کہتے ہیں تو عالمِ امر،قدیم ہے اور وہ عالمِ امر خدا کی بادشاہی ہے ۔خدا کی بادشاہی اِس لئے ہے کہ وہ ہمیشہ سے ہے،تو بزرگانِ دین نے اُس زمانے کی مصلحت کے مطابق ایک پوری کائنات کو ایک کلمہ کے اندر سمو کر بتایا اور اُس کا نام انہوں نے کیا کہا؟ ''کلمہ'' کہا اور اِسی کو ''امرِ کُن'' بھی کہا تو ''امرِ کُن'' اور کلمے کا مطلب ایک ہے اور پھر آخرت کا ایک اور نام ہے اُس کو ''نیستی'' بھی کہا (nothingness) اور حالانکہ یہ (nothingness) نہیں ہے،اِس کا نام (nothingness) ہے ۔جسم کو،مادّہ کو،(matter) کو سامنے رکھتے ہوئے اور مادّے کے اندر جو چیز پائی جاتی ہے جو کثافت،جو شکل،جو صورت پائی جاتی ہے یہ پردہ بھی بن جاتا ہے،نظر بھی آتا ہے،کسی چیز کے لئے رُکاوٹ بھی ہو سکتا ہے جسم،اِس کے مقابلے میں عالمِ امر،جو ہمیشہ کے لئے ہے اُس کو نیستی قرار دیا ۔اب ہم کو ایک بہت بڑا راز مل گیا،کیا؟ نیستی دراصل (nothingness) نہیں ہے لیکن وہ ایک نام ہے،عالمِ امر کا اور عالمِ

ابداع کا تو عالمِ ابداع کا مطلب کیا؟ جہاں پر ہر چیز کُن کے ارادے سے ظاہر ہو جاتی ہے سامنے آتی ہے، ایسا نہیں کہ وہ چیز نہیں ہے اور نہ ہونے کے بعد وُجود میں آئی یہ نہیں، صرف یہ ہے کہ کُن کے ارادے سے ہر چیز کا ظہور ہوتا ہے اُس کا جلوہ سامنے ہوتا ہے اِس معنی میں کُن کہا اور اِس کُن کو یوں سمجھا یا جیسے کہ نہ ہونے کے بعد کوئی چیز ظہور میں آئی ۔آج میں آپ کو جو بات بتا رہا ہوں یا جو تعلیم آپ کو دے رہا ہوں، جس طرح وضاحت کر رہا ہوں یہ میں نے شاید کبھی تشریح نہیں کی تھی، وجہ اِس کی یہ ہوئی کہ جو سوالات ہمارے سامنے ہیں اِن سوالات کے مطابق ہمیں بہت اُونچی سطح پر اور سب سے اعلیٰ سطح پر بات کرنی ہے، تو میں کہہ رہا ہوں کہ کُن عربی کا ایک لفظ ہے، کُن معنی انگلش میں (be) اور اُردو میں ہو جا، ''کُمن'' بر شسکی میں، ہو جا، بن جا، وُجود میں آ، یعنی ظہور میں آ، یہ مُراد ہے، لیکن وہ ایک عالم ہے ایک جہان ہے جس میں تمام چیزیں ہمیشہ سے موجود ہیں لیکن وہ رُوحانی شکل میں ہیں لطیف شکل میں ہیں کثیف شکل میں نہیں ہیں، وہ کثیف شکل میں نہیں ہیں اِس واسطے اِس کثیف دُنیا سے وہ لطیف دُنیا، عالمِ امر الگ ہے ۔

اب حدود میں ایک ایسا مرتبہ بتایا کہ اُس کا نام مُبدِع ہے مُبدِع کا مطلب کُن فیکون کا کام کرنے والا یا کہ کُن فرمانے والا، کہنے والا کہ ہو جا تو یہ ایک مرتبہ ہو گیا ۔مُبدِع معنی حدودِ دین میں سے ایک مرتبہ ہوا، جو عقلِ کُل کے مقام سے بھی بلند ہے کیونکہ کُن فیکون کا کام اُسی سے ہوتا ہے ۔لیکن درجات میں یہ درجہ ہے ضرور پھر جو اللہ کی ذات ہے وہ اِن سب چیزوں پر دونوں جہاں پر عالمِ امر پر بھی اور عالمِ خلق پر بھی بادشاہ ہے مگر وہ مُبدِع نہیں ہے وہ مُبدِع سے بالاتر ہے یعنی خداوندِ عالم کی بادشاہی میں مُبدِع بھی ایک درجہ ہے جو کہ وہ کُن فرماتا ہے اور اِس کُن کے نتیجے میں اِبداع ہوتا ہے، اِبداع معنی ایک چیز کا ظہور ہو جاتا ہے، ہے تو چیز صحیح لیکن اُس چیز کا ظہور ہوتا ہے جلوہ سامنے آتا ہے ۔ یہاں پر ایک مثال میں آپ کو بتاؤں، ایک چھوٹی سی مثال آپ میں ہم میں بھی ہے وہ یہ کہ ہمارے ذہن میں ہمارے خیالات میں کیا ایک دُنیا ہے یا نہیں میں آپ سے پوچھتا ہوں؟ آپ کہیں گے ہے، لیکن جب تک ہم کسی چیز کی طرف توجّہ نہیں کرتے ہیں وہ چیز سامنے نہیں آتی ہے، کیا کہا میں نے ہمارے خیالات کے اندر، ہمارے ذہن کے اندر ہمارے (mind) میں ہمارے ضمیر میں ایک دُنیا ہے ایک کائنات ہے ۔اُس دُنیا کو ہم (at all time) نہیں پاتے ہیں جب تک کہ ہم توجّہ نہ کریں، کسی ذہن کی بات کو سامنے لانے کے لئے ہم توجّہ کرتے ہیں (suppose) ہماری یہ توجّہ کُن فرمانا ہے، کیا؟ کتنی اچھی مثال ہے بہت شاندار مثال ہے ۔ ہم کُن نہیں فرماتے ہیں لیکن اُس کے مطابق ہم ارادہ کرتے ہیں، ہو جا بھی نہیں کہتے ہیں بس ارادہ کرتے ہیں تو وہ چیز دُھندلی سی چیز، ایک شکل ہمارے سامنے آتی ہے تو کیا اِس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ چیز نہیں تھی ہم نے اُس کو اپنے ارادے سے وُجود دیا؟ نہیں!! وہ چیز تھی صرف ہم نے ارادہ کیا تو اُس چیز کی شبیہہ، تصویر، تمثیل، صورت روشنی میں یا تاریکی میں ہمارے باطن کی صفائی کے مطابق وہ چیز ہمارے سامنے آ گئی ۔فرض کریں کہ

ایک شخص کو ہم تصوّر میں لاتے ہیں تو اُس شخص کے تصوّر کو ہم نے (create) تو نہیں کیا وہ تصوّر پہلے سے تھا لیکن ہم نے توجّہ کی تو وہ تصوّر سامنے آ گیا، اسی طرح اسی چیز کا نام کُن قرار دیا اور عالم ِامر میں تمام چیزیں جو ہیں تخلیق کے بغیر موجود ہیں۔وہاں تخلیق (creation) نہیں چلتا ہے، کیوں؟ (creation) جو ہے مادّہ میں اِس دُنیا میں چلتی ہے، اُس میں [یعنی عالم ِامر میں] جب چیز ہمیشہ سے ہے تو (creation) کا سوال نہیں ہے صرف ارادے کی بات ہے، صرف کُن فرمانے کی بات ہے۔کُن سے مُراد ارادہ، اب آگے چل کر ارادے کی بھی تشریح کریں گے کہ وہ ارادہ کیسا ہے؟ تو وہ چیز سامنے آتی ہے۔

اِس بیان کا خلاصہ یہ ہوا کہ خدا بذاتِ خود کُن نہیں فرماتا ہے تو اُس کے مقرّر کردہ درجات ہیں اُن درجات میں سے ایک کا نام مُبدِع ہے جو اِبداع کا کام کرتا ہے، تو وہ مُبدِع جو ہے اپنے ارادے سے کسی چیز کو ظہور میں لاتا ہے، اور مَبدَع وہ چیز ہے جس کو یہ مُبدِع وجود دیتا ہے ارادے میں اُس عالم امر میں ظہور میں لاتا ہے، مثال کے طور پر دُنیا کے اندر بجلی کا (electric) کا سمندر ہے لیکن اُس کو وجود میں لانے، اُس کو ظہور میں لانے کے لئے وہ آلے چاہئیں اور کچھ چیز چاہئے، بجلی تو ہے ہَوا میں ہے ہر چیز میں ہے لیکن کون دیکھتا ہے؟ کیا اگر ہم اُس کو نہیں دیکھتے ہیں تو اُس کے وُجود سے ہم انکار کر سکتے ہیں لیکن ہم انکار کریں تو اور بات ہے لیکن سائنسدان انکار نہیں کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں اور صرف یہ ہے کہ کوئی آلہ لگائے کوئی (meter) کوئی (power house) اور ایسی کوئی چیز بنانے سے اُس کا ظہور ہوتا ہے۔جس طرح عالم ِامر جو ہے، لیکن اُس کو فعل میں لانا اُس کو ظہور میں لانا، اُس کا جلوہ دیکھنا یہ کُن فرمانے کے تحت ہے اور کُن کی تشریح ارادہ ہے اور ارادہ کی تشریح اب باقی ہے، تو تین باتیں میں نے بتائیں ایک تو اِبداع ہے ایک مُبدِع ہے ایک مَبدَع ہے۔مُبدِع معنی فاعل یعنی کُن کہنے والا، اِبداع معنی اُس کا فعل اور مَبدَع کا مطلب اُس کی وہ چیز جو وہ بناتا ہے وُجود میں لاتا ہے یا کہ ظہور میں لاتا ہے، تو حدود میں سے ہم عقلِ کُل کو مُبدَع کہہ سکتے ہیں جب بھی وہ ظہور میں آتا ہے اور جسم سے اُس کا (connection) ہو کر پھر فعل کرنے لگتا ہے اور مُبدِع وہ جو کُن فرماتا ہے اور اِبداع اُس کا فعل، کُن فرمانے کا فعل، تو یہ ہوا خدا کا کُن فرمانا۔

مزید توجّہ دیجئے کہ خدا فعل نہیں کرتا ہے خدا فاعل نہیں ہے، خدا فاعل نہیں ہے، خدا کا نہ قول ہے نہ فعل ہے۔آپ پوچھیں کیوں؟ وہ اِس لئے کہ وہ بادشاہ ہے یعنی یہ قول بھی اور فعل بھی اور فاعل بھی اُس کی بادشاہی کے تحت آتا ہے اور فعل و قول (adopt) ہے منسوب ہے اُس سے منسوب ہے۔آپ پوچھئے ایک مثال پوچھئے کہ دُنیا میں کوئی بادشاہ تھا یا ہے، وہ منہ سے بولتا بھی نہیں ہے، ارادہ ہے منشا ہے کہ ایک بیابان میں بستی بسائی جائے تو بادشاہ کے بہت سے عملدار ہیں، وزیر ہیں اور پھر اُس کے نیچے بہت سے لوگ ہیں کام کرنے والے، تو بادشاہ کے منشا کے مطابق جو سب سے بڑے وزیر ہیں

اُس نے اپنے ماتحت کے حاکم لوگ یا آفیسر زہیں اُن کو بتایا، اِس طرح کرتے کرتے یہ حکم نیچے سے نیچے آیا، یہاں تک کہ کام کرنے والوں کو حکم ملا کہ فلاں بیابان میں ایک بستی بساوَ۔ کچھ مدّت کے بعد وہ بستی بسائی گئی، جب کام کیا گیا تو ہر درجے کے لوگ اِس کام کو اپنی ذات سے منسوب کر رہے ہیں، سب سے پہلے مزدور کہہ رہے ہیں کہ ہم نے اِس بستی کو بسایا، اِس کے بعد اُن پر جو حکم کرنے والا ہے وہ کہتا ہے کہ ہم نے کیا، اُس کے بعد اُوپر جو آفیسر ہے وہ کہتا ہے کہ ہم نے کرایا، کرتے کرتے (minister) تک یہ کام کا فخر یا جو نسبت ہے وہ پہنچتی ہے، اور سب سے آخیر میں بادشاہ تک یہ نسبت پہنچتی ہے کہ بادشاہ نے یہ کام کیا، صحیح ہے۔ ویسے تو ہر مقام پر صحیح ہے لیکن اِس نسبت کو بادشاہ تک پہنچائی جاتی ہے، تو دیکھا آپ نے کہ بادشاہ نے ہاتھ تک نہیں لگایا منہ تک نہیں ہلایا لیکن سارا کام ساری تعریف اُس کو پہنچتی ہے، کیوں؟ اِس لئے کہ وہ بادشاہ ہے جو کچھ بھی ہوتا ہے اُس کے تحت ہوتا ہے۔ لہٰذا خدا کا نہ قول ہے، نہ فعل ہے وہ سب کچھ اُس کے تحت ہوتا ہے، تو لہٰذا کُن فرمانے والا بھی کوئی ہے، خدا بذاتِ اقدس خود کُن نہیں فرماتا ہے اور اگر ایک مخصوص وقت میں خدا کُن فرمائے تو پھر اِس میں کیا نقص ہوگا میں آپ کو بتاؤں۔ اِس میں یہ نقص ہوگا کہ پھر خدا ہماری طرح (thinking) کرتا ہے، کچھ خیال خدا کی ذاتِ اقدس میں پہلے سے نہیں تھا اور اُس کے لئے (cause) ہوگیا(cause)۔ اُس نے کوئی چیز دیکھی یا اُس کے باطن میں کوئی نئی سی چیز آئی یا کوئی عکس پڑا یا اُس کو تجربہ ہوا، ایک تو یہ نقص ہوتا ہے اور خدا اِس سے پاک ہے اور دُوسرا یہ نقص ہوتا ہے کہ اِس سے آگے جو وقت گزر گیا کچھ کئے بغیر اُس میں کیا خدا کے لئے رُکاوٹ تھی، تو یہ نقص پیدا ہوتا ہے۔ خدا کی ذات ہر تعریف سے، ہر مثال سے، ہر صفت سے بالا و برتر ہے اور خدا کے جو حدود ہیں جو مراتب ہیں وہ یہ کام کرتے ہیں۔

اِس بیان سے ایک طرف تو یہ ثبوت ملتا ہے کہ خدا کی بادشاہی کسی ابتداء کے بغیر ہمیشہ سے ہے اور دوسرا یہ ثبوت ملا کہ خدا نہ تو (action) کرتا ہے اور نہ اُس کا کوئی قول ہے اور یہاں تک کہ قرآن بھی حدود میں سے آیا، خدا (creation) اگر کرتا تو اُس نے خود کو "اَحۡسَنُ الۡخَالِقِیۡنَ" (۲۳:۱۴) کیوں قرار دیا؟ "اَحۡسَنُ الۡخَالِقِیۡنَ" ذرا سوچئے کہ خلقت کرنے والوں میں سے بہترین یعنی اُس کی خلقت اِس طرح سے نہیں جو خالقین خلقت کرتے ہیں۔ اُس کی خلقت یہ ہے کہ اُس کی خلقت کسی تخلیق کے بغیر ہمیشہ سے موجود ہے۔ دو امیر ہیں، ایک امیر ایسا ہے کہ اُس کی دولت ہمیشہ سے ہے، ایک امیر نو دولتی ہے اُس کو نو دولتی کہتے ہیں ذرا طنز جیسی بات ہے، ایک امیر نو دولتی ہے کہ اب اُس نے دولت کو پیدا کیا۔ آپ بتائیں کہ کون سا امیر افضل و اعلیٰ ہے۔ اگر خدا نے بعد میں سوچ کے (creation) کیا ہے اور اپنے لئے ایک بادشاہی بنائی ہے تو وہ نو دولتی ہے۔ ہمارے نزدیک خدا وہ ہے اور "اَحۡسَنُ الۡخَالِقِیۡنَ" اِس (sense) میں ہے اِس معنی میں ہے کہ اُس کی جو تخلیق ہے ہمیشہ سے ہے، اور دوسری مثال خدا کا ایک تصوّر یوں ہے کہ وہ خود اپنے ہاتھ سے سب کچھ کرتا ہے، دوسرا تصوّر یہ ہے کہ اُس کی بادشاہی میں ہر چیز (automatically) ہو جاتی ہے، اور خدا کے نیچے جو خادم ہیں، جو بندے

ہیں، جو درجے ہیں، جو حدود ہیں وہ سب کام کرتے ہیں تو کون سا خدا بڑا، اور اکبر، اللہ اکبر یعنی خدا سب سے عظیم ہے اِس کا کیا (sense) ہے، اِس کے کیا معنی ہیں؟ میں تو اُس کو بڑا اور عظیم قرار دوں گا جس کی بادشاہی میں ہر چیز (okay) ہے اور پہلے سے یعنی کہ تیار ہے موجود ہے اور جس کی خدائی میں کبھی کوئی کمی نہیں تھی، جس طرح خدا ہمیشہ سے خدا ہے اِس طرح اُس کی بادشاہی جو ہے وہ ہمیشہ سے ہے، تو اِن دو نظریوں میں سے جن کی میں نے شروع میں بات کی تھی یہی نظریہ صحیح ہے کہ خدا کی بادشاہی میں ہر چیز ہمیشہ سے ہے اور ہاں! یہ بات میں بتاؤں گا کہ عالمِ امر سے چیزیں دُنیا میں آتی ہیں اور دُنیا سے عالمِ امر میں چیزیں جاتی ہیں اور اسی سے (circle) بنتا ہے، لاانتہائی کا (circle) بنتا ہے، تو اِس لئے ہمیں یوں لگتا ہے کہ یہ دُنیا ابھی بنی اور خدا کی کوئی چیز نہیں تھی تو ابھی ابھی خدا نے ایک سلطنت بنائی، ایک بادشاہی بنائی، انسان بنائے وغیرہ۔

بہر حال پھر میں واپس جاتا ہوں سوال نمبر ا کی طرف اور غالباً میں نے اُس کو اچھی طرح سے (explain) کیا ہے جواب مہیا کیا ہے کہ اِبداع جو ہے وہ مُبدِع کا فعل ہے جو درجات میں سے ایک درجہ ہے اور مُبدَع ہم عقلِ کُل کو کہہ سکتے ہیں۔ پھر ابداع سے کیا مُراد ہے کا جواب یوں ہے کہ اِبداع ہمیشہ سے اِبداع کا کام ہوتا رہتا ہے۔ ایک چیز یہاں اور رہ گئی اِس کے سننے سے آپ خوش ہو جائیں گے، اِس کے سننے سے آپ بہت خوش ہو جائیں گے،، بہت خوش ہو جائیں گے اور اسمٰعیلی مذہب کی آپ تعریف کریں گے۔ فرض کریں کہ آپ رُوحانیت میں آگے بڑھتے ہیں اور ماشاء اللہ اسمٰعیلی مذہب میں یہ ممکن ہے ایک ایسے مقام کو چھُوتے ہیں، ایک ایسے مقام کو چھُوتے ہیں رُوحانیت کے ایک بہت بلند مقام کو چھُوتے ہیں، اُس وقت آپ اپنے دل میں ایک ارادہ کرتے ہیں تو ایک شیٔ آپ کے سامنے ظاہر ہو جاتی ہے اور دُوسرا ارادہ کرتے ہیں تو دوسری چیز سامنے آتی ہے، اسی طرح ہر چیز آپ کو ارادے کے تحت مہیا ہو جاتی ہے، تو کیا یہ کُن نہیں ہے؟ کیا یہ آپ عالمِ امر کے مقام کو نہیں پہنچے؟ تو کیا اِس سے معلوم ہوا کہ کُن خدا کے لئے کوئی بڑی بات ہے اور اُس کی آخری صفت ہے کہ جس کے لئے ہم یہ سوچتے ہیں کہ کُن ہے، نہیں اور بہشت میں بھی یوں ہے،، بہشت میں جو مومن جس چیز کا ارادہ کرے گا تو اُس کا ارادہ کرنا وہ کُن کہنے کے مترادف ہے، گویا کہ وہ کُن کہے گا ارادے میں کُن کہے گا ہو جا لفظ میں نہیں کہے گا ارادہ کرے گا اور اسی کے ساتھ بہشت کے اندر ہر چیز سامنے آئے گی، ہر چیز سامنے آئے گی، تو کیا یہ کُن ایک ہی لفظ ہے یا ایک دفعہ ہوا ہے اور پھر کُن ذاتِ خدا کے ساتھ وابستہ ہے، نہیں!۔ میں نے اِس سے پیشتر خیال سے تشبیہہ دی تھی، آپ دل و دماغ میں کوئی چیز چاہتے ہیں بلندی پر نہیں اور زیادہ روشنی کے ساتھ نہیں لیکن دھندلکوں کے ساتھ یعنی کچھ تاریکیوں کے ساتھ آپ کسی چیز کو پانا چاہتے ہیں تو تصوّر میں وہ چیز آتی ہے، کل کو آپ کا جو ضمیر ہے منوّر ہو جائے گا نورِ معرفت سے اور رُوحانیت کی بلندیوں کو چھُونے کے بعد آپ صرف ارادہ کریں گے کسی بھی چیز کا جب ارادہ کریں گے وہ چیز آپ کے سامنے نمودار ہو جائے گی تو یہ ہوا۔ اِبداع تو اِبداع ایسی چیز نہیں ہے کہ اِس کا تعلّق صرف ازل سے ہے اور حالانکہ ازل، اِس

کا ایک اچھا انگلش ترجمہ ہے، تو یہاں کتنے اچھے اسکالرز بیٹھیں ہیں اُن کے سامنے میں کوئی انگلش ورڈ بولوں تو ایک (joke) سا ہو جائے گا، چلو (joke) ہوتا ہے تو ہونے دو ہم تو نہیں چاہتے ہیں وہ (automatic) ہو جاتا ہے تو کیا، تو ازل کا ترجمہ ہے (timelessness) یعنی ایک ایسی کیفیت جہاں پر زمان کی کیفیت ختم ہے، زمان کا تصوّر ختم، نہیں ہے، یہ بہت اچھا ترجمہ کیا ہے مغرب کے فلاسفروں نے تو اِس کو عربی میں کہتے ہیں لازمان، لازمان وہ مرتبہ یا وہ مقام جس میں زمانے کا تصوّر ختم۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے نا! تو دیکھیں ہم چھت پر چڑھیں یا سیڑھی پر اور ذرا ہمارے قدم بگڑ جائے تو ہم گر جائیں گے کیونکہ زمین کی جو کشش ہے وہ ہی ہم کو گرائے گی اور اگر ہم کششِ ثقل سے بالاتر ہو جائیں گے تو پروں کے نہ ہونے کے باوجود ہم اِس طرح سے پرواز کریں گے کیونکہ وہاں تو کششِ ثقل نہیں ہے۔ اِس سے میری مُراد یہ ہے کہ ہر چیز کی ایک (limit) ہوتی ہے تو مادی چیزوں کی (limits) ہیں اِس واسطے جو ٹائم ہے یہ اِس جسم کے ساتھ وابستہ ہے جہاں جسم نہیں ہے وہاں ٹائم نہیں ہے، جہاں ٹائم نہیں ہے تو پھر یہ نہیں سوال ہوتا ہے کہ ازل میں خدا نے کُن فرمایا تو اب بھی بار بار فرمایا جاتا ہے۔ مطلب اِس کا یہ ہوا کہ ہمارے بزرگانِ دین نے جو حدودِ دین کا رستہ بتایا ہے یا سلسلہ دکھایا ہے وہ سب سے اُونچی تعلیم ہے لیکن پھر بھی آخری تعلیم نہیں ہے، اِس کے اُوپر ایک (step) ہے جو لاانتہائی کا تصوّر ہے جو توحید کا تصوّر ہے تو وہ ہم کو نہیں بتایا لیکن میں آپ کو بڑی ضمانت کے ساتھ یہ ثبوت دوں گا کہ ناصرِ خسروقؒ کی سب سے بڑی کتاب فلسفے کی کتاب ''زادالمسافرین'' آپ لائیں آپ کو یہاں سے ملے گی اُس میں، میں آپ کو بتاؤں گا کہ اُس میں بھی نیستی کو (nothingness) کو اِبداع قرار دیا اور اِس کو ایک مصلحتی چیز قرار دیا ہے کہا کہ حکماء نے اِبداع کو نیستی قرار دیا ہے نیستی کے نام سے کہا ہے اور حکمت کا یہ تقاضا تھا کہ لوگوں کو بتا دیا جائے کہ خدا نے نیستی سے ہستی کو وُجود دیا۔ ایک مصلحتی بات ہے کہ اِس کے پس منظر میں دونوں جہان کے ہمیشہ ہونے کا راز ہے۔

اب جو سوالات ہیں وہ تو اپنی جگہ سے ہل گئے اور اُن کا نظام درہم برہم ہو گیا کیونکہ اب جو پڑھیں گے تو وہ اُس طرح سے نہیں ہوں گے کیونکہ ہم نے دوسرے سوالات بھی دیکھے کس طرح آسانی سے حل ہوتا ہے، امر خدا کی تخلیق ہے یا اُس کی خاصیت، ہم نے تو امر سوال نمبرا میں اِس کا بیان دیا جواب مہیا کیا کہ امر خدا کی تخلیق نہیں ہے، جب امر، خود عالمِ امر ہے اور تخلیق سے عالمِ خلق سے برعکس ہے تو وہ کس طرح تخلیق ہو سکتا ہے تو امر نہ تو خدا کی تخلیق ہے اور نہ خدا کی خاصیت۔ دیکھیں خاصیت کسے کہتے ہیں، گلاب میں خوشبو ہے، مرچ میں کڑواپن ہے اور ہر چیز کے اندر اُس کا یا تو ذائقہ ہے یا اُس کی کوئی تاثیر ہے یا اُس میں کچھ (medicine) ہے تو یہ اُس کی خاصیت ہے اور خدا کے درجے میں کوئی پھوٹنے کی طرح چشمے کی طرح کوئی خاصیت ہوتی [تو] نامعلوم اُس میں کیا کیا انقلابات آتے تو پھر یہ خدا کی خاصیت ایسی ہوتی کہ ایک طوفان ہوتا اور ہر چیز کو درہم و برہم کر دیتا، بھلائی کے (sense) میں اور پھر نور ہی نور ہوتا اور پھر کوئی چیز نہیں ہوتی کوئی

چیز وُجود میں نہیں آتی، اتنے زبردست طوفان کے آنے کے ساتھ کسی کا وُجود کس طرح ٹِک جاتا۔ ایسا نہیں ہے اِس میں ایک حکمت ہے وہ یہ کہ خداوندِ عالم صمد ہے، بے نیاز ہے، ہر چیز سے پاک ہے تو وہ "اَحۡسَنُ الۡخَالِقِيۡنَ" ہے، مطلب اِس کا یہ ہوا کہ اُس کے خالقین ہیں، (creation) کرنے والے ہیں، عظیم عظیم رُوحیں ہیں، فرشتے ہیں جیسے عقلِ کُل ہے، نفسِ کُل ہے وغیرہ، ناطق ہے، اساس ہے تو یہ چیزیں (creation) کرتے ہیں، کہاں سے کرتے ہیں؟ بس عالمِ خلق اور عالمِ امر کے درمیان یہ (creation) ہوتی ہے کوئی چیز عالمِ امر سے عالمِ خلق میں آتی ہے تو اُس کو کہتے ہیں (creation) اور حالانکہ ہوتی ہے وہ چیز ہمیشہ سے اُس کو ایک (base) دیا جاتا ہے، اُس کو ایک جسم دیا جاتا ہے تو ہم عالمِ اِمر میں موجود تھے پھر دُنیا میں آئے ہم کو ایک (base) ملا جسم ملا، جسم ملنے کا نام پیدائش ہے ویسے تو وُجود عالمِ اِمر میں ہمیشہ سے ہے تو اِس لئے امرِ خدا کی تخلیق نہیں ہے اُس کی خاصیت نہیں ہے بلکہ یہ حدود میں اور درجات میں چلنے والی چیز ہے۔

سوال ۳: تیسرا نمبر ہے امر، کلمہ، عقلِ کُل اور عرش سے کیا مراد ہے؟

جواب: یہ بہت آسان ہے امر اور کلمہ کا مطلب ایک ہے، عقلِ کُل اور عرش کے معنی ایک ہیں تو اسی کے ساتھ یہ تیسرے نمبر کا سوال ختم ہوگیا۔

سوال ۴: خدا کے ارادے سے کیا مُراد ہے اور اِس ارادے سے دُنیا کو خلق کرنے کے کیا معنی ہیں؟

جواب: یہ سوال ارادے کی تشریح ضرور ہے۔ دیکھئے خدا کا ارادہ نہیں ہے قرآن پڑھئے: "اِذَا قَضٰۤى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ" (۳:۴۷)۔ اِس کے آخری معنی میں آپ کو بتاؤں، "اِذَا قَضٰۤى اَمۡرًا" اور جب کوئی امر پورا ہو جائے "فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ" تو خدا اُس کو کُن فرماتا ہے بس وہ چیز وُجود میں آتی ہے اور یہ آخری آیت نہیں ہے دُوسری آخری آیت ہے وہ بھی بتاؤں گا "اِنَّمَاۤ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيۡـًٔا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ" (۳۶:۸۲) خدا کے ارادے کی تشریح یہ ہے/خدا کے ارادے کی (definition) یہ ہے۔ خدا کسی چیز کو تکمیل کرنا چاہتا ہے، وُجود دینا چاہتا ہے تو وہ چیز ہو جاتی ہے یعنی اُس چیز کا قانونِ قدرت کے مطابق ہونا ہی خدا کا ارادہ فرمانا ہے، خدا کا ارادہ نہیں ہے، قانونِ قدرت کو قانونِ فطرت کو خدا کا ارادہ قرار دیا گیا ہے۔ مزید تشریح اِس کی یہ ہے کہ ایک انسان کے ارادے میں اور خدا کے ارادے میں فرق ہونا چاہئے یا نہیں ہونا چاہئے؟ ہونا چاہئے اِس لئے کہ انسان بہت ساری چیزوں کے تحت ہے انسان کا ارادہ بھی بہت ساری چیزوں سے متاثر ہوتا ہے اور اِس کا ارادہ (set) نہیں ہے، تو خدا کا جو ارادہ ہے بعد میں [وہ] ارادہ کرے یہ کیسے ہوسکتا پھر وہی بات ہوئی [جو] کہ ہم نے شروع میں بات کی تھی کہ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ خدا کی بادشاہی میں کچھ چیزیں شروع سے نہ ہوں اور بعد میں وُجود میں آئیں یا یہ کہ خدا کے خزانے، خدا کی دولت، خدا کی ہر چیز تو پھر ایسا خدا نو دولتی خدا کہلائے گا، ایک ایسے امیر کی طرح جس نے کوشش سے دولت پیدا کر دی، جب وہ نہیں ہے تو یہ

ارادہ بھی نہیں ہے اور ابھی میں نے مثال دی تھی کہ کُن فیکون اِس قدر نیچے آتا ہے کہ یہ مومنوں تک اور بہشت تک یہ عام ہو جاتا ہے رُوحانیت کی اعلیٰ سطح تک کُن فیکون کی کیفیت آتی ہے۔

اِس سے یہ جواب مہیا ہوگیا کہ کُن خدا کی خاصیت نہیں ہے، خدا کا قول نہیں۔ خدا کے ارادے کی تاویل ہے خدا کا ارادہ نہیں ہے، جب اُس کا قول نہیں ہے، جب اُس کا فعل نہیں ہے تو ارادہ بھی نہیں ہے۔ آپ غور کریں گے [اور] گہرائی میں جائیں گے تو ارادے کے اندر کمزوریاں پائی جائیں گی، لہٰذا ارادہ بھی کسی مجبوری کے تحت کیا جاتا ہے، جیسے یہود والے تصوّر میں آپ سوچیں کہ خدا نے اپنی شبیہہ [کو] پانی میں دیکھا تب اُس کو خیال آیا کہ ایک انسان یا مخلوق یا کائنات پیدا کرنی چاہیئے۔ دیکھیں اِس کی تاویل ہو تو ہم مانیں گے اور اگر تاویل کے بغیر ہو تو یہ بہت کمزور بات ہوگئی، خدا کو علم آیا پانی سے خیال آیا یہ تو انسان کا کام ہے کہ اپنے ماحول کے واقعات سے وہ عبرت حاصل کرتا ہے علم (acquire) کرتا ہے لیکن خدا جو خدا ہے وہ باہر سے علم کو حاصل نہیں کرتا ہے، واقعات اور حالات کو (calculate) کر کے اُن کے (result) بنا کے اُن کے ماحصل سے علم کو حاصل نہیں کرتا ہے، تو لہٰذا یہود کا یہ تصور صحیح نہیں ہے اور امامؑ نے جو بتایا یہ صحیح ہے اور ایک بات آخر میں مجھے یہ کرنی چاہیئے اِس سوال کے آخر میں کہ امام سلطان محمد شاہ روحی فداہٗ نے جو فرمایا کہ: خدا ہر وقت ارادہ کرتا ہے [اسلام میرے موروثوں کا مذہب، ص ۱۶] تو امامؑ جن لوگوں سے مخاطب ہیں وہ سطح ایسی نہیں ہے کہ [وہ] جو آخری بات ہے وہ کریں، اِس لئے امامؑ کے لئے بھی ایک طرح سے مجبوری ہے لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ خدا ارادہ کرتے ہیں اور جب بھی ارادہ کرتے ہیں تو ارادے کی بات آگئی اور حقیقت میں دیکھا جائے تو خدا ارادے سے بھی بالاتر ہے۔ ہم چلتے چلتے پانچویں سوال پر آئے۔

سوال ۵: امامِ مستودع کا تصوّر دین میں کب سے ہے اور اُس کا فعل کس طرح سے ہے اور یہ امامِ مستقر سے کس طرح مختلف ہے؟

جواب: تواریخ میں جب ہم دیکھتے ہیں امامت کی تواریخ میں، تو آدمؑ سے لے کر سیدھی (line) چلتی ہے اور جناب ابراہیمؑ پر آنے کے بعد امامت کی دو (branches) ہوتی ہیں۔ امامت کی تواریخ کو جب ہم دیکھتے ہیں تو یہ ویسے تو بہت آگے سے ہے اور بہت شروع سے ہے اور ہمیشہ سے ہے لیکن ہمیں جو نمایاں تواریخ ملتی ہے وہ آدمؑ کے زمانے سے ہے تو آدمؑ کے زمانے سے امامت کی تواریخ شروع ہو جاتی ہے۔ وہاں سے آگے چل کر ابراہیمؑ پر آ کر اِس دریائے نور کی دو شاخیں بنتی ہیں، ایک شاخ حضرت اسماعیلؑ اور دُوسری شاخ حضرت اسحاقؑ۔ ہمارے عظیم حجتوں نے اور داعیوں نے جو اپنے آثارِ علمی رکھے ہیں اُن کے اندر یہ بات واضح ہے اور قرآن میں بھی ہے کہ اسماعیلؑ بھی امام تھے اور اسحاقؑ بھی امام تھے۔ ہمارے اسماعیلؑ امامِ مستقر تھے اور اسحاقؑ امامِ مستودع تھے، مستقر معنی (permanent) اور

مستودع معنی امانت کے لئے ۔ایک پشت کے لئے یا چند پشتوں کے لئے امامت امامِ مستودع میں چلتی ہے پھر کیا ہوتی ہے، یہ لوٹ کر مستقر کے خاندان میں چلی جاتی ہے، تو زمانۂ ابراہیم یعنی دَورِ ابراہیم، دَورِ موسیٰ، دَورِ عیسیٰ یہ تین دَور گزر گئے تو اِن تین ادَوار میں دونوں درجے کی امامتیں چلتی رہیں ۔اُدھر خاندانِ اسماعیل میں مستقر امامت کا سلسلہ چلتا رہا، اِدھر خاندانِ اسحاق میں بنی اسرائیل میں مستودع امام کا سلسلہ چلتا رہا، تا آنکہ رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم عرب میں تشریف لائے اور اسلام کا ظہور ہونے لگا تو ایک دن سفرِ شام پر آنحضرتؐ، حضرت ابوطالبؑ کے ساتھ جارہے تھے کہ وہاں جو امامِ مستقر تھے انہوں نے اپنی امانتیں اور مقدّس چیزیں آنحضرتؐ کو سونپیں ۔ اِس معنی میں اسحاقؑ کے خاندان میں امامت کا جو سلسلہ چلتا تھا وہ حضرتِ اسماعیلؑ کے خاندان کے سلسلے سے جا ملا اور پھر مجھے یہ بھی کہنے دیجئے کہ جیسا میں نے کہا یہ جو مستودع امامت ہے ایک پشت کے لئے یا چند پشتوں کے لئے چلتی ہے اور جو مستقر امامت ہے وہ تو ہمیشہ کے لئے چلتی رہتی ہے، اسی طرح حضرت حسنؑ ہمارے بزرگانِ دین کے کہنے مطابق امامِ مستودع تھے اور حضرت حسینؑ امامِ مستقر تھے لہٰذا امام حسنؑ کی امامت امام حسینؑ میں لوٹ آئی اور اِس میں یہ مختلف ہے یعنی یہ فرق ہے اور امامِ مستودع کا جو فعل ہے وہ بس امام ہی کی طرح ہے وہ ہدایت کرتے ہیں، ہدایت کرتے ہیں ۔

آپ کو تعجب ہوگا کہ (at a time) یعنی ہدایت کے چند مراکز ہوسکتے ہیں لیکن سب سے بڑا مرکز ایک ہوتا ہے، مثلاً زمانۂ ابراہیم کو لیجئے کہ زمانۂ ابراھیم میں دُنیا کے اندر یہ مواصلات کا نظام نہیں تھا کہ دُنیا کے اندر جو مسلمان ہیں اُن کو ہدایت دیں اور اُس وقت ابراہیمؑ ہی سب سے بڑے پیغمبر تھے، لیکن ابراہیمؑ کے ساتھ ساتھ لوطؑ بھی پیغمبر تھے خدا نے ہی فرمایا ہے (۲۶:۲۹) اور لوطؑ اِس مرکز کے تحت تھے، کس مرکز کے تحت؟ ابراہیمؑ کے مرکز کے تحت ۔قرآن میں یہ بات بھی ہے کہ ایک ٹائم میں کسی گاؤں میں تین پیغمبر گئے لیکن تین کے ہونے سے اُن کے درمیان کوئی اختلاف تو نہیں ہوتا مرکز ایک ہوتا ہے تو قرآن میں ہے کہ اگر خدا دو ہوتے تو آسمان (divide) ہوجاتا اور کائنات درہم برہم ہوجاتی (۲۲:۲۱) ۔[آیت کے] ظاہر کو دیکھیں تو عجیب منطق ہے تو کیا اگر (suppose) مثال کے بتانے میں کوئی شک نہیں ہے، کوئی شک نہیں ہے مجھے بتانے کی اجازت ہو تو بتاؤں گا، خدا اگر دو ہوتے تو اُن میں خوبیاں ہوتیں خدا ہوتے یا بُرائیاں ہوتی خدا ہوتے، آپ کہیں گے کہ خدا میں تو بُرائی کیسے؟ خوبیاں ہوتیں تو یہ کیوں فرمایا گیا ہے کہ اُن کے درمیان جھگڑا ہوتا ایسی بات کیوں بتائی، یہ تو ظاہر میں دیکھا جائے تو بچّگانہ بات لگتی ہے، کبھی اُن کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہوتا لیکن پھر کیا وجہ ہے؟ اِس کے اندر تاویل ہے، تاویل کچھ اِس طرح سے ہے کہ دو کے معنی اِس میں دو خداؤں کے درمیان ذات میں صفات میں تضاد نہ ہونے کی بات ہے، ایک نور کے دوسرے نور سے جاملنے میں کوئی اِس میں یا اِس کی نفی نہیں کی گئی ہے ۔ بات دراصل کچھ ایسی ہے [کہ] جو دانشمند آسانی سے اِس کو سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں یہ تصوّر ہے کہ دو مختلف

خدا کے ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے، کہ اُن کے اوصاف مختلف ہوں اور اگر اُن کے اوصاف مختلف ہوتے تو لازمی طور پر اِس کائنات کے اندر فساد اور خرابی پیدا ہوتی یہ بات ہے۔ ایسا نہیں کہا گیا ہے کہ دو نور ہیں تو وہ دو نور آپس میں نہیں مل سکتے ہیں، یہ بات نہیں ہے کیا آیۂ نور میں جو فرمایا گیا تھا ہم وہ بھول گئے کہ: ''نُّوْرٌ عَلٰی نُوْر'' (۳۵:۲۴) آپ ہی بتائیں کہ اِس کے شروع میں جو فرمایا گیا ہے اُس سے کیسے پتا چلتا ہے کہ یہ کس کا نور ہے؟ خدا کا نور تو ہے ''اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' (۳۵:۲۴) خدا بذاتِ خود اِس کائنات کا نور ہے۔ اچھا! پھر اُس کے بعد کچھ الفاظ آگے چل کر: ''نُّوْرٌ عَلٰی نُوْر'' (۳۵:۲۴) ایک نور پر دُوسرا نور ہے تو خدا کے نور کے اندر دوئی کیسے آگئی؟ ایک نور کے ساتھ دوسرا نور کیسے جا ملا، یہ غور کرنے کی باتیں ہیں۔ چلئے ہم وسیع میدان میں نہ جائیں اور یہ جو سوالات ہمارے سامنے ہیں اُن سے گریز نہ کریں اور اُن ہی میں بات کریں، تو امام مستقر اور مستودع کی بات ہوگئی۔

سوال ۶: امامؑ کیا پیدائشی امام ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر قدرتی طور پر وہ اپنی پوری زندگی کیا پاک بازی سے گزارتے ہیں اور اِس صورت میں وہ لوگوں کے لئے کس طرح نمونہ ہیں؟

جواب: امامؑ ایک طرح سے دیکھا جائے تو وہ پیدائشی طور پر امام ہیں بلاشک لیکن اِس کے باوجود نمونۂ ہدایت بن جانے کے لئے اُن میں وہ ساری چیزیں ہیں جو ہونی چاہئیں اصل سوال یہ ہے، تو اِس کے ثبوت کے طور پر حضرت یوسفؑ کے قصّے میں جائیں گے تو کیا اسمٰعیلی لٹریچر کے مطابق حضرت یوسفؑ امام نہیں تھے؟ آپ مانیں گے وجہ دین اور دوسری سب کتابوں کے مطابق امام تھے، سورۂ یوسف کو آپ پڑھیں تو اِس کا جواب مل جائے گا۔ اِس طرح سے مل جائے گا کہ اُس میں ایک مقام پر کہا ہے کہ: ''اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ'' (۱۲:۵۳) نفس ہمارا بھی امّارہ ہے لیکن پروردگار کا رحم فرمانا جو ہے وہ بڑی چیز ہے۔ انسانِ کامل کا نفس نہ ہوتا اُس کو وہیں پر مارا نہ جاتا اور اُس پر فتح نہ پائی جاتی تو پھر انسانِ کامل کی کیا تعریف ہوئی۔ اگر آپ کے سامنے ایک ایسے کافر کو لایا جاتا ہے جس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں تو آپ تلوار لے کر اُس کو مارتے ہیں تو لوگ آپ کا مذاق اُڑائیں گے آپ اِس کے ساتھ ساتھ مجاہد کا ٹائٹل بھی لینا چاہتے ہیں لوگ مذاق اڑائیں گے، کہیں گے کہ آپ نے بڑی بہادری کی، تو کیا انسانِ کامل ایسی ہستی کا نام ہے کہ اُس کے سامنے میدانِ جنگ میں کوئی شئ نہیں ہے اور بس میدان صاف ہے وہ چلتا ہے تو (automatic) کام بنتا ہے تو پھر وہ تعریف کا مستحق ہوتا ہے۔

قرآن سے بڑھ کر اور کیا ثبوت چاہئے کہ قرآن نے یوسفؑ کی طرف سے کہا کہ: ''اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ'' (۱۲:۵۳) جو نفس ہے وہ بُرائی کی طرف حکم کرتا رہتا ہے لیکن خدا کا منشا اُس کا رحم فرمانا بڑا ہے اور خدا کا رحم فرمانا یہ تو ادب کے طور پر اُس نے کہا اور کہنا چاہئے کیا ایک مومن کی حیثیت سے آپ کوئی اچھا کام کریں گے اور کام کر چکنے کے بعد

اُس کام کو اپنی ذات سے منسوب کریں گے یا ادب کا، دین کا، ایمان کا یہ تقاضا ہے کہ بہت شکر گزاری کے ساتھ کہیں گے کہ اے مولا! یہ تیری مہربانی ہے، اِس ناچیز کی کچھ نہیں اور آنسو بہائیں حالانکہ واقعاً آپ نے کوئی کام کیا ہے اور آپ کی یہ گریہ وزاری اور یہ ادب صحیح ہے۔ اِس لئے کہ جو کچھ آپ کو دیا گیا ہے وہ اُسی کا ہے تو جو آپ کو ہمّت دی گئی ہے، جو آپ کو عقل دی گئی ہے، جو آپ کو ہدایت دی گئی ہے وہ سب اُسی مالک کی ہے تو لہٰذا اِس بھلائی کو آپ مولا سے منسوب کریں تو یہ بہت اچھی بات ہے۔ اسی طرح: "اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ" (۱۲:۵۳) کہنے کے یہ معنی نہیں ہے کہ انسانِ کامل پر اُوپر سے کوئی زبردست طاقت آ کر ہر چیز وہی کرے۔ اِس کے علاوہ کیا ہمارے پیروں کو بزرگوں کو بڑے پیمانے پر تائیدِ الٰہی نہیں آ رہی تھی، اُس کے لئے ایک مقام ہے، اُس کے لئے ایک مرتبہ ہے تو وہاں پر بالکل وہ چیز آتی رہتی ہے۔ لہٰذا امامؑ بشر ہے اور وہ شروع سے امامؑ بھی ہے تاکہ وہ ہدایت کا مکمّل نمونہ بنے۔

ابھی کچھ عزیزوں کے ساتھ ہماری یہ بات چلی تھی کہ اگر اللہ ایک فرشتے کو ہادی، پیغمبر اور امام بنا کر دنیا میں بھیجتا اور انسان کو جیسے اُس نے پیغمبر بنایا، امام بنایا ایسا نہیں کرتا تو وہ مکمّل ہدایت نہیں ہوتی، مکمّل ہدایت نہیں ہوتی تو فرشتہ جس میں نفس نہیں ہے، جس میں خواہشات نہیں ہیں، جس میں کمزوریاں نہیں ہیں، جو کھانے پینے سے اور دیگر چیزوں سے بالاتر ہے تو اُس کا امتحان کیسے ہوتا تو لوگ کہتے کہ اے فرشتہ! جا جا تو کیا جانتا ہے تجھ میں وہ مجبوریاں نہیں ہیں۔۔۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپ: اکبر علی پرُوف: نسرین اکبر

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُر حکمت بیان
عنوان: کچھ اعلیٰ سوالات کے جواب
کیسٹ نمبر: ۵۲۔ بی   تاریخ: ۲۴ ستمبر ۱۹۸۱ کراچی

تجھ میں وہ مجبوریاں نہیں ہیں، تجھ میں وہ نفس نہیں ہے، تجھ میں وہ خواہشات نہیں ہیں، تجھ میں بشریت کی ایسی رُکاوٹیں نہیں ہیں، تو جو تم کہتے ہو اِس کو کرکے دکھانے کے لئے تم میں وہ چیز نہیں ہے، تم اِس کے قابل نہیں ہو یوں کہنا چاہئے تھا۔ لیکن جب ایک انسان کامل ہدایت کے لئے دُنیا میں آتا ہے تو وہ کرکے دکھاتا ہے، اور عملی ہدایت اُس میں مکمّل اور بھرپور ہوتی ہے، لہٰذا امامؑ بشر ہیں لیکن انسانِ کامل، دیکھیں! انسانِ کامل یہ کتنی اچھی اصطلاح ہے۔ انسانِ ناقص، انسانِ کامل جیسے کوئی کہے کہ کچّا میوہ اور پکّا میوہ، تو دوسرے جو لوگ ہیں وہ نارسیدہ ہیں، پہنچے ہوئے نہیں ہیں، مکمّل ابھی نہیں ہوئے ہیں لیکن ممکن ہے اِس (term) کے اندر انسانِ کامل کہنے کے اِس معنی میں یہ ممکن ہے کہ یہ سب بھی کامل ہو جائیں گے اور یہ ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اور یے نمبر میں ہے کہ کیا امام کو امام بننے کے لئے ایک مومن کی طرح مختلف درجات سے گزرنا پڑتا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اِن پر ہر طرح کی تکالیف گزرنے میں کیا حکمت ہے؟ ہاں! تو امامؑ کے لئے حدود سے گزرنا ہوتا ہے کہ وہ مستجیب، پھر ماذون اور بڑا ماذون، چھوٹا داعی، بڑا داعی اور پھر حجّت اور بڑا حجّت، اِس طرح۔ قرآن میں بھی یہ ہے کہ ابراہیم جو ہیں وہ ستارے سے گزر گئے، چاند سے گزر گئے، سورج سے گزر گئے تو معنی یہ ہوئے کہ وہ حدود سے آگے گزر گئے (۶:۷۶۔ ۷۸)۔ میرے خیال میں اب اور کچھ ہے، معلوم نہیں بیان کرتے ہوئے میں نے سوال سے ہٹ کر بات کی ہوگی کیونکہ تشریح میں جانے کی وجہ سے (correct) الفاظ کو بتانا جو ہے یا ایک ہی محدود دائرے میں رہ کر سوال کو حل کرنا جو ہے، ایسا نہیں ہو تو میں ذرا زیادہ تشریح میں جاتے جاتے شاید کوئی بات رہ گئی ہوگی۔ لیکن چونکہ سوالات بہت ہیں یہ کسی اور وقت پر رکھتے ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ آپ تھک گئے کیونکہ ہم زور سے بولتے تھے اور باتیں جو ہیں وہ بہت اُونچی تھیں۔ تاہم میں مایوس نہیں ہوں، مجھے یقین ہے کہ میں نے بنیاد میں جو یہ بات بتائی کہ اِس کائنات کا کوئی آغاز نہیں ہے اور ہمیشہ سے ہے، یہ بات آپ کے لئے اہم ہے اور دوسری یہ بات میں نے اہم بتائی اُس کو میں دُہراتا ہوں کہ حدودِ دین جو ہیں وہ بہت اُونچی تعلیمات میں سے ہیں لیکن اِس کے اُوپر ایک دو تعلیمات اور ہیں۔

ایک تو وہ توحید کی تعلیم ہے اور ایک یعنی کُن کی تشریح کے سلسلے میں ہے وغیرہ اور میں نے آخر میں ایک بات بہت یعنی دلچسپ بتائی آپ اُس کو دوبارہ ذہن و خاطر میں لایئے اور بہت عجیب بات میں نے یہ کہی کہ کُن جو ہے وہ، اب

تک ہم نے یہ سوچا تھا کہ کُن جو ہے وہ حدودِ دین کے ساتھ اور ازل کے ساتھ اور عالم بالا کے ساتھ اِس کا تعلّق ہے، یہ بات نہیں ہے، کُن روحانیت میں بھی ہے اور بہشت میں بھی ہے، کُن جو ہے وہ ارادہ کرنا ہے، یہ ارادہ یعنی خدا کا نہیں، ہمارا ہے۔ ایک مقام پر قرآن میں بھی ہے کہ ہمارا جو ارادہ ہے خدا کے ارادے کے ساتھ مل جاتا ہے یعنی خدا کے قانون کے ساتھ مل جاتا ہے۔ جب ہمارا ارادہ خدا کے ارادے میں فنا ہو جاتا ہے تو ہمارا ارادہ خدا کا ارادہ بن جاتا ہے، یہ آخری بات ہے۔ جب ہمارا ارادہ، ہماری (will) خدا کی (will) بن جاتی ہے تو ہم ہی کُن کہتے ہیں۔ کُن معنی ہم (wish) کرتے ہیں، ہم یعنی چاہتے ہیں یعنی رُوحانیت کے مقام پر کسی دیدار کو چاہتے ہیں، بہشت کی کسی نعمت کو چاہتے ہیں، کسی علم کو چاہتے ہیں، کسی جلوہ کو چاہتے ہیں تو ہمارے چاہنے کے ساتھ وہ چیز نمودار ہو جاتی ہے، تو یہ کُن کا جو کام ہے یا کُن کا جو کرشمہ ہے یہ مومن کے لئے ہے اور خدا کے لئے یہ بات بھی بہت چھوٹی ہے اور دوسری جو ہے وہ انقلابی بات میں نے یہ کہی کہ عقلِ کُل اور نفسِ کُل یہ جو ہیں ایک وقتی تعلیم ہے، (permanent) نہیں ہے۔ اِن سے آگے بڑھ کر وہ دائمیت کی بات ہے، اِس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ بھی عقلِ کُل، نفسِ کُل بن سکتے ہیں، عجیب بات میں نے کہی؟ اِس وقت اگر آپ کو نیند آئی ہے تو یہ جو ہے اُچک جائے گی۔ آپ بھی عقلِ کُل، نفسِ کُل وغیرہ ہو سکتے ہیں، عرشِ الٰہی ہو سکتے ہیں۔ کیا خدا نے یہ نہیں فرمایا کہ بہشت میں جن مومنین کو جنّت ملے گی اُس جنّت کے تحت چار نہریں چلیں گی؟ پانی کی نہر، صاف پانی کی نہر اور نہ سڑنے والا دودھ اُس کی نہر اور لذیذ پُر لذّت شراب کی نہر اور صاف شہد کی نہر (۴۷:۱۵) تو خداوندِ عالم نے اِن حدود کو ہماری جنّت کے اندر نہروں کی شکل دی ہے۔ اِن کو ہمارے لئے تابع بنایا ہے تو پھر یہ حدود کہاں رہے؟ تو بات بہت آگے گئی، بہت بلند ہوگئی اور حالانکہ ہم خود ہی حدود پر زور دیتے ہیں اور زور دینا چاہئے۔ چلو اگر آپ آج اِس مجلس میں اِس قابل ہیں تو کیوں یہ بات نہ بتادی جائے، تو کچھ لوگوں نے اپنی مستی میں آکر "انا الحق" بھی کہا ہے تو کیا ہم نے کچھ انا الحق کہا؟ تو یہ بات یعنی صوفیوں نے کہی ہم تو اسمٰعیلی ہیں، امامؑ کے رُوحانی فرزند ہیں ماشاء اللہ تو ہم یعنی ابھی ابھی دعویٰ کرتے تھے کہ سلمان کے پیچھے پیچھے چلنا چاہئے۔ سلمانؓ کے پیچھے پیچھے چلنا منظور ہے تو اُس میں یہ انقلابی باتیں ہیں تو آپ انقلاب لاؤ، انقلاب کے بغیر کس طرح یعنی اِس سلطنت کے اندر جو ہماری ذاتی سلطنت ہے، جو یہاں حکومت ہے اِس میں اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے؟ تو اگر منظور ہے تو انقلاب لاؤ اور انقلاب یہ ہے اور یہی انقلاب ہے، کہ جب تک آپ حدود سے آگے نہیں بڑھیں گے نظریاتی طور پر تو آپ کو توحید اور انسان کے بلند مرتبے کا [علم ہوگا]۔ کیا خدا نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ جو مجھ کو پہچانے گا میں اُس کے سامنے ایک خزانے کی شکل سے پیش آؤں گا اور میں اُس کی جائیداد بن جاؤں گا، اُس کا خزانہ بن جاؤں گا [کُنتُ کَنزاً مَخفِیّاً فَاَحبَبتُ اَن اُعرَفَ فَخَلَقتُ الخَلقَ لِکَی اُعرَفَ (ہزار حکمت، حکمت نمبر ۷۵۶)]۔ اب اِس میں حدود کا ذکر کہاں ہے؟ کیا یعنی یہ اشارہ نہیں ہے کہ مومن کی رُوح جو ہے وہ خدا کے نور سے واصل ہو جاتی ہے۔ جب مومن کی رُوح خدا

کے نور سے واصل ہو جاتی ہے تو مطلب اِس کا یہ ہوا کہ یہ عرش سے اور کُرسی سے اور حدود سے آگے بڑھتی ہے۔

بہر حال یہ ہے کہ حدود جو ہیں وہ سیڑھی کی طرح ہیں یعنی خدا کے حضور تک مومنین کو پہنچانے کے لئے تو خدا نے اِس پر اپنی تعریف کی ہے کہ وہ سیڑھیوں والا ہے"ذِی الْمَعَارِجِ"(۷۰:۳) سیڑھیوں والا ہے۔ سیڑھیوں سے حدود مُراد ہیں تو اگر حدود سیڑھیاں ہیں تو آپ کو، ہم کو سیڑھی پر بسیرا تو نہیں لینا ہے، اور سیڑھی پر رہے تو ہم کو کیا ملے گا؟ محل میں جانا ہے اور بادشاہ کے حضور میں جانا ہے۔ یہ سیڑھی جہاں جانے کے لئے ہے، اگر آسمان تک جاتی ہے تو ہم کو آسمان پر جانا ہے، اگر یہ سیڑھی عالم بالا تک ہے تو عالم بالا کو، اگر یہ خدا تک ہے تو خدا کو پہنچنا ہے، نہ کہ سیڑھی۔ سیڑھی جو ہے بذاتِ خود کوئی مقصود نہیں ہے اور نہ رستہ فی نفسہٖ کوئی مقصد ہے۔ رستے کا کوئی مقصد ہے، سیڑھی کا کوئی مقصد ہے، حدود کا کوئی مقصد ہے، وہ درجات ہیں اور اِس سے آپ کو باور آیا کہ مومن کا جو آخری مقام ہے۔ بہت اُونچا ہے لیکن افسوس ہو گا کہ اگر ہم نے اِس عالی مرتبت کے مقابلے میں دُنیا کی کسی چیز کو ہم نے ترجیح دی اور اِس عظیم مقصد کو پس پُشت ڈالا تو بہت ہی افسوس ہو گا۔ بہت ہی افسوس ہو گا، اور دوسری بات، اگر ہم ایسے صاف ستھرے علم کو چھوڑیں جس سے ہم کو حوصلہ ملتا ہے۔ جس سے ہم کو یقین ملتا ہے۔ جس سے ہم کو بلندی ملتی ہے اِس کو چھوڑا اور اِس کی طرف پُشت پھیر دی تو بہت افسوس ہو گا۔ بہت ہی افسوس ہو گا، تو جب امامؑ کے خزانے میں ہے، اسمٰعیلی مذہب میں ہے تو اِس سے فائدہ اُٹھانا چاہئے۔ وہ لوگ کتنے نادان ہوں گے جن کی زمین میں ایک صاف و شفاف چشمہ رواں دواں ہے اور وہ لوگ جو ہیں اپنی زمین کو بنجر چھوڑتے ہیں، اُس کو آباد نہیں کرتے ہیں، باغ و گلشن نہیں لگاتے ہیں، کچھ پھول نہیں اُگاتے ہیں، کچھ درخت نہیں لگاتے ہیں، کچھ اُس پانی میں نہاتے نہیں ہیں، کچھ اُس سے اپنے لباس کو دھوتے نہیں ہیں، کچھ شُستہ شوئی نہیں کرتے ہیں اور کچھ اُس کو یعنی خوراک کے لئے، پینے کے لئے استعمال نہیں کرتے ہیں تو اُن کی بڑی نادانی ہو گی۔ اِس سے مراد اسمٰعیلی مذہب کی تعریف ہے، اور امامؑ کی ہدایت مراد ہے، اِس میں کوئی (particular) شخص مقصود نہیں ہے، تو جن کو امامؑ کا علم ملتا ہے بڑی شکر گزاری کے ساتھ اُن کو علم لینا چاہئے اور اپنی رُوح کو بلندی دینی چاہئے، تو اِن باتوں کے ساتھ میں اپنی گفتگو کو خاتمہ کرتا ہوں اور شکریہ کہ آپ نے توجّہ دی۔ مجھے اِس کی قدر کرنی چاہئے کہ آج کتنے اچھے ممبران آئے ہیں اور کتنے بہت ہی عالی قدر ہستیاں موجود ہیں، بہت علم والے اور عقل و دانش والے جس سے مجھے قوّت ملی اور میں شکر گزار ہوں۔ شکریہ، یا علی مدد۔

تشریح کا سلسلہ لمبا ہو گیا، اِس واسطے ذرا اِس کو (stop) کیا۔ نہیں تو درمیان میں یہ سوچا گیا تھا کہ (cross-questions) بھی ہو جائیں تو ابھی ہم آرام سے بیٹھے ہیں، کوئی اِس میں خاص بات۔ سوالات کا جو حصّہ جو ہے سامنے پیش کیا گیا اُس کے سلسلے میں اگر کوئی بات ادھوری رہ گئی ہو تو پوچھا جا سکتا ہے۔ اِس میں دوبارہ وضاحت کرنے میں کوئی وہ نہیں ہے اور جو کچھ رہ گئے ہیں تو پھر اُس پر (discuss) کریں گے کبھی۔ امامت جو ہے وہ نبوّت کی مثال پر

ہے تو ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر جو دُنیا میں آئے ہیں وہ زنجیر کی طرح بھی آئے اور بیک وقت یعنی پھیل کر بھی آئے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آدمؑ سے لے کر اب تک آپ پُشتیں گنیں گے تو وہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پُشتیں نہیں ہوں گی۔ زیادہ سے زیادہ یہ پُشتیں ہوں گی اور سَو پُشتیں بھی نہیں ہوں گی، ۳۵،۴۰ [پشتیں] مشکل سے آدمؑ سے لے کر آنحضرتؐ تک، ایسا کچھ ہے نا! ۔ اب تو پھر وہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر کس طرح ہوئے؟ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر ایک پیغمبر کے بعد ایک آیا، پھر دوسرا آیا، پھر تیسرا آیا، ایسے سلسلہ وار آیا تو پھر یہ ایک لاکھ چوبیس ہزار کس طرح بنے؟ اِس سے ظاہر ہے کہ ایک وقت میں کئی پیغمبر بھی آئے۔ چلیں ٹھیک ہے امامت میں ایسا نہیں ہے تاہم اگر دو امامؑ ہوتے ہیں تو اُن میں سے ایک مرکز ہوتا ہے اور دوسرا جو امام اُس سے مل کر ہوتا ہے، اندیشہ وہاں ہوتا ہے جہاں اختلاف ہو اور تضاد ہو۔ اُس کے علاوہ ایک وقت میں دو امامؑ کے ہونے میں اور ایک وقت میں ایک امامؑ اور ایک پیغمبر کے ہونے میں کیا فرق ہے؟ حالانکہ ہمارے عقیدے کے مطابق امام کو بھی ایک بہت بڑا مرتبہ حاصل ہے۔

میرا اشارہ ہے زمانۂ رسول کی طرف، تو زمانۂ رسول میں اگر حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ اور بی بی فاطمہؑ کے مرتبے کو وقتی طور پر نہ بھی لیں یا نہ بھی سمجھیں تو مولا علیؑ آنحضرتؐ کے ساتھ جو تھے وہ کیوں تھے؟ کیا رسولؐ کے ہونے سے امامؑ کے مرتبے کو کچھ نقصان پہنچتا ہے؟ اور زمانۂ رسول ہی بہترین نمونہ ہے۔ اِس لحاظ سے کہ جہاں پیغمبر بولتے تھے وہاں علیؑ خاموش رہتے تھے تو اُس میں امامؑ تھے یا نہیں تھے؟ امامؑ تھے اور پھر ایک تو صامت ہو گئے، ایک ناطق ہو گئے۔ اِسی طرح جس زمانے میں امامِ مستقر اور امامِ مستودع دو ہوتے ہیں تو ایک کا تعلّق زیادہ سے زیادہ باطن سے ہوگا اور دوسرے کا تعلّق زیادہ سے زیادہ ظاہر سے ہوگا یا یوں کہنا چاہئے کہ وہ ایک دوسرے کی نمائندگی کریں گے کہ امامِ مستقر کی نمائندگی امامِ مستودع کریں گے، اِس لئے دو امامؑ اگر ہیں تو مرکز اُس میں ایک ہوگا۔ اِس لئے مرکز کے ایک ہونے کے سبب سے اور دونوں کے ایک ہونے کے سبب سے اُن کو ایک شمار کیا جائے گا۔ اِس کے علاوہ دوسری بات یہ بھی ہے کہ مثلاً ایک امامِ سابق ہے، اگلا امام اور ایک اُس کے جانشین ہیں، تو اب جو والد امام ہیں وہ فرزند امام کو دین کی حکمتیں اور اسرار دیتے ہیں لیکن ایک طرح سے کچھ وقت کے لئے دو ہیں۔ اِس طرح سے بھی دو ہو سکتے ہیں، اِس میں آپ کہیں گے کہ جو باقاعدہ امام ہیں تو وہ امامِ سابق ہیں تو میں کہوں گا کہ یہ جو امامؑ ہونے والے ہیں یہ بھی تو آخر کچھ قابلیت کے ساتھ ہیں، کچھ مرتبے کے ساتھ ہیں، کچھ نور کے ساتھ ہیں، کیونکہ آناً فاناً امامت کی خصوصیات اُن کے فرزند میں نہیں آتی ہیں، وہ آہستہ آہستہ یعنی آتی ہیں، وہ ایک دن کی چیز نہیں ہے۔ اِس لحاظ سے اگرچہ اختیار جو ہے، اختیار کے مرکز اگلے امامؑ ہیں جب تک وہ حیات ہیں لیکن اِس کے باوجود جو ہونے والے امامؑ ہیں وہ بھی ایک طرح سے امامؑ ہیں جس طرح مستقر اور مستودع کی مثال تھی۔

اِس کے علاوہ ابھی لوگ رسائنسدان یہ تلاش کر رہے ہیں کہ کس کس سیّارے پر حیات ہے یا نہیں ہے؟ تلاش کر

رہے ہیں لیکن ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ کسی سیارے پر زندگی ہے یا نہیں؟ تاہم اب نہیں تو آگے چل کر ممکن ہے کہ کوئی سیارہ جو ہے وہ آباد ہو جائے، چاند یا مریخ یا اور کوئی تو اُس صورت میں یہاں سے لوگ جائیں تو کچھ وقت کے بعد وہاں پر فرض کریں کہ آبادی ہوگئی، ایک دُنیا بس گئی۔ آپ کا، ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ اگر زمین پر امامؑ نہ ہو تو زمین جو ہے وہ چلی جائے گی، اب اِس اُصول کے مطابق وہاں پر بھی کوئی امام ہونا چاہیئے جو وہاں پر امام نہیں ہوگا تو لوگ کہیں گے کہ تمہارا یہ دعویٰ غلط ہے، تم جو کہتے تھے کہ زمین پر نائبِ خدا کا ہونا ضروری ہے، اِس لئے لازمی طور پر وہاں کوئی امامؑ ہوگا، جس طرح سے بھی ہو، ایک امامؑ ضرور ہوگا لیکن وہ امام اِس امام سے الگ کیسے ہوسکتا ہے؟ کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ وہ یعنی اُن کو آپ الگ کرنے کے لئے کوشش کریں وہ الگ نہیں ہوں گی، اُن کی ذات، اُن کی صفات، اُن کی خاصیت ایک ہے لہٰذا وہ ایک ہیں۔ اگر اِس کمرے کے اندر دس بلب لگے ہوئے ہیں تو ہم دیکھیں گے کہ وہ بلب جو ہیں الگ الگ ہیں لیکن اُن کی جو روشنی ہے ہم اُس کو الگ نہیں کرسکیں گے، یہ بہت مشکل بلکہ ناممکن بات ہے کہ ہر بلب کی روشنی کا تعیّن کریں اور حالانکہ یہ سب روشنی ایک ہے۔ اِس طرح فرشتے بہت زیادہ ہیں لیکن اُن کا جوہر جو ہے وہ ایک ہے، اور مومنین جو اُوپر جائیں گے اُن کی رُوحیں بھی ایک ہوں گی کیونکہ وہ خاصیت ایک ہے، روشنی ایک ہے، ذات ایک ہے، کام ایک ہے، سرچشمہ ایک ہے اور اِس رُوح کی (division) کس طرح ہوئی ہے؟ آپ کو معلوم ہے یہ ہمارے اجسام ہیں، ہماری شخصیتیں ہیں اِن کی وجہ سے اور اگر اِن کو الگ کریں، اِن سے رُوح الگ ہو جائے تو وہ خودبخود یعنی کہ ایک ہو جائے گی، اُس کی خاصیت جو ہے وحدت کی ہے۔ جس طرح جسم کی خاصیت ہے تفرقے کی، انتشار کی اور دُوئی کی، کثرت کی خاصیت ہے لیکن رُوح کی جو خاصیت ہے وہ وحدت کی ہے، تو جہاں رُوح ایک ہے، جہاں فرشتے ایک ہیں تو وہاں۔۔

عال ہوسکتا ہے کہ آپ کے (notice) میں کوئی کتاب آئی ہو تو اُس میں خدا کو عال کہا گیا ہو لیکن دیکھا جائے تو خدا عال بھی نہیں ہے۔ کہا جاسکتا ہے کسی مرحلے میں خدا کو عال یعنی علّت بنانے والا، (cause) کا (creator)(cause) بنانے والا لیکن جس طرح ابھی کہا گیا کہ خدا قائل نہیں اِس طرح خدا فاعل بھی نہیں یعنی خدا کہنے والا بھی نہیں اور کرنے والا بھی نہیں ہے بلکہ وہ بادشاہ ہے، تو اِسی طرح اگر علّت عقلِ کُلّی کو مانتے ہیں تو جو مُبدع ہے وہ عال ہوگا کیونکہ عقلِ کُلّی کو علّت مانتے ہیں حکماء جو (philosopher) ہیں تو پھر مُبدع جو اِبداع سے عقلِ کُل کو وُجود دیا ایک ذیلی تعلیم کے مطابق تو وہ وہی عال ہوگا، علّت کا بنانے والا اور اِس لئے خدا سے مُراد ایک تصوّر رہے، خدا سے مراد ایک نصبُ العین ہے، خدا سے مراد ایک (law) ہے، قانون ہے تو خدا سے مُراد یعنی (holiness) کا ایک (concept) ہے۔ ویسے تو لفظِ خدا کا اطلاق کبھی تو ناطق پر ہوگا، کبھی اساس پر ہوگا، کبھی عقلِ کُل پر ہوگا، کبھی نفسِ کُل پر ہوگا، کبھی اِس کا اطلاق مُبدع پر ہوگا لیکن اِن اطلاقات کے باوجود ایک درجہ ایسا ہوگا جو کہ ہر چیز سے بالاتر ہے، تو آخر میں یہ بات ہمیں بتائیں گے بزرگانِ دین کہ خدا جو

ہے وہ علم کے تحت نہیں آتا ہے، یہ آخری بات ہے۔علم وہ ہے جس کے تحت ہر چیز آئے گی، ہر چیز آئے گی، علم کے (control) میں علم کے تحت میں ہر چیز آئے گی، ہستی بھی، نیستی بھی لیکن خدا یعنی وہ درجہ جو سب سے بڑا ہے وہ علم کے تحت نہیں آئے گا تو یہ حیران کُن بات ہے۔ہمارے بزرگانِ دین نے ہر زمانے میں جو علم وجود میں آیا تھا، جو فلسفہ چلتا تھا اُسی کے وسیلے سے لوگوں کو حیران کر دیا، یہ اِس لئے کہ زمانے کی جو زبان ہے اُسی زبان میں بات کرنی ہوتی ہے لیکن ہماری اپنی زبان، اسماعیلیت کی زبان کچھ اور ہے، یہ توحید ہے اور یہ مونوریالزم ہے۔ہم نے جو ابھی بیان کیا وہی مونوریالزم ہے۔مونوریالزم ہے اِس واسطے میں نے مومن کے مرتبے کو بہت بلندی پر بتایا تو یہ بھی کہیں کہ آپ کو جو بول ملتا ہے وہ کلمہ ہے۔ آپ کو جو بول ملتا ہے وہ کلمہ ہے، وہی کُن ہے۔''وَاِذَا قَضٰٓی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ''(۲:۱۱۷)اِس کا یعنی واقعہ یہاں ہوگا، آپ دیکھیں گے کہ خدا کس طرح کُن فرماتا ہے۔

کل ہی کچھ (students) کے ساتھ یہ (discussion) چل رہا تھا کہ خدا نے اِس کائنات کو چھ دنوں میں پیدا کیا تو میں نے عرض کیا کہ میں سوال کرتا ہوں کہ کائنات کے بنانے کے سلسلے میں جو قرآن میں قصہ ہے اُس قصّے کا اطلاق عالمِ دین پر ہوتا ہے یا عالمِ صغیر پر ہوتا ہے یا اِس باہر کی کائنات پر ہوتا ہے؟ تو آخر میں، میں نے تشریح کر کے یہ ثابت کیا کہ اِس کا اطلاق یہاں ہوتا ہے۔خدا نے چھ دن میں اِس کائنات کو پیدا کیا رُوحانی طور پر، وہ کس طرح؟ رُوحانیت کے چھ حصّے ہیں۔ایک رُوحانیت کا حصّہ وہ ہے جس میں آدمؑ کے واقعات آتے ہیں اور دوسرے مرحلے میں نوحؑ کی رُوحانیت سے متعلّق واقعات آتے ہیں، تیسرے میں ابراہیمؑ کا دَور آتا ہے، چوتھے میں حضرتِ موسیٰؑ کا، پانچویں میں عیسیٰؑ کا اور چھٹے میں آنحضرتؐ کا (۷:۵۴)، تو چھ دن میں یہ (individual) یعنی دُنیا، یہ ذاتی عالم بن گیا۔اب ساتویں میں خدا عرش پر مُستَوِی ہوتا ہے یعنی ساتویں میں قائم القیامتؑ سے رسائی ہوتی ہے، یہاں یا وہاں یا یہاں کہیں بھی پھر اسی کے ساتھ ساتھ ویسے تو بہت سے بول ہیں، بہت سے اسمِ اعظم ہیں۔فرض کیجئے کہ اس میں سات نام آپ کے سامنے آتا ہے۔پہلے نام میں پہلے اسم میں آدمؑ کے واقعات، آدمؑ کے دَور کے واقعات، دوسرے اسم میں نوحؑ کے، تیسرے اسم میں ابراہیمؑ کے، چوتھے اسم میں موسیٰؑ کے، پانچویں اسم میں عیسیٰؑ کے، چھٹے میں حضرت محمدؐ کے اور ساتویں اسم میں قائم القیامتؑ، قیامت برپا ہوتی ہے اور تاویلی طور پر، تو یہ اِس شخصی دُنیا کی تکمیل ہوگئی، اور پھر اِس سے عالمِ دین مختلف نہیں ہے۔عالمِ دین معنی وہ دُنیا جس میں دین ہو، تو عالمِ دین کے پہلے دن میں آدمؑ تھے، دوسرے دن نوحؑ، تیسرے دن ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، محمدؐ تو چھ دن میں خدا نے اِس عالمِ دین کو بھی پیدا کیا اور چھ دن میں اِس کو بھی پیدا کیا۔وہاں آدمؑ ایک شخصیت میں ہے، یہاں آدمؑ ایک اسم میں ہے تو کیا فرق رہا؟ یہاں شاید چالیس برس میں یا بیس برس میں وہ سب معاملات ہو گئے اور اُس عالمِ دین میں یعنی کہ پانچ چھ ہزار برس میں یہ کام ہو گیا۔پھر اِس میں کیا فرق ہے؟ یہاں جو کچھ ہے وہ یعنی لفظ میں ہے، علم کی صورت

میں ہے، ذرّے میں ہے، وہاں عالمِ دین میں جو ہے وہ شخصیتوں میں ہیں، تو یہاں بھی محمدؐ ہے، وہ ایک نور کی شکل میں ہے یا ایک اسم کی شکل میں ہے یا ایک بول کی شکل میں ہے اور وہاں عالمِ دین میں بھی محمدؐ ہیں۔ وہاں ایک شخصیت کے ساتھ ہیں، ایک جسم کے ساتھ ہیں، تو امام کسی دُنیا کے مقام پر بھی ہیں اور آپ میں بھی امامؑ ہیں اور آپ میں جو امامؑ ہیں وہ ایک لطیف نور ہیں، ایک اسم ہیں، ایک ذکر ہیں، ایک بول ہیں اور وہاں جو امامؑ ہیں وہ ایک ہستی ہیں، تو امامؑ سب مومنین سے کس طرح (approach) کر سکتا ہے؟ کہ جسم سے رسائی ہوتی تو یہ ناممکن بات ہوتی۔ امامؑ سب مومنین سے یہ بات ہے، ویسے تو سب کے پاس ہے لیکن خصوصی طور پر مومنین کی بات کرنی چاہئے تو مومنین کے پاس امامؑ (special) ایک نور کی حیثیت میں ہیں، ایک اسم، ایک علم، ایک عقیدہ، ایک محبّت، یہ چیزیں امامؑ کے مظاہر کی حیثیّت سے ہیں۔

جی ہاں، آپ کی بات کیا تھی؟ کیا سوال تھا؟ اور، اور کسی کو [سوال ہے] پوچھیں کیونکہ ابھی مجلس پوری کرنی ہے۔ یہ ایسا ہے امامؑ کے لئے کوئی رُکاوٹ نہیں ہے یعنی امامؑ کا جو کام ہے وہ رُکتا نہیں ہے کیونکہ امامؑ کی ہدایت ظاہر میں بھی ہے، باطن میں بھی ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ اتنی بڑی ترقّی جو ہے وہ ایک (seat) کی طرح ہے۔ حدودِ دین سے انکار نہیں ہے، اِس زمانے میں یعنی حدود میں سے اور کون سا ہونا چاہئے، اگر کوئی بڑے سے بڑے درجے کے لئے وقت ہے، دَور ہے اور اُس کی شرطیں بھی پوری ہو رہی ہیں اور کوئی شخص قربانی دے رہا ہے اور امامؑ چاہ رہا ہے تو یعنی ہر طرح سے ہو جائے گا اور یہ جو میں نے بات کی بہت اُونچی بات ہے اور بہت مشکل بات ہے۔ کبھی میں سوچ رہا تھا کہ اپنے دوستوں کو، عزیزوں کو یہ بتاؤں کہ اُن کے پاس کوئی اندازہ ہو جس سے کہ وہ سمجھیں کہ پیروں نے جو چیز پائی اِس کے لئے اُنہوں نے یعنی جسمانی محنت کتنی اُٹھائی، ریاضت کتنی کی، خدمت کتنی کی اِس کا کچھ (guess) ہونا چاہئے اور اگر ہمارے پاس اِس کا یعنی اندازہ ہے تو ہمارے لئے بہت اچھی بات بن جائے گی کہ ہم اُس میں سے آٹھواں حصّہ کرتے ہیں یا چھوتھا حصّہ کرتے ہیں یا بالکل اتنی ہی عبادت کرتے ہیں جتنی کہ اُنہوں نے کی ہے۔ آپ تو تسلیم کریں گے کہ ہمارے بزرگانِ دین نے جو کچھ پایا اُس کے لئے اُن کی قربانی بھی ایسی عظیم تھی۔ ہم اُس قربانی کے مقابلے میں، اُس عبادت اور اُس محنت کے مقابلے میں، میں سچ کہتا ہوں کہ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ اِس کا مقصد کیا ہے؟ اِس سے میری مراد یہ ہے کہ اگر ہم اتنی محنت کریں تو شاید اور یقیناً کچھ ہو جائے، میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یعنی امامؑ ظاہر کا بادشاہ ہے اور باطن کا بادشاہ ہے تو ایک بار امامؑ سے رسائی شاید ضروری ہے اور یقیناً ضروری ہے۔ پھر اُس کے بعد سب کام اگر ہم امامؑ کے سچے فرمانبردار ہیں تو ہو جائیں گے۔

ٹائپ: اکبر علی | پُروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق) کا پُرحکمت بیان

عنوان: قربانی کی حکمتیں

کیسٹ نمبر: ۵۳   تاریخ: ستمبر/ ۱۹۸۱، کراچی

Click here for Audio

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ فَأَمَّا بَعۡدُ

عزیزانِ من! یہ چھوٹی سی جمعیت بموقعِ عیدِ سعید یہاں حاضر ہے اور آپ نے یہ ایک معمول بنایا ہے کہ ہر عید کے موقع پر عزیزان جمع ہو کر دین اور ایمان کی کچھ باتیں کر لیا کرتے ہیں اور یہ آپ سب عزیزوں کی بہت بڑی سعادت مندی ہے اور خوش نصیبی ہے، کیونکہ انسان جس مقصد کے لئے دنیا میں آیا ہے وہ دین ہی ہے اور اگر دین کا مقصد حاصل ہوتا ہے، پورا ہوتا ہے تو یہ اُن انسانوں کی بڑی سعادت مندی ہے۔ خانۂ حکمت ایک چھوٹی سی جمعیت کی شکل میں ہے اور میں آج ایک اہم بات بتاؤں گا جس کے سننے سے آپ بڑے خوش ہو جائیں گے، وہ یہ کہ قرآنِ مقدّس میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اُس کے قانونِ رحمت نے بہت دفعہ چھوٹی چھوٹی جمعیتوں کو کامیابی سے نوازا ہے۔ چنانچہ آپ کی جمعیت بھی ایک ایسی چھوٹی سی جمعیت ہے جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی تائید حاصل ہے اور قرآنِ مقدّس میں ایسی چھوٹی سی جمعیتوں کو ماضی میں بارہا کامیابی سے ہمکنار کرنے کا ذکر ملتا ہے۔

کیا ہی اچھا ہے کہ ہم ملتے ہیں اور مذہبی شکل میں بات چیت کرتے ہیں تو اُس کا ایک عمدہ سا نتیجہ اور بہترین سا پھل سامنے آتا ہے جو کہ وہی پھل اپنی لذّتوں اور خوشبوؤں کے ساتھ دنیا کے بہت سے حصوں میں جاتا ہے۔ یہ آپ کی نیک نیّتی ہے، یہ آپ کا اخلاص ہے، یہ آپ کی پُرخلوص دینداری کا ثبوت ہے کہ جو بھی آپ جدو جہد کرتے ہیں وہ کامیاب ہو جاتی ہے اور آج تک جتنا کام کیا گیا ہے، محنت اور مشقّت کو دیکھا جائے تو اُس میں کچھ ایسا نہیں لگتا ہے کہ اُس میں زیادہ کچھ رنج اُٹھایا گیا ہے لیکن کام کی نوعیت کو دیکھا جائے تو بہت ہی مفید اور دُور رس فائدے کا حامل ہوتا ہے۔ یہ اِس لئے ایسا ہے کہ آپ نے اسلام کے زرّین اُصول کے مطابق دوسروں کے لئے قربانی پیش کرنے کا جذبہ اپنی ذات کے اندر پیدا کر لیا ہے۔ امامِ عالی وقار کے فرمانِ اقدس میں جیسا کہ آپ کے ذہن میں ہے فرمایا گیا ہے کہ اسلام میں اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے جینا ہے، دوسروں کے لئے خدمت کرنی ہے، دوسروں کے لئے جذبۂ قربانی پیش کرنی ہے، اور آج کا دن وہ عظیم یادگار دن ہے جس میں حضرتِ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السّلام نے اپنے فرزند لختِ جگر حضرت اسماعیلؑ کی

قربانی بارگاہِ ایزدی میں دل و جان سے پیش کی تھی اور خداوندِ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ جو غالب اور حکمت والا ہے، اُس نے اِس قربانی کو قبول بھی کرلیا اور حضرت ابراہیمؑ کے جگر گوشے کو خَلاصی بھی دی۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ قربانی کیوں تھی اور کس کے لئے تھی؟ اوّل تو یہ سوچنے کی بات ہے کہ خداوندِ عظیم نے اتنی بڑی قربانی کیوں چاہی، اتنی گرانقدر قربانی کا تقاضا کیوں کر ہوا؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔ اِس میں ایک اشارہ تو یہ سامنے آتا ہے کہ دین کا معاملہ کچھ آسان نہیں ہے، خدا کی خوشنودی کی یہ حد ہے کہ خدا کی رضا کو حاصل کرنے کے لئے عزیز ترین فرزند سے بھی ہاتھ دھولینا پڑتا ہے اور دنیا میں انبیاءِ کرامؑ جو آئے اُنہوں نے خدا کی خوشنودی کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے اُس کے نمونے بنی نوع انسان کے سامنے پیش کئے۔ اِس قربانی کے ظاہر میں اور باطن میں کتنی کتنی حکمتیں ہیں اور اُن میں سے ہر حکمت عظیم ہے۔

اِس قربانی کے باطنی پہلو سے بحث کرنے سے قبل ہم ظاہری پہلو سے بات کرتے ہیں کہ دنیا میں خداوند عالمین کی طرف سے آزمائش جو آتی ہے جس کو عربی میں ''بلا'' کہا جاتا ہے اور ''بلا'' آزمائش کو کہتے ہیں تو یہ آزمائش سب سے پہلے انبیائے کرامؑ پر آتی ہے، اُس کے بعد اوصیاء پر آتی ہے یعنی اُن کے جو وصی ہوتے ہیں، اُن کے جو جانشین ہوتے ہیں، جو اساس ہوتے ہیں اور تیسرے درجے کی آزمائش اماموں پر آتی ہے اور چوتھے درجے کی آزمائش جو ہے مومنین پر آتی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا اور جو خدا کے مقرّب ہیں وہ اِس خدا کے قُرب سے فائدہ اُٹھا کر تَن آسانیاں کرتے، دنیا میں امن و چین سے بیٹھتے، کوئی تکلیف اُن کو نہ آتی، کوئی آزمائش اُن پر نہ آتی تو پھر جو دوسرے عام انسان ہیں وہ کیا کرتے، اُن پر تو ایک طرح سے ظلم ہوتا کہ جو چیز بھی آئی تو وہ ناحق آئی اور انہونی بات ہوئی۔ ایسا نہیں ہے، نمونۂ انسانیت جو ہے سب سے پہلے انبیاءؑ پیش کرتے ہیں پھر اوصیاءؑ اور ائمّہؑ پیش کرتے ہیں تاکہ جو عام مسلمین و مومنین ہیں اُن کو یہ شکوہ نہ رہے کہ اُن پر ظلم ہوا یا اُن پر کوئی انہونی بات ہوئی، تاکہ اسی طرح سے اِس دنیا کے اندر بندگی کا، خدا کی غلامی کا مقصد جو ہے وہ پورا ہوجائے۔

چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے جو قربانی پیش کی تھی وہ انتہائی عظیم قربانی تھی اور اُس کی مثال ماضی و مستقبل میں نہیں ملتی۔ اِس میں بنی نوعِ انسان کو عبرت ہے، نصیحت ہے اور عملی ہدایت ہے کہ راہِ خدا سہل نہیں ہے، آسان نہیں ہے خدا کی خوشنودی، خدا کی دوستی، اگر کسی کو خدا کی دوستی کا دعویٰ ہے تو دوستی کی ساری توجّہ، دوستی کی ساری شرطیں، دوستی کی ساری صفات خدا سے متعلّق ہونی چاہئیں۔ جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ اِس قربانی کے ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی کئی کئی حکمتیں ہیں تو اِس کے ظاہر سے متعلّق ایک حکمت یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل خدا تھے یعنی خدا کے مخلص دوست تھے لیکن فطری طور پر اُن کو اپنے فرزند سے بے انتہا محبّت ہوگئی، جیسے ہر انسان کو اپنے فرزند سے محبّت ہوتی ہے، تو مثال کے طور پر قانونِ قدرت کو یا قانونِ دوستی کو یہ بات اچھی نہیں لگی کہ ابراہیمؑ خدا کے دوست ہوں اور پھر اپنے فرزند کو بھی چاہیں تو حضرت ابراہیمؑ کو خواب آیا یا نِدا ہوئی کہ عزیز ترین شیٔ کی قربانی کرو، اِس کے سوا اور کوئی تفصیلی حکم نہیں تھا، وہ جاگے، اُنہوں نے کئی

کئی دنبوں کی قربانی کی، دوسری رات بھی یہی خواب آیا پھر اُنہوں نے قربانی کے ان دنبوں میں اضافہ کیا یہاں تک کہ اُونٹوں کی قربانی کی، کرتے کرتے لیکن مسلسل یہی خواب اُن کو آتا رہا۔ آخرکار اُنہوں نے سوچا کہ عزیز ترین شئی کیا ہے؟ اپنے دل میں ڈھونڈا تو اُن کو محسوس ہوا کہ اسماعیلؑ سے بڑھ کر کوئی شئی اُن کو عزیز نہیں تھی۔

دیکھا آپ نے کہ جو خدا کے اولیاء ہوتے ہیں، جو انبیاء ہوتے ہیں، جو خدا کے مقرّب ہوتے ہیں وہ صرف ایک ہی اشارے سے خدا کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور ہم ہیں کہ کسی بھی بات کے لئے تفصیلی ہدایت ملتی ہے اور بار بار کی تاکید ہوتی ہے اور بار بار کے ارشادات ہوتے ہیں اور سال بہ سال فرمایا جاتا ہے لیکن پھر بھی ہم کسی کرنے والے کام کو جس کو کرنا چاہیئے، نہیں کرتے ہیں، یہ فرق ہے عام اور خاص میں۔ کاش! ہم سب مسلمین، مومنین، انبیاء کی سنّت کو سمجھتے اور اُس کی حکمت کو اخذ کر سکتے، اُس سے عبرت حاصل کرتے، نصیحت حاصل کرتے اور قربانی کے مقصد کو سمجھتے۔ قربانی کا مقصد جیسا کہ کہا گیا خدا کی خوشنودی تھی لیکن خدا کی خوشنودی زمان و مکان کے مطابق ہوتی ہے۔ دنیا میں جہاں غربت و افلاس ہے، دنیا میں جہاں اسلام کو خطرات درپیش ہیں، جہاں لاعلمی ہے، جہاں پسماندگی ہے، جہاں اسلام کو خوار و ذلیل سمجھا جاتا ہے اُس کے لئے سوچنا چاہیئے اور اسلام کو قوت دینا چاہیئے، مسلمین کو قوت دینا چاہیئے، مسلمین کے درمیان اتحاد کے لئے سوچنا چاہیئے۔ یہ خدا کی خوشنودی اِس معنی میں ہے گو کہ ابراہیمؑ کے زمانے میں یہ ایک خالص اور پاکیزہ حکم تھا لیکن دانشمند جانتے ہیں کہ ایسا خدا کا منشا یا ایسی خدا کی رضا ہر زمانے میں موجود ہوتی ہے۔ خدا کیا چاہتا ہے، وہ تو ظاہر بات ہے کہ خدا نیکی چاہتا ہے۔ خدا کیا چاہتا ہے، خدا دین کی ترقّی چاہتا ہے، اسلام کی حمایت چاہتا ہے۔ خدا کیا چاہتا ہے، اتفاق چاہتا ہے، راہِ راست کی ہدایت چاہتا ہے، ہمدردی چاہتا ہے، دین کی خیر خواہی چاہتا ہے۔ خدا کی رضا اگر بہت ہی مخفی شئی ہوتی تو مسلمان نیکی سے محروم رہ جاتے، ایسا نہیں ہے۔ جو قانونِ دین ہے، جو قانونِ ہدایت ہے، جو قانونِ نیکی ہے وہ ظاہر ہے۔ ہماری بدقسمتی ہو گی اگر ہم خدا کی خوشنودی کو نہیں سمجھتے ہیں، خدا کی خوشنودی کو سمجھنے کے لئے اُس مہربان نے دنیا کے اندر ہمیشہ کے لئے ہدایت کا ایک سرچشمہ قائم کر دیا ہے، جو لوگ اُس خدائی ہدایت سے وابستہ ہو جاتے ہیں تو اُن کے لئے مشکل نہیں ہے کہ خدا کیا چاہتا ہے۔ اِس زمانے میں کون سی قربانی کی ضرورت ہے، کس نوعیت کی قربانی چاہیئے، ہم میں سے ہر ایک سے اتنی بڑی قربانی خدا لینا نہیں چاہتا ہے اور نہ ہم اُس کے اہل ہیں، نہ ہم میں ایسی ہمّت ہے، خدا بڑا مہربان ہے۔ مسلمانوں سے، مومنوں سے کچھ ایسی قربانیاں چاہتا ہے کہ وہ قربانیاں ان کے لئے قابلِ برداشت بھی ہیں اور بآسانی یہ گزار بھی سکتے ہیں۔

یہی نا! جیسا کہ میں نے کہا اتفاق، اتّحاد اور دین کی خیر خواہی اور ہدایت کے رستے پر گامزن ہو جانا اور جو کچھ ہو سکے دوسروں کی دستگیری، دین کی تقویت، جہالت اور غربت کے خلاف جنگ جاری رکھنا، علم کا فروغ، کچھ مالی قربانی، کچھ جانی قربانی، جانی سے مراد یعنی جسمانی طاقت کو راہِ خدا میں صَرف کرنا، کچھ ذہنی قربانی تو یہی قربانیاں مطلوب ہیں۔ ایسی

قربانی مطلوب نہیں ہے جو ابراہیم خلیلؑ سے مطلوب تھی لیکن وہ بحدِ اولیٰ، بحدِ انتہا، ایک نمونہ تھا، ایک مثال تھی اُولوالعزمی کی مثال، عالی ہمّتی کی مثال تاکہ ہم چھوٹی چھوٹی قربانیوں کے پیش کرنے میں جھجھک محسوس نہ کریں اور اسلام میں ہدایت کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہدایت ماضی، حال، مستقبل، ہر وقت اور ہر زمانے میں موجود ہے، تو یہ ہے کہ خدا کی رضا کو، خدا کی خوشنودی کو سمجھ لینا ایک بہت بڑا فلسفہ ہے، ہر مومن کو چاہئے کہ وقت کے تقاضے کو سمجھے۔ چنانچہ حضرت محمدؐ مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے زمانے میں کس قسم کی قربانیوں کی ضرورت تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ اُس میں جہاد فی سبیل اللہ تھا، جانیں قربان کی جاتی تھیں اور اُس کے سوا کام نہیں بنتا تھا، اُس زمانے میں جو کارِ ثواب کا طریقہ تھا وہ اِس زمانے سے بالکل مختلف اور الگ تھا، یہ کہ جہاد کرنا، یہ کہ قیدیوں کو چھُڑانا، غلاموں کو آزاد کرنا، یتیموں کو کھانا کھلانا اور غریبوں کو لباس مہیّا کر دینا، اُس وقت علم وفن اور تعلیم وتربیت اور ایسی چیزیں نہیں تھیں۔ اگر یہ وقت جو آج ہمارے سامنے ہے رسول اللہؐ کے زمانے میں ہوتا تو لازمی بات ہے کہ رسولِ اکرمؐ قوم کے نونہالوں کو تعلیم دلاتے، علم وہنر سے اُن کو آراستہ کرتے، اسلام کو مضبوط کرنے اور دنیا بھر میں اسلام کو سربلند کرنے کے لئے کوشاں رہتے لیکن رسول اللہؐ کے زمانے میں ایسے ہنر کا نام ونشان نہیں تھا۔ لہٰذا بیت المال اسی طرح خرچ ہوتا تھا جیسا کہ میں نے بتایا، یتیموں کی پرورش، غلاموں کی آزادی، قیدیوں کو چھڑانا اور کھانا کھلانا، لباس مہیّا کرنا لیکن آج کا جو زمانہ ہے، یہ الگ ہے، تو دیکھئے کہ بدلتے ہوئے حالات کو اور زمان ومکان کے تقاضوں کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔ آج ہمارے بہت سے بھائی۔۔۔۔

اور وہ تیاری اِس (sense) میں ہے جیسا کہ ارشادِ قرآن ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ۔ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ (۲۹:۴۵) بے شک نماز ایسی ہے کہ وہ بے حیائیوں کو اور بدکاریوں کو، بُری باتوں کو روکنے کے لئے ہے اور اگر کوئی انسان رُک گیا تو وہ (society) کے لئے بہت مفید کام کر سکے گا، اگر کوئی شخص بے حیائی سے، بُرائی سے رُکتا ہے تو اِس میں (society) کے لئے فائدہ ہے اور اگر نماز کا یہ مقصد نہیں ہے تو وہ کام بھی غیر مفید ہے، تو بہر حال ہمیں تھوڑی سی گفتگو کرنی تھی اور زیادہ طوالت میں نہیں جانا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے آپ سب عزیزان یہاں جمع ہیں اور اُمید ہے کہ آپ کا یہ سلسلہ اِس طرح جاری رہے گا کہ ہر عید کے موقع پر یا اسلامی تہواروں میں اِس طرح سے آپ (gathering) کرتے رہیں گے تو ایک بات جو میں نے شروع میں کہی تھی اُسی کو دُہراتا ہوں وہ یہ کہ خدائے بزرگ و برتر نے ارشاد فرمایا ہے اپنی پیاری کتاب میں یعنی قرآنِ مقدّس میں کہ اُس نے بارہا چھوٹی چھوٹی جمعیتوں کو کامیابی عطا فرمائی ہے۔ میرا یقین ہے کہ اِس مثال میں آپ بھی آتے ہیں کہ آپ کی جمعیت بھی چھوٹی سی ہے پر کامیابی بہت بڑی ہے اور یہ خداوندِ عالمین کی رحمت کے سوا کسی کی طاقت نہیں ہے، جو کچھ ہے وہ خداوندِ عالم سے ہے۔ اس لئے مبارک ہیں آپ کہ آپ نے خلوص سے، نیک نیّتی سے اِس جمعیت کا آغاز کیا اور بڑی کامیابی کے ساتھ یہ جمعیت یہاں تک چلی آئی ہے۔

اِن شاء اللہ مستقبل میں بھی آپ کارہائے نمایاں انجام دیتے رہیں گے اور آخر میں آپ سب دُعا مانگیں پروردگارِ عالم کے حضور سے کہ وہ غفور و الرّحیم اپنی بے پناہ رحمت سے آپ کو دینی کامیابیوں سے نوازتا رہے، آپ کی سب مشکلات آسان ہوں، ساری بلائیں دُور ہوجائیں اور دین و دنیا کی کامیابی، سرفرازی نصیب ہو۔آمین یاربّ العالمین۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپ: سیما عظیم علی　　　نظرِ ثانی: اکبر علی　　　پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق) کا پُرحکمت بیان
عنوان: مومن کی قوتیں نور بن جاتی ہیں، قرآن علمی کائنات
کیسٹ نمبر: ۵۴ تاریخ: ستمبر/ ۱۹۸۱ کراچی

Click here for Audio

مومن کی کوئی بات، مومن کا کوئی قول، مومن کا کوئی عمل ضائع نہیں جاتا، یہ پروردگارِ عالم کا وعدہ ہے کہ خداوند نیکی کرنے والوں کی نیکی کو ضائع نہیں جانے دیتا، احسان کرنے والوں کے احسان کو ضائع نہیں ہونے دیتا، وہ مومنین کی سنتا ہے اور قبول فرماتا ہے، مومنین کی رُوحیں طاقت کا سرچشمہ ہیں۔ آج میں ایک اہم نکتہ بیان کروں گا اور وہ نکتہ ہے کہ مومن کی قوتیں کس طرح نور کی شکل اختیار کرتی ہیں، مومن کا رزق، مومن کی روزی، مومن کا قول، مومن کا عمل کس طرح نور بن جاتا ہے، یہ ضروری بات ہے اس کا جاننا بے حد ضروری ہے۔ اِس سلسلے میں سب سے پہلے بات یہاں سے شروع ہو جاتی ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السّلام وادیٔ ایمن سے گزر رہے تھے اُس وقت شام کا وقت تھا اُن کو اور اُن کے اہلِ خانہ کو آگ کی ضرورت پیش آئی، چنانچہ وہ باہر میدان میں نکلے، اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں تو دُور سے ایک روشنی نظر آئی۔ اُنہوں نے اپنے اہلِ خانہ سے فرمایا کہ ٹھہر جاؤ میں تمہارے لئے ایک آگ کی چنگاری لے آوں گا یا نہیں تو جہاں پر آگ ہو اُس کی خبر لے کے آوں، چنانچہ حضرت موسیٰؑ اُس روشنی کی طرف چلے، چلے اور جیسے ہی اُس روشنی کے قریب آئے تو روشنی جو درخت پر تھی ندا کی کہ: ”اِنِّیٓ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ“ (۳۰:۲۸) یقیناً میں دُنیا جہاں والوں کا پروردگار ہوں اور اللہ ہوں۔ پھر اُس نور نے فرمایا کہ اسے جو تم آگ سمجھ رہے ہو تو اِس آگ کے اندر جو بھی ہیں بڑے بابرکت ہیں اور اِس آگ کے گرد اگرد بھی جو ہیں وہ بھی برکت والے ہیں (۸:۲۷)۔

اب یہاں سے ایک ساتھ کئی سوالات اُبھرتے ہیں، ایک سوال تو یہ ہے کہ یہ روشنی ظاہر میں نظر آ رہی تھی یا باطن میں؟ تو صاف بات ہے کہ یہ روشنی جسم کی آنکھ سے دکھائی دینے والی نہیں تھی، یہ تو باطنی روشنی تھی۔ دوسرا سوال کہ اِس کے کیا معنیٰ جو فرمایا گیا کہ آگ کے اندر جو ہیں وہ بڑے بابرکت ہیں اور اِس کے گرداگرد جو ہیں وہ بھی بڑے بابرکت ہیں۔ کیا یہ منور یا لزم کی بات نہیں ہے؟ کیا اِس سے ایسا نہیں لگتا ہے کہ خدا کے نور کی نمائندگی کچھ رُوحیں کرتی ہیں یا یوں کہا جائے کہ وہاں پر جو نور تھا وہ نورِ ہدایت تھا، وہ نورِ امامت تھا، وہ نورِ نبوّت تھا لیکن اُس مقام پر بہت ساری عظیم رُوحوں کا مرکز ہوا کرتا ہے یعنی مولا کے نور میں اُس کے روحانی لشکر کی رُوحیں موجود ہوتی ہیں، اُن ہی رُوحوں کے جلنے سے روشنی پیدا

ہوتی ہے۔جتنی روحیں مولا سے واصل ہو چکی ہیں،مولا سے مل رہی ہیں وہ رُوحیں جلنے کی کیفیت میں ہیں،وہ جلنا کچھ عذاب تو نہیں ہے مگر عذابِ عشق ضرور ہے وہ عذاب بڑا پُرلذّت ہے۔کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جونور کا مقام ہے اُس کے بارے میں اچھی طرح سے سوچنا چاہیئے کہ وہ مقام کیسا ہے اور روشنی کی کیفیت کیسی ہے،وہ نورعملی نور ہے یعنی (action) میں ہے، فعل میں ہے کہ اُس کے اندر بہت ساری خوش نصیب رُوحیں جلتی رہتی ہیں جس سے کہ امام کا نور بن جاتا ہے۔اگر بات یہ نہ ہوتی تو خداوندِ عالم نے سورۂ نور میں جہاں اپنے نور کی مثال ایک روشن چراغ سے دی ہے (۳۵:۲۴) تو اُس میں وہ خداوند تیل کے جلنے اور اُس میں سے ایک شعلے کے بلند ہونے کی بات ہی نہ کرتے اور اگر یہ بات نہیں ہے تو آپ ہی بتائیں کہ کوئی رُوح جب امامؑ سے مل جاتی ہے،واصل ہو جاتی ہے،فنا ہو جاتی ہے تو اُس کی کیا کیفیت ہونی چاہیئے؟ کیا آپ کو یقین نہیں ہے جب آپ ذکر وعبادت میں گریہ وزاری میں پگھل جاتے ہیں تو اُس وقت آپ کی رُوح فنا نہیں ہوتی ہے،اگر آپ کہتے ہیں کہ اُس وقت یقیناً رُوح فنا ہو جاتی ہے تو میں پوچھوں گا کہ وہ کہاں فنا ہو جاتی ہے؟ کس میں فنا ہو جاتی ہے؟ اُس کا لگاؤ کس سے ہے؟ وہ کس سے واصل ہو جاتی ہے؟ تو کیا اُس جلنے سے دھواں نکلتا ہے یا روشنی۔آپ ضرور ایمان کی روشنی میں باور کریں گے کہ جب آپ کی خوب گریہ وزاری ہوتی ہے تو اُس وقت آپ کی رُوح فنا ہو جاتی ہے یعنی جل جاتی ہے،جیسے ہی جلتی رہتی ہے تو اُس وقت اُس کا ایک شعلہ بلند ہو جاتا ہے اُس میں سے (flaming) ہو جاتی ہے، اور اُس کے جلنے کے لئے بھی کوئی مرکز چاہیئے،وہ چیز تنہا نہیں جل سکتی ہے اور خاص کر رُوح،تو رُوح کے جلنے کا ایک مقام ہے ایک مرکز ہے،وہ مرکزِ نورِ الٰہی ہے،امامت کا نور ہی وہ نور کی بھٹّی کی حیثیّت سے ہے جہاں پر کہ سب رُوحیں جل جل کر روشنی بن جاتی ہیں،علم کی روشنی،معرفت کی روشنی،محبّت کی روشنی اور عشق کی روشنی بن جاتی ہیں۔

میری بات جو ہے قرآن کی آیت سے بالکل مربوط ہے،ابھی ابھی میں نے بات کی تھی کہ پہلی بار جب موسیٰ علیہ السّلام کو روشنی نظر آئی تو اُس وقت خداوندِ عالم نے فرمایا کہ جو بھی اِس آگ میں،جسے تو آگ سمجھ رہا ہے،جلتے ہیں وہ بڑے بابرکت ہیں اور اِس کے قریب جو ہیں اِس کے گرداگرد ہیں وہ بھی ایسے ہیں (۸:۲۷)۔تو میری بات اسی ربط میں ہے اور اسی کی میں تشریح کرتا ہوں اور آپ سوچیں کہ میری (logic) کیسی ہے،تو رُوحیں جلتی ہیں ایک مرکز پر اور وہ مرکز نورِ امامت کا ہے اور اُس میں رُوحیں کئی طرح سے جلتی ہیں۔ایک تو ذکر وعبادت کی محنت میں رُوحیں جلتی ہیں،محبّت میں اور گریہ وزاری میں جلتی ہیں،حسنِ عقیدت میں جلتی ہیں اور کئی طرح سے جلتی رہتی ہیں،تو جب روحیں اِس طرح سے جلتی ہیں تو اُن میں سے روشنی اور خوشبو کا پیدا ہونا لازمی بات ہے اور میری اِس گفتگو کا دوسرا اشارہ آیۂ نور (۳۵:۲۴) کی طرف تھا اور میں نے ایک بار آیۂ نور کا حوالہ بتایا تھا کہ اُس میں بھی یہی بات ہے،تو جو عقلِ فعّال ہے،جو عملی نور ہے وہ (action) میں ہے، وہ فعل میں ہے اور وہ بہت ساری رُوحوں کو اپنا لیتا ہے تا کہ اُن کو نور میں منتقل کرے۔اِس کی نظیریں،اِس کی

مثالیں اِس دُنیا کے اندر بھی ماڈی طور پر بہت زیادہ ہیں اور ماڈی طور پر ایک تو یہ ہے کہ آپ نے کبھی سوچا ہوگا، آپ نے میرے ایک مضمون کو پڑھا ہوگا جو اِس کائناتی روشنی سے متعلّق ہے یعنی سورج کے بارے میں ہے، میں نے اِس مسئلے سے بحث کی ہے کہ سورج کس طرح بنتا ہے؟ وہ اِس طرح بنتا ہے کہ اِس کائنات کے درمیان ایک مقام ہے ایک مرکز ہے اِس کو میں نے کائناتی بھٹّی کہا ہے تو وہ ایک ایسا خاص مقام ہے کہ جہاں پر ایتھر میں سے جو بھی ایندھن پڑتا ہے تو وہ جل کر سورج کی شکل اختیار کرتا ہے روشنی بن جاتا ہے اور یہ کام (automatic) ہوتا رہتا ہے یعنی سورج کی جو شمع روشن ہے، سورج کا جو چراغ جلتا رہتا ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیشہ اور مسلسل اُس میں ایتھر کا ایندھن پڑتا رہتا ہے اور وہ ایندھن سورج کے مقام پر جل جاتا ہے اور (blast) ہو جاتا ہے، پھر گیس کی شکل اختیار کرتا ہے اور سورج جو تقریباً نو کڑور میل کی مسافت سے اتنی چھوٹی سی چیز نظر آتی ہے اور حقیقت میں وہ روشنیوں کی ایک بہت بڑی دُنیا ہے اور اُس سے یہ جو کائنات ہے بہت ہی بڑی ہے تو لطیف جسم یا کہ ایتھر اُس میں پڑتا رہتا ہے اور ایک مخصوص دائرے کے اندر یہ روشنی بنتی جاتی ہے ۔ اِس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا کے اندر آگ ایک چیز ہے لیکن اُس کے لئے اُس کو جاری رکھنے کے لئے، اُس کو زندہ رکھنے کے لئے، اُس کو مسلسل حرکت میں رکھنے کے لئے مسلسل ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے، اِس کے بغیر آگ کا نام و نشان مٹ جاتا ہے ۔ بجلی ہو یا کوئی بتّی یا دیا یا چراغ یا آگ اُس کے لئے کسی سرچشمے کی ضرورت ہے کہ اُس میں سے ہمیشہ اُس میں ایندھن پڑتا رہے تا کہ اُس روشنی کا جو شعلہ ہے وہ بلند ہوتا رہے ۔ اسی طرح جو نورِ ہدایت ہے وہ ہمیشہ حرکت میں ہے، خدا اگر چاہتا تو اُس نور کو ایسا بھی بناتا کہ اُس کے لئے کسی ایندھن کی ضرورت نہ ہوتی لیکن ایسے میں کیا رحمت ہوتی! رحمت اسی میں ہے کہ ہر بار رُوحوں کا ایک لشکر اُس نور میں فنا ہو جائے اصل میں واصل ہو جائے اُن پر نورانیت کی کیفیت گزرتی جائے تا کہ بہت ساری رُوحوں کے لئے اِس میں رحمت، عزت، برتری اور ابدی نجات حاصل ہو ۔

میں یہاں رُک کر کچھ مزید مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں، امامِ عالی مقام نے بہت سے مواقع پر اسپیشل بندگی کرنے والوں کو اپنا لشکر قرار دیا ہے، گو کہ لشکر کے کئی معنی ہوتے ہیں اور ایک معنی اُس کے جہاد کے ہوتے ہیں، جنگ کے ہوتے ہیں ۔ کیونکہ دُنیا کے اندر اگر ایک طرف خیر ہے تو دوسری طرف شر ہے اور یہ خیر و شر کے درمیان ہمیشہ جنگ ہوتی رہتی ہے، اِس معنی میں بھی مومنین جو ہیں وہ خیر کے لشکر ہیں جو شر کے خلاف جہاد کرتے ہیں ۔ اِس کے علاوہ اِس لشکر کے یہ معنی بھی ہیں کہ یہ امامؑ کے کام میں اِن رُوحوں کی شرکت ہے ''یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ '' (۷:۴۷) اے اہلِ ایمان! اگر تم اللہ کی مدد کیا کرو گے تو اللہ بھی اِس کے جواب میں تمہاری مدد کرتا رہے گا اور تم کو راہِ دین پر ثابت قدم رکھے گا، تو اِس سے ظاہر ہے کہ بے شک اللہ کے اِس نور میں مدد ہوتی رہتی ہے ۔

اور دوسری مثال مدد کے سلسلے میں یہ ہے کہ ہم حدودِ دین کے قائل ہیں یعنی امام کا کام ہے وہ حدود سے چلتا ہے ۔ آپ

(source material) کو دیکھیں یعنی (Fatimid period) کی بنیادی کتابوں کو دیکھیں تو اُس میں آپ کو یہ بات ملے گی کہ امامؑ کے بارہ بلکہ چوبیس بلکہ اٹھائیس حجّت ہوتے ہیں اور ہر حجّت کے تحت تیس داعی ہوا کرتے ہیں اور ہر داعی کے تحت ماذون ہوتے ہیں پھر مستجیب ہوتے ہیں تو اسی طرح تمام حدودِ دین اور مومنین کی ایک زنجیر جیسی بنتی ہے اور پھر یہ زنجیر جو ہے امامؑ سے وابستہ ہو جاتی ہے، اِس لئے ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ:

بُوَد زنجیر باز نجیر پیوند　　　　سرِ زنجیر در دستِ خداوند

زنجیر کی ایک کڑی دوسری کڑی سے ملی ہوئی ہوتی ہے اور اسی طرح زنجیر بنتی ہے اور زنجیر بن چکنے کے بعد زنجیر کا ایک سرا جو ہوتا ہے وہ مالک کے ہاتھ میں ہوتا ہے، تو دین جو ہے وہ عملی طور پر اپنی قوتوں کے لحاظ سے امامؑ سے وابستہ ہے، تو امام کا یہ فرمانا کہ عبادت کرو، بندگی کرو، نیکی کرو اور رزق کے لئے تاکید فرمانا یہ کوئی فضول بات نہیں ہے، اِس سے امام کا نور بنتا ہے۔ مومن کے جو نیک افکار ہیں، جو نیک کوششیں ہیں، جو نیکی کی طرف سے (energies) ہیں وہ سب نور میں منتقل ہو جاتی ہیں، یہاں تک کہ مومن جو کچھ حلال کا رزق کھاتا ہے وہ بھی نور بنتا ہے۔ وہ اِس طرح کہ مومن جو کچھ نیکی کی طرف سے کرتا ہے وہ سب نیکی ہے، عبادت ہے، اور عبادت نور ہے، نہیں تو وہ اُس سے علم پیدا ہوتا ہے علم نور ہے، نہیں تو اُس سے خدمت ہوتی ہے خدمت نور ہے، نہیں تو اُس سے شناخت بنتی ہے شناخت نور ہے، اسی طرح مومن کا مال جتنا وہ نیکی میں صَرف ہوتا ہے اُس سے نور بنتا ہے، ہدایت نور ہے، علم نور ہے، معرفت نور ہے، ذکر نور ہے، ایمان نور ہے، حقیقی محبّت نور ہے، عشق نور ہے، تو یہ نور کی مختلف کرنیں ہیں یا کہ نور کی مختلف شکلیں ہیں، تو مومن کی تمام (energies)، مومن کی تمام قوتیں مومن کی تمام صلاحیتیں نور میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ اِس کائنات کے اندر دو چیزیں ہیں اور تیسری کوئی چیز ہے نہیں، ایک ہے ظلمت، ایک ہے نور، تو مومن ظلمت کی طرف نہیں ہے وہ تو نور کی طرف ہے اور دوسرے لفظوں میں اِس کائنات کے اندر یا تو ہے گمراہی یا ہے ہدایت تو مومن گمراہی کی طرف نہیں ہے ہدایت کی طرف ہے، ہدایت نور کا دوسرا نام ہے اور تیسرے لفظوں میں اِس دُنیا کے اندر یا تو ہے جہالت یا تو ہے علم، علم نور کا ایک اور نام ہے اور مومن جہالت کی طرف نہیں ہے علم کی طرف ہے، لہٰذا مومن سراپا نور بن جاتا ہے۔ ہم فنا کو مانتے ہیں، وہ فنا جو صوفیانہ اصطلاح کے طور پر ہے، فنا ہلاکت کے (sense) میں نہیں، فنا سلجھی ہوئی فنا یعنی نور بن جانا۔ جب ہم فنا کو مانتے ہیں تو مومن نور کی طرف جا رہا ہے اور نور بن جاتا ہے۔

اِس لئے جس مثال سے بھی بات کریں ہر طور سے یہی حقیقت نکھر نکھر کر سامنے آئے گی کہ مومن امامؑ کے نور سے واصل ہوتے ہوئے، فنا ہوتے ہوئے، پگھلتے ہوئے، جلتے ہوئے نور میں تبدیل ہو جاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ قرآنِ مقدّس کے اندر جہاں جہاں نور کا ذکر آیا ہے اور جہاں سے جہاں تک نور کے موضوع کا پھیلاؤ ہے اُس میں دیکھا جائے تو یوں پتا لگتا ہے کہ کبھی یہ نور خدا سے منسوب ہے، کبھی یہ نور رسولؐ سے منسوب ہے، یہ بھی صحیح وہ بھی صحیح، کبھی یہ نور امامؑ سے منسوب

ہے درست، کبھی یہی نورِ مومن سے منسوب ہے صحیح ۔کیونکہ اِس نور کے اتنے پہلو ہیں کہ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ نورِ ازل ہے نورِ ابد ہے تو دائمی نور ہے جو ہمیشہ سے ہے جو ہمیشہ کے لئے ہے، دوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو یہ پیغمبرؐ کا نور ہے، تیسرے پہلو سے دیکھا جائے تو یہ امامؑ کا نور ہے، چوتھے پہلو سے دیکھا جائے تو یہ وہی نور ہے جو مومنین کی رُوحوں کے جلنے سے، اُن کے فنا ہو جانے سے بنتا ہے ۔آپ کو اِس میں کیا تعجّب ہو سکتا ہے کہ جو اُونچی حقیقتیں ہیں اُن کے اتنے سارے پہلو ہوا کرتے ہیں، اُن کے بہت سے پہلو ہیں ۔آپ نے کسی نگینے کو، ڈائمنڈ کو دیکھا ہوگا، جو تراشا ہوا ہوتا ہے اُس کے رُخ ہوتے ہیں اُس کے (faces) ہوتے ہیں، پہلو ہوتے ہیں، آپ چاہیں کسی ایک پہلو کو سورج کے سامنے رکھیں تو اُس میں سے سورج کی چمک دمک نظر آنے لگے گی، پھر آپ دوسرے پہلو کو سامنے کریں پھر تیسرے پہلو کو سامنے کریں آپ کی مرضی ہے، جونسا پہلو سامنے رکھنا چاہیں رکھ سکتے ہیں بات وہی ہے، رنگ وہی ہے، روشنی وہی ہے، نکھار وہی ہے اور جھلک وہی ہے، جلوہ وہی ہے، حسن و جمال وہی ہے اسی کو کہتے ہیں مونوریالزم ۔اسی حقیقت کی مختلف تشریحیں ہوتی ہیں لیکن جس کے پاس علم کا کوئی ظرف نہیں ہے، ظرف (means)، (pot) برتن تو وہ حیران ہو جاتا ہے، کہتا ہے کہ یہ عجیب بات ہے کبھی یہ بات ہوتی ہے، کبھی وہ بات بتائی جاتی ہے حالانکہ یہ بات بھی اور وہ بات بھی آپس میں ملی ہوئی ہے۔

دیکھیں کہ درخت کو آپ نے سوچا ہوگا، درخت کو آپ نے پڑھا ہوگا کتاب کی طرح، ہم نے بار ہا درخت کو پڑھا، آپ کے سامنے پڑھ کر سنایا کہ دیکھیں درخت ایک شئ ہے ایک بہت عجیب چیز ہے، اُس کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں، تنے کو دیکھا، ہاں! تو تنے میں سب شاخیں ایک ہیں اور تنے سے نیچے دیکھیں! زمین کے نیچے پھر جڑیں پھیلی ہوئی ہیں، سطحِ زمین سے نیچے نگاہ دوڑایئے (guess) کریں، کسی درخت کو اُکھڑتے ہوئے دیکھا ہوگا، گاڑتے ہوئے دیکھا ہوگا کہ اُس کی شاخیں سطحِ زمین کے نیچے اِدھر اُدھر پھیلی ہوئی ہوتی ہیں جس طرح شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں اِس طرح درخت کی جڑیں زمین کے نیچے پھیلی ہوئی ہوتی ہیں، مگر تنا کو دیکھئے! تنا میں سب چیز یکجا ہے تو حکمت اسی میں ہے کہ کوئی چیز جو ہے کہیں تو پھیل جائے اور کہیں اُس کا ایک مرکز ہو ۔اب اگر اِس (principle) سے ساری کائنات میں جا کہ دیکھیں تو ہر بڑی چیز اسی شکل میں آپ کو ملے گی ۔دیکھیں ثبوت کے طور پر پانی کو دیکھیں! پانی بھی درخت کی طرح ہے، پانی کی شاخیں بادلوں میں، ہواؤں میں، فضاؤں میں اور ندّیوں میں، دریاؤں میں، نہروں میں اور زمین کے مختلف حصّوں میں، اب ہم پانی کو درخت کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں تو یہ پانی کی شاخیں ہیں، پانی کے نام سے جو درخت ہے یا پانی جو درخت جیسی چیز ہے اُس کی شاخیں ہیں ۔اب جڑوں کو دیکھنا ہے تو دیکھیں کہ دُنیا کے اندر کتنے جھیل ہیں، کتنے دریا اور تنا کو دیکھنا ہے تو دیکھیں کہ دریائے محیط جو ہے پانی کا جو مرکز ہے وہ تنے کی طرح ہے، تو اسی سے پانی کا جو کام مقصود ہے جو مطلوب ہے وہ بنتا ہے ۔آدمی کو دیکھیں! آدمی کے ہاتھ پاؤں ہیں، انگلیاں ہیں، اعضاء ہیں، جوارح ہیں اور حصّے ہیں، ٹکڑے ہیں لیکن اِس کی

ایک مرکزیت بھی ہے۔آپ کوئی مضمون بناتے ہیں اُس مضمون میں بھی یہی بات ہے کہ اُس کی ایک تو مرکزیت ہے اور ایک اُس کے حصّے ہیں، اُس کے شاخیں ہیں، اُس کی جڑیں ہیں۔کیا کہنا مقصود تھا، مقصود یہ تھا کہ نور کا ایک تو مرکز ہے اور ایک اُس کے پہلو ہیں، مختلف مختلف پہلو، اسی طرح حقیقتیں ہیں جو دیکھنے میں بکھری ہوئی نظر آتی ہیں، الگ، الگ، الگ، الگ لیکن بخدا اُن تمام حقیقتوں کا ایک مرکز ہے، ایک وحدت ہے، ایک (unity) ہے، ان تمام حقیقتوں کی (unity) کو صوفی لوگ کیا کہتے ہیں؟ ''حقیقت الحقائق'' کہتے ہیں، کیا؟ آسان لفظوں میں حقیقتوں کی حقیقت تو یہ مرکز ہے اِن تمام حقیقتوں کا۔لہٰذا جو نور ہے اُس سے بہت سی حقیقتیں وابستہ ہیں، اُس میں بہت ساری حقیقتوں کی یکجائی ہے، یہ اسمٰعیلی مذہب کا تصوّر ہے، یہ اسمٰعیلی مذہب کی حقیقتیں ہیں، یہ وہ رستہ ہے جس کو امامؑ نے بتایا ہے، یہ وہ ہدایت ہے جو امامؑ نے دکھائی ہے، یہ وہ روشنی ہے جو امامؑ کی طرف سے اسمٰعیلی مذہب میں ہمیشہ سے موجود ہے، جو بھی اِس کو لے اسماعیلیوں میں سے وہ امام ؑ کے حکم سے، امامؑ کی خوشنودی سے اِس روشنی کو اپنے سینے کے اندر بھر سکتا ہے تا کہ وہ بحدِّ قوت اور بحدِّ فعل نور بن جائے۔

عزیزانِ من! کتنی ہی اچھی بات ہے جو بتائی گئی کہ مومن کی ہر صلاحیت، ہر قوت نور کی شکل اختیار کرتی ہے تو درمیان میں ایک عام اور معمولی مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔مولائے رومؒ کی تعلیمات میں یہ بات آئی ہے کہ چند صوفی مل کر مذہبی زندگی بسر کیا کرتے تھے، وہ مل کر ذکر کرتے تھے، وہ مل کر محفل منعقد کرتے تھے، اُن میں سے ایک بظاہر سُست نظر آتا تھا اور باقی چُست تھے کہ جب ذکر کے لئے بیٹھتے، گریہ وزاری شروع کرتے تو باقی جو تھے وہ بہت (fast) جاتے تھے لیکن ایک تھا جو بظاہر بڑا سُست تھا اور دیکھنے سے اُس کا سر بعض دفعہ لٹک جاتا تھا تو لوگ سوچتے تھے کہ یہ تو سو گیا اور جب کھانے پر بیٹھتے تو وہ زیادہ کھاتا تھا، کرتے کرتے اُن میں سے کچھ اُس شخص سے تنگ آئے تھے لیکن زبان نہیں ہلا سکتے تھے ادب کا جو تقاضا تھا اُس کے بموجب وہ کچھ نہیں بول سکتے تھے لیکن آخرکار ایک شخص تھا کسی قدر گستاخ (type) کا تھا اُس سے نہ رہا گیا تو ایک دن کھانا کھاتے ہوئے یا اُس کے بعد اپنے اُس ساتھی سے کہا: یار! آپ جب کھانے پر بیٹھتے ہیں تو غضب کرتے ہیں اور جب ذکر پر بیٹھتے ہیں تو سو جاتے ہیں تو یہ کیا بات ہے تو اتنے میں وہ صوفی رنجیدہ خاطر ہوا اور کہا کہ یار! تم کو اچھا نہیں لگتا ہے میری حرکت اور میرا کھانا، میرا پینا، میرا رہنا تو گویا میں آپ پر ایک بوجھ ہوں، (burden) ہوں، تو بڑی ناراضگی کے ساتھ اُس نے کہا کہ چلو لاؤ ایک لگن، تھالی لے آؤ ابھی میں جو کچھ کھا چکا ہوں اُس کو لوٹا دیتا ہوں تو ایک لگن لایا گیا معلوم نہیں کس لئے اِس قدر جلدی سے اِس پر عمل ہوا تو پھر اُس نے حلق میں اُنگلی داخل کی اور پھر (vomiting) شروع کی، جیسے ہی (vomiting) شروع کی تو خدا کا کرنا کیا ہوا کہ جو لگن تھا وہ جواہرات سے بھر گیا یعنی اُس نے جو کچھ کھایا تھا، اُس نے جو کچھ پیا تھا وہ سب موتی، مونگے اور ڈائمنڈ، رُوبی، زمرّد اور ایسے گرانقدر جواہرات کی شکل میں بدل گیا تھا، اُن سب کو اِس بات سے بڑا تعجّب ہوا، اُنہوں نے کہا کہ تعجّب کی کیا بات

ہے اِس میں خدا کی قدرت ہے کہ مومن کا باطن ایسا ہی ہونا چاہئے کہ دُنیا کے اندر دو قسم کے بِڈر/بھڑ ہوتے ہیں، شہد کی مکھّی جو ہے وہ بھی بھڑ ہے کیونکہ اُس کا بھی ڈنک ہے، فارسی میں اُس کو بھی ایک طرح سے بھڑ کہا جاتا ہے اُس کو زنبورِ عسل کہتے ہیں، زنبور (persian) میں بھڑ کو کہتے ہیں (whasp) کو کہتے ہیں اور جو دوسرا ہے اُس کو بھی زنبور کہتے ہیں، اُردو کے رواج کے مطابق اِس کو تو شہد کی مکھّی کہا جاتا ہے اور دوسرے کو بِڈر/بھڑ کہا جاتا ہے، لیکن (persian) کے اندر دونوں کو بِڈر/بھڑ کہا جاتا ہے کیونکہ دونوں کے اندر ڈنک ہے۔

مولائے رومؒ نے اپنی مشہور مثنوی کے ایک مقام پر اِن دونوں بِڈوں/بھڑوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ دیکھ دونوں بِڈوں/بھڑوں کو دیکھ، ایک جو کچھ کھاتا ہے اُس کا شہد بن جاتا ہے اور دوسرا جو بِڈر/بھڑ کھائے گا اُس سے فقط ڈنک کو قوت ملے گی زہر بن جائے گا۔ پھر ایک اور مثال پیش کرتا ہے کہ ایک ہرن ہے جو اسپیشل ہے اُس کی ناف میں سے کستوری بنتی ہے، کہتا ہے کہ آہو یعنی ہرن دو قسم کے ہوتے ہیں ایک ہرن وہ ہے کہ جس کا کھایا ہوا کستوری بنے، مُشک بنے اور دوسرا ہرن وہ ہے جس کا کھایا ہوا بول و براز بنے، تو اِدھر اِس زنبورِ عسل یعنی شہد کی مکھّی کو دیکھیں اور دوسرے بِڈر/بھڑ کو دیکھیں اور اِن دو قسم کی ہرنوں کو دیکھیں اور پھر اِدھر آ کر اِس صوفی کو دیکھیں کہ اِس کا کھایا ہوا جو ہے وہ جواہرات بن گیا۔ اب ہم اِن مثالوں کو لینے کے بعد واپس آتے ہیں اپنے موضوع کی طرف اور ہمارا موضوع ہے کہ مومن کی قوتیں نور کی شکل اختیار کرتی ہیں اور جس کی ایک بار تشریح ہوئی تھی کہ نورِ ایمان، نورِ معرفت، نورِ عشق، نورِ خدمت، نورِ علم اور نورِ اخلاص، نورِ یقین تو مومن سے جو کچھ بنتا ہے وہ سب نیکی ہے اور نیکی روشنی ہے، یہ سب مثالیں ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ مومن خود کو کمزور سمجھتا ہے اور رہاں! کمزور تو سمجھنا چاہئے یہی تو ایک اصل چیز ہے، مومن خود کو کمزور نہ سمجھے، آنسو نہ بہائے، پشیمان نہ ہو جائے، ندامت نہ اُٹھائے تو پھر ابلیس بن جائے، ہونا تو یہی ہے۔ اب دوسرا سوال کہ مومن ایسی کوئی روشنی نہیں دیکھتا ہے تو نہیں دیکھنا چاہئے اور اگر اب سے وہ روشنی کو بھی دیکھے تو شاید مغرور بن جائے اور پھر وہ بھول جائے آنسو بہانا، رونا، ندامت اُٹھانا، کوشش کرنا، خود کو کمزور اور آہیں بھرنا، یہ سب جو ہے داخل ایمان ہیں، یہ نہ ہو تو پھر۔ اسی لئے قرآن نے خداوندِ عالم کی زبان سے فرمایا ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بہت ساری مخلوقات پر فضیلت دی ہے اور ہم نے اُس کو خشکی پر بھی اور سمندر پر بھی اُٹھائے اُٹھائے رکھا ہے (۱۷:۷۰)۔ تو مطلب یہ ہے کہ مومن کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ بہت ہی عظیم ہے اور یہ سب ایمان کی تعریف ہے، ایمان کی رحمتوں کی تعریف ہے، مذہب کی تعریف ہے اور علم روشنی ہے، روشنی کے پھیل جانے سے چیزیں نظر آتی ہیں جو روشنی ہو، تو تاریکی میں کچھ نظر نہیں آتا ہے، تو یہ دین کی روشنی ہے جس کے پھیلانے سے آپ کو بہت سی حقیقتیں اور بہت سی اعلیٰ چیزیں نظر آئیں گی اور اِس سے اُمید وابستہ ہو جائے گی، اِس سے یقین آئے گا، اِس سے اور حرکت کرنے کے لئے جذبہ ملے گا اور حوصلہ ملے گا، یہ ہے کہ خداوندِ عالم نے فرمایا کہ جو آگ میں

ہیں یعنی جو نور میں ہیں اُن کو بہت برکت دی گئی ہے (۸:۲۷) اور اِس سے آپ کو یقین ہوا کہ مومن کی رُوح امامؑ کے نور سے وابستہ ہے اِس لئے اگر دُنیا میں ہم کو کوئی تکلیف آتی ہے یا کوئی دُکھ آتا ہے تو اُس میں ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے، کیا معلوم اِس دُکھ کے پس منظر میں کیا کیا رحمتیں رکھی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دین میں مایوسی ممنوع ہے یعنی مایوسی اُس وقت رُخ دکھاتی جب کوئی نامُرادی ہوتی ہے، ناکامی ہوتی ہے، دُکھ آتا ہے، تکلیف ہوتی ہے اور کسی بھی کام میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوتی ہے، مصیبت آتی ہے، موت آتی ہے، بیماری آتی ہے، دشمن ستاتا ہے اور ایسی بہت سی تکالیف سامنے آتی ہیں تو ایسی کسی بھی حالت میں مایوس نہیں ہونے کا اور مایوسی ممنوع ہے۔ کیونکہ یہ فرق ہے کہ کافر اور منافق پر دُکھ آتا ہے اور مومن پر دُکھ آتا ہے اِس میں آسمان زمین کا فرق ہے، جو کافر پر دُکھ آتا ہے تو وہ عذاب کے طور پر آتا ہے لیکن جہاں تکلیف مومن کو آتی ہے وہ عذاب نہیں ہے وہ رحمت ہے، تو اِس لئے قرآن کے اندر ایک اور پُرحکمت تصوّر دیا گیا ہے اُس کو فرمایا ہے: ''اِحۡدَى الۡحُسۡنَيَيۡنِ'' (۵۲:۹)۔ دو نیکیوں میں سے ایک۔ مومن اگر دُنیا کے اندر راحت میں ہے تو شکر کرنا چاہئے، مومن اگر تکلیف میں ہے تو شکر کرنا چاہئے کیونکہ اِس کے دونوں طرف رحمت ہے، اِس کے برعکس اگر منافق کو دُنیا کے اندر راحت ہے تو اُس کا رُخ عذاب کی طرف ہے اور اگر عذاب ہے تو بھی عذاب ہے۔ بہرحال ہوشمند مومن وہی ہے جس کو یقین ہو کہ اُس کو عبث اور فضول پیدا نہیں کیا گیا اور جس کو مولا کے در کا رستہ معلوم ہے، جس کو امامؑ کی غلامی کی سعادت نصیب ہوئی ہے، جو ایک مومن کے گھر میں پیدا ہوا ہے، جس کو امام کے لئے اقرار ہے، امام کی شناخت ہے، جس کو یقین ہے کہ وہ امام کا مُرید ہے تو اُس کی سعادتوں کا کیا کہنا۔ بڑی خوش نصیبی ہے کہ مومن، مومن ہے، اُس کو بصیرت ملی ہے، روشنی ملی ہے، امام کے مقدّس دامن تک اُس کا ہاتھ پہنچا ہوا ہے تو اِس سے بڑھ کر کوئی سعادت نہیں اور اِن ہی باتوں کے ساتھ میں اپنی تقریر کو یا گفتگو کو انجام دیتا ہوں اور اگر اِس سلسلے میں کوئی سوال ذہن میں اُبھرا ہو تو بے شک بڑی خوشی کے ساتھ آپ آرام سے پوچھ سکتے ہیں، اِن شاء اللہ ہم آپ کے سوال میں مدد کرنے کے لئے کوشش کریں گے۔ شکریہ، یا علی مدد!

ہمارے عزیز نے پوچھا میری گفتگو کے ریفرینس سے جو میں نے کہا تھا کہ مومن اپنی حلال کی کمائی سے جو مال کو خرچ کرتا ہے دین کے سلسلے میں نیکی کے سلسلے میں، وہ نور بن جاتا ہے۔ اُس کا ثبوت یہ ہے کہ مومن اپنے مال کو دینی مقاصد کے لئے خرچ کرتا ہے تو دینی مقاصد جتنے بھی ہیں اُن میں خرچ کرنے سے وہ مال جو ہے وہ نور کی شکل اختیار کرتا ہے، مثال کے طور پر دین کو قوت دینا، دین کے کام کو آگے بڑھانا، علم کی روشنی مہیّا کرنا اور جماعت کو سُکھ پہنچانا، تو یہ چیز آخر میں جا کر نور بن جاتی ہے اور اگر مثال کے طور پر مومن جتنا کہ کھانا چاہئے اپنے مال میں سے کھاتا ہے اور خدا کا جو حق ہے اُس نے ادا کیا ہوا ہے تو پھر یہ اِس کا کھانا جو ہے اِس سے بھی نور بنتا ہے۔ جیسے ایک بہت کم اور کمتر مثال کو پیش کریں یہ کہ مومن سوتا ہے اور امامؑ نے فرمایا ہے کہ مومن نے جو فرائض ہیں اُن کو انجام دیا ہے وہ جب جاگنا چاہے جاگتا ہے اور جو

کچھ کرنا چاہئے کرتا ہے تو اُس صورت میں اِس کی نیند بھی عبادت ہے۔عبادت اِس (sense) میں ہے کہ یہ تو اِس کی ایک عبادت کی، نیکی کی، ایمان کی ایک تیاری ہے، لہٰذا جہاں مومن کی نیند عبادت ہے تو پھر نیند بھی روشنی ہے نیند بھی نور ہے، کیونکہ مومن کی ہر چیز ایک اعلیٰ مقصد کے تحت ہے اور اگر مومن کے نزدیک بہت سے مقاصد ہیں اور یہ ایک دوسرے کے اُوپر نیچے ہیں اور اِن کے اُوپر ایک عظیم مقصد ہے جس کو مقصدِ اعلیٰ کہا جاتا ہے تو وہ مقصدِ اعلیٰ اِن ذیلی مقاصد کے اُوپر ہے، ایک ٹاور کی طرح تو پھر اِن مقاصد میں ایک نے دوسرے کو اور دوسرے نے تیسرے کو اُٹھائے ہوئے ہے اور اِن کے اُوپر ایک مقصد ہے تو پھر نیند کیسے روشنی نہ ہو، کھانا کیسے روشنی نہ ہو اور دین کے مقصد میں مال کو خرچ کرنا جو بات ہے وہ تو الگ ہے، علم کے لئے مال کو خرچ کرنا جو ہے وہ بات الگ ہے، لہٰذا اِس سے معلوم ہوا کہ مومن کی ہر چیز ہر چیز روشنی ہے۔قرآن میں آپ کو اِس قسم کی آیات ملیں گی، تو جو آپ چاہیں تو میں ایسی ایک دو آیات کبھی فرصت میں کھول کے بھی بتا سکتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ابھی میں نے (on the whole) یہ بتایا نا کہ دُنیا کے اندر دو چیزیں ہیں، ایک روشنی ہے، ایک تاریکی ہے تو لوگ بھی دو حصّوں میں ہیں کافر اور منافق ہیں اور مومن ہے، مومن روشنی کی طرف ہے، کافر اور منافق جو ہے وہ ظلمت کی طرف ۔

مضامین جو ہیں یا الفاظ جو ہیں آگے چل کر بڑے بڑے (topic) میں دو دو میں بٹ جاتے ہیں ۔ابھی میں نے اِس کی ایک مثال پیش کی تھی یا ایک طرف ایمان ہے اور پھر دوسری طرف کفر ہے یا ایک طرف دین ہے اور پھر دوسری طرف لادینیت ہے یا یہ کہ ایک طرف روشنی ہے اور دوسری طرف ظلمت ہے، یہ کہ ایک طرف علم ہے اور دوسری طرف جہالت ہے، یہ کہ ایک طرف ثواب ہے اور دوسری طرف عذاب ہے یا یہ کہ ایک طرف خدا کی خوشنودی ہے، رضا ہے اور دوسری طرف خدا کی ناراضگی ہے ۔ اِن تمام مثالوں میں مومن جو ہے وہ نیکی کی طرف ہے (positive) (position) میں ہے، (negative) میں نہیں، لہٰذا مومن کا مال جو ہے وہ نور بن جاتا ہے، جس طرح کافر کا مال، منافق کا مال جو ہے نار بن جاتا ہے، آتش دوزخ خدا کی ناخوشنودی بن جاتی ہے، اسی طرح اِس کے برعکس مومن کی ہر چیز خدا کی خوشنودی بن جاتی ہے، روشنی بن جاتی ہے، یہ ہے اور بہت اچھی مثال ہے اور بہت اچھا موضوع ہے ۔ جی ہاں! اور ۔

جی ہاں! جواہرات ہیں اور پھول ہیں، پھل ہیں، خزانے ہیں، دولت ہے، روشنی ہے کیا نہیں ہے؟ بہت کچھ ہے لیکن افسوس کہ ہماری نگاہیں کس قدر محدود ہیں، ہمارا دامن کس قدر کوتاہ ہے کہ ہم اِس دولت کو سمیٹ نہیں سکتے، ہمارا دل کتنا چھوٹا ہے، ہم کس قدر کم ہمّت ہیں کم ظرف ہیں، بس بیٹھے ہیں کہ زندگی کے مقصد کو نہیں سوچتے ہیں اور زندگی کا یہ مرحلہ آیا عمر کی یہ حد ہوئی ہم نے اِس دولت کی طرف توجّہ نہیں دی، حالانکہ کتنے موتی ہیں، کتنے خزانے ہیں، کتنی دولت ہے، اب تک اگر صحیح معنوں میں ہم نے کچھ کیا ہوتا تو بہت ساری دولت، بہت ساری دولت اکٹھی کی جاسکتی ہے پھر اُس کو ہم دے بھی سکتے

اُن کو جن کو کہ دینا چاہئے لیکن

گنجِ نہانی طلب از دل واز جانِ خویش　　　　تا نہ شوی بے نوا بر درِ دکانِ خویش

مولائے رومؒ کہتے ہیں کہ چھپا ہوا خزانہ اپنے دل سے لے لو، اپنی جان سے لے لو یہیں پر ہے چھپا ہوا خزانہ، اور کہیں نہیں ہے، اپنے باطن سے لے لو، اپنے دل سے لے لو، اپنی رُوح سے لے لو تا کہ تو اُس شخص کی طرح نہ ہو کہ جس کی ایک دکان ہے اور دکان میں بہت کچھ ہے لیکن چابی اُس نے گُمائی ہے اب اُس کو ملنے کی نہیں ہے تو پھر کیا کرتا ہے، اِدھر وہ اپنی دکان کو دیکھتا ہے پھر بھیک مانگنے کے لئے اُسی دکان کے سامنے بیٹھا ہے، ہاتھ پھیلاتا ہے، دامن پھیلاتا ہے، جھولی آگے کرتا ہے، کشکول کو آگے کرتا ہے، اپنی دکان کے دروازے کے سامنے بھیک مانگتا ہے، لوگوں کو پتا نہیں ہے، نہیں تو اُس کو بھیک بھی نہ دیں، حالانکہ دکان ہے اُس میں مال بھرا ہوا ہے دولت بہت کچھ ہے، بدقسمتی سے اُس نے چابی گُما دی ہے، ابھی وہ تالا کیسے کھولے وہ تو کھلنے کا نہیں ہے، چابی کے بغیر۔ پھر کیا کرتا ہے چونکہ ایک نگاہ اُس کی دکان کی طرف ہی ہے تو پھر اُسی دکان کے سامنے بیٹھا ہے، لوگ نہیں سمجھتے ہیں کہ اِس کی دکان ہے، خیر جھولی میں پیسہ ٹکا ڈالتے جاتے ہیں۔ یہ بات ہے کہ چھپا ہوا خزانہ یعنی وہ خزانہ جس کی دولت خدا ہے، وہ خزانہ جس کے موتی خدا ہے، جس کے جواہرات خدا ہے، وہ خزانہ مومن کی اپنی جان کے اندر، اپنے باطن کے اندر، اپنی رُوح کے اندر ہے، یہ ہے تو اِس سے مومن کی زندگی کی اہمیّت بڑھ جاتی ہے، نہیں تو انسان جو ہے وہ بھول جانے والا ہے، آپ جانتے ہیں کہ انسان بار بار بھول جانے والا ہے، بار بار بھول جانے والا ہے، تاکید کے باوجود اور یہی سبب ہے کہ قرآن کے نام سے اللہ تعالیٰ نے آسمانی ہدایت نامہ بھیجا، وہ کتنا عظیم ہے اور کتنا بڑا ہے اور کس قدر نصیحتوں سے ہدایتوں سے پُر ہے اور پھر قرآن کو روز پڑھنے کے لئے فرمایا گیا، اِس لئے کہ انسان بھول جانے والا ہے، اِس لئے اُس کو بار بار پڑھنا چاہئے، سننا چاہئے تا کہ وہ یاد کرے، فراموش نہ کرے، بھول نہ جائے۔ یہ کیوں ایسا ہے کہ انسان ایک بار سمجھتا ہے ارادہ بھی کرتا ہے پھر بھی بھول جاتا ہے اور اپنے ارادے میں ناکام ہو جاتا ہے یہ کیا راز ہے؟ بس انسان کی فطرت ہی ایسی ہے، روز ہمارا جو اِرادہ وہ بھی ایک رُوح کی شکل میں ہے تو یہ رُوح بدلتی جاتی ہے اور پھر کوئی اور چیز آجاتی ہے، تو پانی کی سطح پر آپ نے کبھی لکھنے کے لئے کوشش کی، کیا کوئی تحریر بنتی ہے؟ نہیں بنتی ہے تو انسان کے باطن کے اندر جو اِرادہ ہے جو دوسری چیزیں ہیں اُن کا بھی یہ حال ہے، لہٰذا جہدِ مسلسل کے سوا کوئی کامیابی نہیں۔ ہر روز علم کو سنیں، ہر روز نصیحت کو سنیں، ہر روز اپنے اِرادے کا اعادہ کریں، (repeat) کریں۔ ہم جماعت خانے میں جاتے ہیں کل بیعت کی تھی، آج بھی کی کل پھر بیعت کریں گے، کل دُعا پڑھی تھی، آج پڑھیں گے، پھر پڑھیں گے، پھر پڑھیں گے، جماعت خانے کی حاضری دی تھی، پھر دیں گے یہی تو اُصول ہے، ہماری جو فطرت بنی ہے، ہمارا جو باطن ہے، جو وُجود ہے، جو ہستی ہے، جو ہمارا دل و دماغ ہے اُس کی کیفیت

کے پیشِ نظریہ اُصول ہم کو دیا گیا ہے،نہیں تو انسان بھول جاتا ہے۔اِس کے لئے خدا سے یاری چاہنے کی ضرورت ہے، ایک بار یاری چاہنا نہیں ہے،ایک دن کی دُعا سے کچھ نہیں بنے گا،مسلسل دُعا کیجئے،مسلسل گریہ وزاری کیجئے،مسلسل عبادت کیجئے،مسلسل اِرادے کو دُھرایئے اور اپنے عزم کو،اُس کو پختگی دیجئے تو تب کچھ کام بن سکتا ہے،اِس کے بغیر نہیں۔

عزیزانِ من!سوچنے کی ضرورت ہے،جو ہم کرتے ہیں وہ کافی نہیں ہے،جو ہمارا اِرادہ ہے وہ اتنا مضبوط نہیں ہے اِس کو اور پختگی دینے کی ضرورت ہے،جو ہم عبادت کرتے ہیں وہ کافی نہیں ہے،جو ہم علم کے بارے میں سوچتے ہیں وہ کافی نہیں ہے،تو زندگی کی محدود مہلت جو ہے اِس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی ضرورت ہے۔ہم اپنے بزرگانِ دین کے نقشِ قدم پر چل کر اُن کے نمونۂ عمل کو سوچ کر کچھ کر سکتے ہیں اور اگر ہم اِرادہ رکھیں مولا سے یاری چاہیں تو بحیثیتِ مومنین کے بہت کچھ کر سکتے ہیں،بہت کچھ کر سکتے ہیں اور اگر ہم اسماعیلی مذہب میں کچھ بھی نہیں کر سکتے ہیں تو پھر اِس کے لئے کرنے کا پھر کون سا مقام ہے،کون سا موقع ہے،کون سا محل ہے،کوئی جگہ نہیں ہے،یہی ایک مقام تو ہے،یہی ایک موقع تو ہے۔مہربانی!

عزیزانِ من!یا علی مدد،آپ کی اِس توجہّ کی قدر کرتے ہوئے،آپ کے اِس قیمتی وقت کو سمجھتے ہوئے،میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کو کچھ علمی نکات بتا دیئے جائیں،اِس لئے کہ وقت کیا ہے یہ تو آپ جانتے ہیں،وقت زندگی کا دوسرا نام ہے،وقت عمر ہے،وقت عمر کا ایک حصّہ ہے اور عمر یا کہ زندگی کس قدر قیمتی ہے،بے بہا ہے،انمول ہے،یہ تو آپ خوب جانتے ہیں۔ آپ نے ایسے بہت سے مضامین پڑھے ہیں جو وقت سے متعلّق ہیں یا وقت کی اہمیّت کے بارے میں ہیں،اِس لئے پھر میرے نزدیک آپ کے اِس وقت کی اہمیّت کیوں نہ ہو،ضرور۔آج کی اِس ترقّی کی دُنیا میں کوئی ہوشمند،کوئی ہُنرمند شخص کام کے بغیر خالی نہیں ہے،اور جو کام کرتا ہے اُس کو آرام بھی چاہئے،لیکن آپ کو نہ تو کام کی پرواہ ہے،نہ آرام کی،اِس شوق سے آپ یہاں حاضر ہوئے ہیں،ہم چاہتے ہیں کہ اِس میں آپ کو کوئی اہم بات بتا دی جائے،ویسے تو دیکھا جائے اہم باتیں بھی بہت ہیں جو ایک ہی محفل میں ختم نہیں ہو سکتی ہیں،پر کوشش یہ کی جاتی ہے کہ کوئی بنیادی بات ہو جو آپ کے لئے اُصول کا کام کرے،کیونکہ اگر علم اُصولوں میں دیا جا سکتا ہے تو یہ بہت بڑی اچھی بات ہے۔اسمٰعیلی مذہب وہ ہے جس میں علم کے خزانے موجود ہیں،علم کے سرچشمے ہیں،علم کی اعلیٰ باتیں ہیں،تو لیجئے میں ایک مثال آپ کو پیش کرتا ہوں۔قرآن ایک علمی کائنات ہے،قرآن علم کی ایک دُنیا ہے،اُس میں علم ہی علم ہے اور قرآن کا جو علم ہے اُس کے کئی اُصولات ہیں یعنی کئی (principles) ہیں،اُن میں سے ایک اہم اُصول یہ ہے کہ قرآن کا کوئی علمی پوائنٹ،نکتہ یا کہ نقطہ،پہلے وہ ایک نقطہ ہوتا ہے،نقطہ،پوائنٹ،(dot) پھر وہ قرآن ہی کے اندر پھیلتے پھیلتے تمام مطالب کو،تمام علمی باتوں کو اپنے اندر سموتے سموتے دُنیائے قرآن یا کہ قرآن کی کائنات کی سطحوں تک یہ پوائنٹ چھوتا ہے،جس طرح آپ نے کبھی ایک تالاب کے

درمیان کوئی پتھّر، کنکر پھینکی ہوگی اُس میں سے ایک (ring) ،ایک حلقہ پیدا ہوتا ہے، ایک لہر پیدا ہوتی ہے، ایک (circle) پیدا ہوتا ہے، پھر وہ (circle) پھیلتے، پھیلتے، پھیلتے تالاب کے کناروں پر جا کر ختم ہو جاتا ہے، اُس کے پیچھے دوسرا اور تیسرا اور چوتھا (circles) بھی پیدا ہوتے جاتے ہیں اور یہ (circle) جا کر تالاب کے کنارے پر ختم ہوتے ہیں۔ اسی طرح قرآن میں کوئی علمی بات جو رُوحانی قسم کی ہو، جو تائیدی ہو، جو آسمانی ہو، جو امامؑ کی طرف سے ہو وہ اتنی پھیل جاتی ہے یعنی اُس میں سے اتنا علم ظاہر ہوتا ہے، اُس میں اتنی حکمتیں نظر آتی ہیں کہ وہ اپنی وسعت کے ساتھ تمام قرآن کو اپنے اندر سمو لیتی ہے اور کائنات کا نظام بھی یہی ہے کہ کوئی چیز پھیل جاتی ہے اور پھر وہ مختصر سے مختصر ہو جاتی ہے۔ درخت کو ہم نے پھیلتے ہوئے دیکھا ہے اور مختصر سے مختصر ہوتے ہوئے دیکھا ہے، درخت مختصر کہاں ہے؟ پھل میں ہے، پھل میں سارا درخت یعنی درخت کے جتنے اجزاء ہیں، جتنی شاخیں ہیں اور درخت کی جتنی چیزیں ہیں وہ سب پھل میں اور پھل کے اندر گٹھلی میں یعنی بیج میں، (seed) میں جمع ہیں، پھر اُسی میں سے ایک درخت پیدا ہو کر پھیل جاتا ہے تو یہی عمل جو ہے مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح انسان کیا ہے؟ والدین کی اولاد ہے، پھر یہی اولاد کچھ وقت کے بعد والدین کے مقام کو پہنچتی ہے تو یہ بھی ایک (circle) ہے۔ اسی طرح دُنیا کے اندر، اِس کائنات کے اندر جتنی بڑی بڑی چیزیں ہیں اُن تمام چیزوں کا ایک (circle) ہے، سورج کو دیکھئے یا اگرچہ وہ ایک مقام پر ساکن ہے، ٹھہرا ہوا ہے پھر بھی اُس کا ایک (circle) ہے کہ اُس میں سے لائٹ اور روشنی کے ذخیرے (exaust) ہو جاتے ہیں، پھر اُس میں ایندھن پڑتا ہے، کتنے لاکھوں برس کے بعد جو چیز اُس میں سے خارج ہو جاتی ہے اور دوبارہ اُس میں جا پڑتی ہے، اسی طرح اُس میں بھی (circulation) ہو جاتا ہے۔ چاند کو دیکھئے، زمین کو دیکھئے، ستاروں کو، سیاروں کو دیکھئے، پانی کو دیکھئے، ہَوا کو دیکھئے ہر چیز ایک (circle) کے اندر ہے، اسی طرح علم جو ہے وہ کبھی بڑھتا ہے اور کبھی بہت سارا جو علم ہے وہ ایک پوائنٹ میں سمو جاتا ہے، یہ ایک پوائنٹ ہے، یہ ایک نکتہ ہے قرآن کا اور یہ ایک (principle) ہے۔

دوسری بات جو اہم ہے میں آپ کو بتاؤں جو اِس سے بڑھ کر ہے، مومن ہر وقت خدا کے بارے میں سوچتا ہے اور اپنی رُوح کے بارے میں سوچتا ہے اور امامؑ کا حکم بھی یہی ہے کہ تم رُوح کے بارے میں سوچو [دارالسّلام ۲۹۔۹۔۱۸۹۹]۔ خیر اِس سوچنے کے مختلف طریقے ہیں، کوئی کس طرح سوچتا ہے اور کوئی کس طرح سوچتا ہے۔ لیکن سوچ کے اِن طریقوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم علم کی اعلیٰ سطح پر سوچیں اور میں آپ کو ایک طریقہ پیش کرتا ہوں سوچنے کا، آپ ایک آدمی کو سامنے رکھتے ہیں اور اُس کی تصویر لیتے ہیں، آپ اُس شخص کی جو تصویر لیتے ہیں تو اِس تصویر میں اور اُس شخص میں کتنا فرق ہے؟ یہ ایک میں سوال آپ سے پوچھتا ہوں اِس کے بعد جو کچھ بتانا چاہئے میں بتاؤں گا، تو مومن خدا کی ہستی کی ایک تصویر ہے یعنی ہم میں سے ہر ایک اپنی رُوح میں، اپنی رُوحانیت میں، اپنی ہستی میں، اپنے وجود میں خدا کی ایک

تصویر ہے۔اب آپ سوچئے کہ اصل جو سرچشمہ ہے، جو (source) ہے وہ کیسا ہے اور تصویر کیسی ہے۔آپ نے کسی آدمی کی تصویر لی تو اُس آدمی کے مقابلے میں اُس شخص کے سامنے یہ تصویر کتنی بے جان سی چیز ہے، سوچا آپ نے، یہ فرق ہے یعنی ہماری رُوحوں کا جو مشترکہ سرچشمہ ہے، جو مونور یالزم کا مقام ہے یا جو خدا کی ہستی ہے یا جو نور کا سرچشمہ ہے اُس میں سے ہم پیدا ہو گئے، اِس طرح بالکل جس طرح ایک شخص نے، ایک (camera man) نے ایک تصویر لی، لیکن (camera man) تصویر میں اُس آدمی کو کس طرح ڈال سکتا تھا یا تصویر کو آدمی کی طرح کیسے بنا سکتا تھا۔ چلئے اِس سے بڑھ کر ایک اور مثال پیش کریں، یہ تو (camera man) ہو گیا، ایک دوسرا شخص ہے جو فلم لیتا ہے، اِس تصویر میں اور اُس فلم میں بڑا فرق ہے، کہ فلم میں حرکت ہے اور آواز بھی ہے اور بہت کچھ ہے، لیکن پھر بھی یہ فلم کہاں اور وہ چیز کہاں جس سے یہ فلم بنائی گئی ہے یعنی وہ آدمی کہاں اور آدمی کی فلم کہاں، آدمی کے مقابلے میں فلم ایک بے حقیقت چیز ہے، یہ دو مثالیں ہو گئیں۔

اب اِن دو مثالوں کے بعد تیسری بات کو سُنیں جو بہت ہی اہم ہے، آپ چاہتے ہیں کہ تصویر کو لوٹا دیں جس کی یہ تصویر ہے، آپ چاہتے ہیں کہ یہ تصویر اُس آدمی سے ملا دیں واپس، کیا یہ ممکن ہے؟ ناممکن ہے یا آدمی کی جو فلم آپ نے لی تھی اُس فلم کو واپس آدمی سے ملا کر اُس کے ساتھ ایک کر دینا چاہتے ہیں، ممکن ہے؟ ناممکن ہے۔کیوں اور کس طرح اور کوئی وجہ بھی نہیں ہے، آدمی جو ہے وہ اپنے آپ جیسا ہے تو وہ اِس کے لئے کہاں محتاج ہے کہ اپنی تصویر کی ایک کاپی کو واپس اپنی شکل سے جوڑ لے یا اپنی فلم کو واپس اپنا لے اور اپنی ہستی کے ساتھ، اپنی شکل وصورت کے ساتھ، اپنی گفتگو کے ساتھ، اور اپنی ہر چیز کے ساتھ اُس کو ایک کر لے، کیوں؟ اِس سے نہ تو کسی چیز کا اضافہ ہو جائے گا، نہ یہ بات ممکن ہے، آپ نے سوچا اِس سوال کو سوچا، تو میں اصل مقصد کو بیان کروں گا۔ یہی بات ہے، ہماری یہ (existance) جو اِس دُنیا میں ہے اور وہ (existance) جو خدا کے ساتھ مل کر ہے ایسی ہے کہ وہ اِس سے بے نیاز ہے کہ اِس ہستی کو واپس لے اور واپس ہونا یوں ہے کہ ہم صرف اِس کو سمجھیں یعنی اُس کی بے نیازی کی شان کو سمجھیں کہ وہ اِس کے لئے محتاج نہیں ہے کہ اِس جزو کو ملائیں۔

ہمارے ائمہ حضرات صلوات اللہ علیھم اور ہمارے پیر بزرگ جو ہم کو بتاتے ہیں کہ یہ رُوح، روح کا قطرہ واپس سمندر سے جا ملتا ہے، یہ ایک مثال ہے، جا ملنا معرفت کے طور پر ہے، عرفانی طور پر ہے، جا ملنا علمی طور پر ہے۔اگر آپ آج اِس علم کو سمجھتے ہیں، اِس (theory) کو ذہن نشین کر سکتے ہیں اور اُس کی بے نیازی کو، بے نیازی کی شان کو سمجھتے ہیں تو یقین کر لیں کہ آپ گویا ایک طرح سے علمُ الیقین کے مقام پر واپس ہو جاتے ہیں، یہ ہے واپس ہو جانا، تو وہاں پر ایک خیال جاتا ہے، ہماری رُوح نہیں جاتی ہے، ہمارا جسم بھی نہیں جاتا ہے، تصوّر جاتا ہے، علم جاتا ہے، تو قرآن کے اندر ہے ایک مخصوص آیت میں جو بہت شاندار ہے کہ تمہارا واپس ہونا بھی ایسا ہے جیسے تمہارا پیدا ہو جانا (۲۸:۳۱)، تو (cemra man) نے آدمی کی جو تصویر لی تھی اُس وقت اُس آدمی سے کیا چیز کٹ کر نیچے گری تھی، آپ مجھے بتائیں؟ صرف ایک

(image) تھا، اگر آپ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ تصویر لیتے وقت (cemra man) نے جب (pose) بنایا تو اُس وقت آدمی میں سے کچھ (energies) یا کچھ اجزاء کچھ (parts) اور کچھ چیزیں کیمرے میں بند ہوگئیں، تو پھر لازمی ہے کہ ان چیزوں کو واپس جانا چاہئے، اگر آپ کے سامنے کوئی ایسا ثبوت نہیں ہے کہ آدمی کی شکل سے کوئی چیز کٹ کر، الگ ہو کر، جُدا ہو کر اُس کی ہستی سے، اُس کی (existance) سے کوئی چیز الگ ہو کر آگئی ہے فلم میں یا تصویر میں تو پھر بات لازمی یہ ہوگی کہ واپس بھی اسی طرح سے جائے۔

ہماری جو حقیقت خدا کے ساتھ مل کر ہے وہ ہمیشہ سے مل کر ہے، اب بھی ہے، یہ ہماری جو ہستی ہے، یہ جو شعور ہے، سفلی یعنی نچلے درجے کا یہ ایک شعور ہے، تو شعور پیدا ہوسکتا ہے اُس کی روشنی میں اور اُس کے علم کے تحت لیکن جو ہماری اصلی خودی ہے، جو اصلی انا ہے جس کو اپنے مقام سے ہٹنا نہیں ہے، جُدا ہونا نہیں ہے وہ تو اِس وقت بھی ہے۔ اگر ہم علم کی روشنی میں اِس کو سمجھیں اِس بات کو جانیں تو ہم محسوس کر سکتے ہیں، جان سکتے ہیں، یقین کر سکتے ہیں کہ ہماری خودی، ہماری انا، ہماری (I) ہماری ایک لطیف ہستی جو پاک اور برتر ہے وہ خدا کے نور کے ساتھ اب بھی موجود ہے اور میرے نزدیک یہ مسئلہ اتنا اہم ہے، ہوسکتا ہے کہ اِس ایک بیان سے بعض حضرات کے ذہن میں ذرا دشواریاں پیدا ہو جائیں اور جو اِن کے پاس اپنے ذاتی نظریات ہیں، تصورات ہیں یا اِن کے پاس جو پہلے کا علمی ذخیرہ ہے اُس کے ساتھ اِس کا تھوڑا سا تصادم ہو، ممکن ہے اِس لئے اُن کو یہ مسئلہ ہوگا سمجھنے کے لئے، یہاں تک کہ چند بار اِس اہم پوائنٹ پر (discuss) نہ کریں اور باقی میں سمجھتا ہوں کہ جن حضرات نے اِس بحث کو کئی دفعہ سنا ہے اور کتابوں میں اِس کو پڑھا ہے تو اُن کے لئے اِس مسئلے کو سمجھنا دشوار نہیں ہے اور میں نے جو (example) پیش کیں اِس کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھیں کہ آیا (cemra man) جو ہے وہ آدمی کی جب تصویر لیتا ہے اُس میں کیا عمل ہوتا ہے، کیا (action) ہوتا ہے، اُس کی کیا کیفیت بنتی ہے، آیا یہ تصویر جو ہے آدمی کے مشابہ ہے یا کمتر ہے اور فلم کو سوچیں کہ آیا آدمی کی فلم جو ہے وہ بالکل آدمی ہے یا اُس کا ایک (shadow) ہے اِس چیز کو سوچیں، اور اِن دونوں چیزوں کو واپس آدمی سے ملانا ہے تو آپ کس طرح ملا سکتے ہیں، اِس کو سوچیں اور کیا حاجت ہے اور کیا ضرورت ہے کہ آپ اِس تصویر کو، کاغذ کی تصویر کو آدمی سے ملانا چاہتے ہیں یا فلم کو اِس سے ملانا چاہتے ہیں، تو اگر آپ ملانے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو آپ یہ بتائیں کہ کچھ اضافہ ہو جائے گا آدمی میں، کیا اُس میں کمی تھی جب کہ اُس سے ایک تصویر لی گئی تھی یا فلم لی گئی تھی اُس میں کوئی کمی واقع ہوگئی، نہیں کمی واقع نہیں ہوئی۔ یہ بہت اچھی مثال ہے اور اِس جیسی مثال آپ کو کہیں سے نہیں ملے گی۔ تو اگر آدمی کی ایک تصویر نہیں ہزاروں تصویریں بنائیں پھر بھی آدمی کی حقیقت وصورت میں، اُس کی ہستی میں، اُس کی قوتوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ہے، تو نور کا جو سرچشمہ ہے اُس کی مثال یہ ہے، اُس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اِس کائنات کے بنانے میں اور اتنے سارے انسانوں کے وُجود میں آنے کے نتیجے

میں اُس میں ذرا بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، کہ اُس کو پُر کرنے کے لئے ہم واپس اُس کے ساتھ جاملتے ہیں ۔جاملنے کی جو بات ہے وہ سمجھنے کے قابل ہے، اور وہ (highest) نہیں ہے یعنی وہ اُس کے اُوپر بھی توحید کی تعلیمات ہیں ۔قرآن میں جو تعلیمات ہیں آپ نے بہت سی مثالوں میں قرآن کی تعلیمات سُن رکھیں ہیں لیکن وہ درجہ وار ہیں، کوئی بات یہاں کی ہے، کوئی بات یہاں بھی ہے، کوئی بات یہاں کی ہے، کوئی بات یہاں بھی ہے اور جو معلّم ہے وہ جانتا ہے کہ یہ جو تعلیم ہے آخری ہے یا درمیانی ہے یا ابتدائی ہے، وہ اِس کا اندازہ کرسکتا ہے، تو آپ ضرور یہ تصوّر رکھیں کہ قرآن جو ہے وہ ایک یونیورسٹی کی تعلیمات کی طرح وسیع ہے اور اُس میں الگ الگ درجات کی تعلیمات ہیں، لہٰذا آپ قرآن کی کوئی بھی بات مانتے ہیں اِس تصوّر سے مانیں کہ ہوسکتا ہے کہ اِس کے اُوپر بھی کوئی بات ہوتا کہ آپ کو اُوپر جانے میں کوئی دقعت پیش نہ آئے ۔

قرآن ہی میں ہے کہ خدا نے سیڑھیوں کا تصور دیا ہے، خدا فرماتا ہے کہ وہ ”ذِي الْمَعَارِجِ“ ہے (۳:۷۰) یعنی سیڑھیوں والا ہے، سیڑھیوں والا ہے، تو اگر خدا سیڑھیوں والا ہے تو علم کی سیڑھیاں ہیں، معرفت کی سیڑھیاں ہیں، یقین کی سیڑھیاں ہیں، گویا کہ درجے ہیں اور آپ کو یہ ماننا ہوگا کہ درجے ہیں، درجات، قرآن میں اِس کا بھی ذکر ہے (۳:۷۰) کہ درجات جس طرح اِس کائنات کے اندر ہر چیز کو آپ درجات میں دیکھتے ہیں، انسانوں کو بھی درجات میں دیکھتے ہیں اور اسلام کو بھی درجات میں دیکھتے ہیں، اسماعیلیت کو بھی درجات میں دیکھتے ہیں، تو درجات ہیں آپ کو اِن درجات میں آگے بڑھنے کے لئے کوشش کرنی ہے ۔میں چند باتیں بتانا چاہتا تھا اور حالانکہ اب پروگرام کا بہت سارا حصّہ باقی ہے، اِس واسطے میں اپنی گفتگو کو یہاں پر ختم کرتا ہوں ۔

شکریہ! یا علی مدد ۔

ٹائپنگ: شناوزیر علی　　نظرِ ثانی: اکبر علی　　پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علامہ نصیر الدین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان
عنوان: خصوصی بندگی، شوری کا حقیقی تصور
کیسٹ نمبر: ۵۵   تاریخ: اکتوبر ۱۹۸۱، کراچی

Click here
for Audio

قرآنِ مقدّس میں خداوندِ عالم کا بابرکت ارشاد ہے کہ: جو لوگ ہماری راہ میں جدو جہد کریں گے تو اُن کو ہم اپنے راستے دکھلا دیں گے (۶۹:۲۹)۔ یہ جدو جہد عام (level) سے اُونچی سطح کی چیز ہے کیونکہ جو عام کوشش ہے یعنی وہ اعمال جو سب انجام دیتے ہیں وہ کم تر ہیں، ایک خصوصی مرتبے کو حاصل کرنے کے لئے خصوصی اور زائد اعمال کی ضرورت ہے۔ جیسے حدیث قدسی میں فرمایا گیا ہے کہ: [عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ] بندۂ مومن آرام نہیں لیتا ہے زائد عبادت و بندگی کرتے ہوئے۔ زائد عبادت و بندگی سے خدا کی نزدیکی ڈھونڈتے ہوئے آرام نہیں لیتا ہے، تو جتنی بندگی عام ہے اور سب میں مشترک ہے گویا اُس سے خدا کی خصوصی قربت و نزدیکی حاصل نہیں ہوسکتی ہے، خدا کی خصوصی قربت و نزدیکی حاصل کرنے کے لئے خصوصی اور زائد عبادت کی ضرورت ہے۔ اِس طریق کار کو یا تو آپ درویشی قرار دیں یا تصوّف کہیں یا حقیقت کہیں یا خصوصی بندگی کہیں کیونکہ قرآن میں جہاں ہم حضرات انبیاءؑ کے احوال کا مطالعہ کرتے ہیں تو اُن کی زندگی کی روشنی میں بہت ساری حقیقتیں اُجاگر ہو جاتی ہیں۔ اُن میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ پتا چلتا ہے کہ وہ کس طرح عبادت کیا کرتے تھے، کس عاجزی سے، کس انکساری سے اور کس کثرت سے وہ عبادت و بندگی کیا کرتے تھے، اِس کا علم ہو جاتا ہے، تو پھر ہوشمند مومن کو چاہیئے کہ جب تک وہ اِس دُنیا میں زندہ ہے اُس دوران عام عبادت کے علاوہ خاص بندگی کو بھی بجالائے ورنہ قیامت کے دن اُس کو بڑی حسرت ہوگی، اور حسرت اِس معنیٰ میں ہوگی کہ اُس کو اسمٰعیلی مذہب سے جس طرح فائدہ اُٹھانا چاہیئے تھا، وہ نہیں اُٹھاسکا۔ وہ دوسروں کو جو اسماعیلیت میں آئے اور خوب فائدہ اُٹھایا [اُن کو] دیکھ کر بڑی حسرت کرے گا، اُس کو بہت رشک آئے گا۔ اِس کے لئے ہوشمند مومن کو چاہیئے کہ اپنی زندگی کو درویشی سے ہم آہنگ کرے، درویشی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو مومن کو تلخ لگے، درویشی یا کہ خصوصی مومنی بہت ہی اعلیٰ ہے اور وہ لذتوں سے، شیرینیوں سے پُر ہے۔

بڑی سعادت مندی ہے، بڑی نیک بختی ہے ہمارے عزیزوں کی کہ وہ خانۂ حکمت کی اِن مجالس کے بہانے سے خصوصی عبادت کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اعلیٰ علم کی باتیں سنتے ہیں، کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں، کیسیٹوں کو سنتے ہیں، سوالات کرتے ہیں، مقالے پڑھتے ہیں، علمی خطوط سنتے ہیں۔ اِن شاء اللہ یہ ایک بہت نیک کوشش ہے اور اِس سے

فائدہ ملے گا، ضرور اِس سے فائدہ ملے گا۔ اِس لئے کہ خداوندِ عالم نے اپنی عزیز کتاب میں یعنی قرآن میں ارشاد فرمایا ہے کہ: مومن کی کوئی نیکی ضائع نہیں جاتی ہے (۹۹:۷)۔ مومن جو بھی نیک کوشش کرتا ہے اُس کا پھل یا تو دونوں جہاں میں ملتا ہے یا نہیں تو آخرت میں ضرور ملتا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر ہماری کسی کوشش کے باوجود ہم راہِ رُوحانیت میں آگے نہیں بڑھ سکتے ہیں تو اُس کی کوئی وجہ ہوسکتی ہے یا کہ اُس کے سلسلے میں ہم میں کوئی خامی یا کوتاہی ہو سکتی ہے لیکن اِس کوتاہی اور خامی کو بھی قبول کرتے ہوئے ہم نے جو عبادت کی تھی وہ ضائع نہیں ہے، اُس کا ذخیرہ ہوجاتا ہے یعنی وہ جمع ہوجاتی ہے اور قیامت کے دن جہاں مومن کی کوئی نیکی ضائع نہیں ہوجاتی ہے تو اُس وقت اِس کوشش کا پورا پورا صلہ اور بدلہ مل جانے والا ہے۔ لہٰذا دین میں کوئی مایوسی نہیں ہے، کوشش ہم پر فرض ہے اور اِس کوشش کے نتیجے میں جتنا ہنگامی اور وقتی بدلہ دُنیا میں ملے، اُس کے لئے شکر ہے اور جو کچھ آخرت میں ملنے والا ہے اُس کے لئے بھی شکر ہے، لہٰذا مومن کو چاہئے کہ کسی بھی ناکامی سے وہ مایوس نہ ہوجائے۔ اصل میں ناکامی نہیں ہے، میں نے ناکامی کا لفظ اِس رُخ سے اور اِس پہلو سے استعمال کیا کہ مومن کے خیال کے مطابق کہ وہ ایک دم سے ترقّی نہیں کرسکتا ہے، یہ مومن کے خیال کے مطابق ہے لیکن حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو ہر عبادت ترقّی ہی ترقّی ہے اور ترقّی اِس معنیٰ میں کہ اگر ایک مومن کچھ دیر کے لئے محفلِ ذکر میں رہتا ہے یا محفلِ علم میں رہتا ہے تو اُس کا فائدہ جو ہے بہت دُور رس ہے، اُس میں بڑی سعادت مندی ہے، بڑی نیک بختی ہے اور حدیثِ شریف میں ارشاد ہے کہ: جہاں ایک بندۂ مومن علم کی محفل میں ایک گھنٹے کے لئے رہتا ہے تو اُس کے لئے خداوندِ عالم ایک عجیب قسم کا فرشتہ پیدا کرتا ہے۔

سنئے کہ بہت اچھی بات ہے، بہت اچھی مثال ہے، وہ فرشتہ عجیب اِس معنیٰ میں ہے کہ اُس فرشتے کے ایک ہی جسم میں ہزار سَر ہیں، ایک ہی شخصیت میں ہزار سر، ہر سر میں ہزار چہرے ہیں، ہر چہرے میں ہزار منہ ہیں، ہر منہ میں ہزار زبان ہیں۔ اب ایسا عجیب المخلوق فرشتہ، عجیب الخلقت فرشتہ اِس بندۂ مومن کے لئے قیامت تلک مغفرت اور بخشش مانگتا ہے، خدا کے حضور میں۔ کس مومن کے لئے؟ جو ایک گھنٹے کے لئے علم کی محفل میں بیٹھا ہے، علم کی فضیلت کی یہ مثال ہے۔ اب آپ شاید اِس حدیث کی تاویل کی طرف جانا بھی پسند کریں گے کہ آپ کو اِس قسم کے فرشتے کے بارے میں سننے سے تعجّب ہوا ہے، حالانکہ تعجّب اِس میں کچھ بھی نہیں کہ خدا ایک ایسی مخلوق کو پیدا کرسکتا ہے اور اِس کی حکمت یا کہ تاویل یوں ہے کہ خداوندِ عالم ایک فرشتے کو پیدا کرتا ہے جو ایک ہی فرشتہ ہے، جو بہت ہی عظیم ہے۔ اُس فرشتے کے اندر ہزار فرشتے ہیں جو اِس فرشتے کے سروں کی جگہ پر ہیں یعنی ہزار سروں کی جگہ پر ہیں، اُن میں سے ہر ایک کے اندر ہزار فرشتے ہیں جو کہ ایک سر میں ہزار چہروں کی جگہ پر ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک کے اندر اور ہزار ہیں جو کہ ہر چہرے میں ہزار منہ کی جگہ پر ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک کے اندر اور ہزار ہیں جو کہ ہر چہرے میں ہزار زبانوں کی مثال ہیں، تو خدا اِس طرح سے ایک ایسا

فرشتہ پیدا کرسکتا ہے جس کے ایک بدن میں ہزار سر، ہر سر میں ہزار چہرے اور ہر چہرے میں ہزار منہ اور ہر منہ میں ہزار زبان ہیں تو یہ کثرت سے فرشتوں کو اِس کارِ مغفرت پر لگانے کی بات ہے ۔ یہ علم کی ایک فضیلت ہے، یہ علم کے ثواب کی بات ہے، بہر حال بڑی خوش بختی ہے کہ آپ کو اتنا ذوق ملا ہے، اتنا شوق ملا ہے کہ ہر بار آپ آ کے محفل میں حاضری دیتے ہیں ۔ میرے یقین میں اِس سے فائدہ ہوگا اور بہت سارے ممبروں کو اِس سے فائدہ ہوا ہے اور باقیوں کو بھی فائدہ ہوگا۔

اب میں اِسی سلسلے کے ساتھ ساتھ دوسری اہم باتیں کروں گا، وہ یہ کہ ہوسکتا ہے کہ ہمیں کینیڈا کی طرف سفر نکلے تو اُس وقت ہمارے صدر کو بڑی فکر ہوتی ہے کہ یہ محفلیں جو ہیں کس طرح قائم رہیں ۔ چونکہ اِن کے خیال میں بعض اہم ممبروں کے اِدھر اُدھر جانے کا بھی اندازہ ہے لیکن بہر حال مولا مہربان ہے اور آپ سب حضرات مولا پر یقین رکھتے ہوئے جو کوشش بھی ممکن ہو اُس کو جاری رکھنا اور آپ میں سے ہر ایک کو جو کچھ آتا ہے اُس کو پیش کرنا، کوئی گنان پڑھے، کوئی علم کی باتیں کرے، کوئی کتاب کا کوئی (portion) پڑھے یا کوئی (article) پڑھے یا کوئی علمی خطوط میں سے پڑھے ۔ اِس طرح ایک لحاظ سے یہ اچھا ہے کہ جو استاد ہے وہ اِسی بہانے سے آپ کو موقع دے کیونکہ ترقّی اس طرح سے نہیں ہوتی ہے کہ ہمیشہ استاد بولے اور شاگرد جو ہیں وہ خاموش رہیں، یہ اُصول نہیں ہے ۔ کچھ وقت تلک استاد بولتا ہے اور پھر اُس کے بعد شاگردوں کو موقع دیتا ہے یا قدرتی طور پر اُن کو موقع ملتا ہے کسی نہ کسی طرح سے، تو پھر وہ شاگرد کوشش کرتے ہیں اور خداوند اُن کی کوشش میں برکت ڈالتا ہے اور اِس طرح ماضی میں بھی ہوا ہے تواریخ میں کہ شاگرد ہمیشہ شاگرد نہیں رہتا ہے ۔ جس طرح استاد ہمیشہ سے استاد نہیں تھا، وہ بھی کسی زمانے میں کسی کا شاگرد تھا یا یہ کہ وہ بہت محدود علم رکھتا تھا اور بہت محدود تجربہ رکھتا تھا لیکن کرتے کرتے وہ ایک کامل استاد بن گیا۔ اِسی طرح توقع رکھنی چاہیئے کہ جو قابل افراد ہیں، جو شاگرد ہیں، اُن کو بھی استاد بننے کا ضرور موقع ملتا ہے، وہ استاد بن سکتے ہیں ۔ اِس کے لئے ہر شخص کوشش کرے اور اعلیٰ سے اعلیٰ علم کی باتیں پیش کرنے کے لئے کوشش کرے ۔

آپ کو اِس میں کوئی فکر نہیں ہونی چاہیئے، آپ پر امامؑ بہت مہربان ہے، آپ کے پاس بہت کچھ ہے، کوئی اور کیا کرے گا؟ جن کے پاس وسیلہ نہیں ہے اور آپ کے پاس بہت وسیلے ہیں کہ میں اُن وسیلوں کی تعریف نہیں کرسکتا ہوں ۔ اِس لئے اُمید ہے کہ جس طرح اِس سے آگے مجلس کا کام جاری رہا تھا، اب بھی مجلس کا کام جاری رہے گا اور اگر میں کہیں سفر پر گیا تو معمول کے مطابق اور ماضی کی طرح میں آپ کے ساتھ رابطہ رکھوں گا، خط وکتابت ہوگی اور ایک دوسرے کو احوال سے آگاہ رکھیں گے اور دلچسپی سے کام ہوگا اور اِس کے علاوہ اور اگر کوئی میٹنگ کی بات ہے تو بعد کے کسی وقت میں اپنے ادارے کو مضبوط بنانے کے لئے، جمعیت کو ترقّی دینے کے لئے میٹنگ بھی ہوسکتی ہے اور بہت اچھی بات ہے کہ ہمارے اِس ادارے میں بہت ترقّی ہوئی ہے اور ہم کو مولا نے بہت اچھے مہربان دوست اور مزید عطا کر دیئے ہیں

جومہربان ہیں اور ترقّی پسند ہیں، جو ہماری پُشت پناہی کرنے والے ہیں، جن کو علم سے، عبادت سے، ترقّی سے بہت دلچسپی ہے اور جو ممبران پہلے کے ہیں اُنہوں نے بھی کافی ترقّی کی ہے اور اُنھوں نے صداقت، وفاداری اور جاںنثاری کا ثبوت دیا ہے اپنے اچھے کاموں سے، اِن شاء اللہ اور بھی اچھے کام ہوتے رہیں گے، تو علم کے لئے خیال رکھنا اور ایسا نہیں سوچنا کہ جن کو اچھا موقع ملا ہے بس موقع اتنا ہی تھا اور اُنہی کے لئے تھا، ایسا کبھی نہیں سوچیں۔ یکا یک ایسا موقع آئے گا کہ اُس وقت آپ اگر تیار ہیں تو فائدے میں ہوں گے اور فائدہ ملے گا، ایسا نہ سوچا جائے کہ اب یعنی کوئی ایسا اچھا (chance) نہیں ملے گا جیسے ہمارے لندن کے عزیزوں کو ملا، جیسے دوسروں کو ملا، آپ کو بھی اچھے اچھے (chance) مل سکتے ہیں۔ لہٰذا آپ میں سے ہر ایک علمی طور پر کوشاں رہے، اپنے علم میں اضافہ کریں، کتابوں کا مطالعہ ضرور کریں۔ آپ یونیورسٹیوں میں جائیں گے یا بڑی بڑی (institutes) میں جائیں گے تو وہاں بھی جو ہے (study) کے پروگرام ہوتے ہیں جیسے ہماری عزیز بیٹی شہناز نے لکھا ہے کہ اُن کو (institute) کی طرف سے کئی کئی کتابیں پڑھنے کے لئے حکم ملا ہے حالانکہ وہ یونیورسٹی بھی جاتی ہیں (institute) کے حکم سے تو (study) بہت ضروری ہے۔ ایک بات میں آپ کو بتاؤں، آپ نے اِس سے آگے جتنی دفعہ کوئی کتاب پڑھی تھی یا جتنی کتابیں پڑھی تھیں، اب اگر اُن کتابوں کو اِس تجربے کی روشنی میں اور اتنے مطالعے کی روشنی میں جو اِس دفعہ کتابیں پڑھیں گے تو اُن کتابوں میں سے آپ کو ایک نئی روشنی ملے گی، ایک نیا تجربہ ہوگا، یہ اُصول ہے، تو اِس لئے جو کتابیں آپ نے ایک بار پڑھیں اُن کو بار بار پڑھیں کیونکہ وہ دینی کتابیں ہیں، وہ اسماعیلی اُصول کے مطابق ہیں، لہٰذا اُن میں یہ ہوگا کہ ہر بار آپ کو اُس میں سے ایک نئی روشنی ملتی جائے گی، تو یہ اپنے ذہن میں رکھیں اور میں نے کبھی یہ بھی کہا تھا کہ اُس میں سے کس طرح تائید حاصل ہوتی ہے۔ اچھے سکون کے وقت میں یعنی اچھی کتابوں کو پڑھنا، کیسیٹوں کو سننا، مقالوں کو پڑھنا اور مجالس میں حاضری دینا اور مجالس میں خود کو رُوحانی عبادت کا (mood) بنانا، بندگی کا (mood) بنانا، ذکر کا (mood) بنانا، نصیحت کا (mood) بنانا، یہ آپ کی پاکیزگی کے لئے انتہائی ضروری ہے، تو میں اب اپنی ان باتوں کو اِسی مقام پر ختم کرتا ہوں، خاتمہ دیتا ہوں۔ شکریہ، مہربانی کہ آپ نے بہت توجّہ سے ہماری باتوں کو سُنا۔ شکریہ، یا علی مدد۔

یہ ہر شخص جانتا ہے کہ دُنیا میں لوگ اپنے گھر آنے میں غلطی نہیں کرتے ہیں اور اگر لوگ اپنے گھر آنے میں غلطی کرتے تو اِس کے بارے میں خدا کی ہدایت کی ضرورت پیش آتی، وہ دین کے گھر میں آنے کی غلطی کرتے ہیں جیسے رسولؐ سے (approach) اُس کے وصی کے بغیر کرتے ہیں، اُس کے جانشین کے بغیر کرتے ہیں۔ کتابوں کے ذریعے سے، حدیثوں کے ذریعے سے اور دوسرے ایسے لوگوں کے ذریعے سے جو رسولؐ کے گھر کے دروازے کی حیثیّت سے نہیں ہیں، تو اِس پر خدا نے زبانِ حکمت سے لوگوں سے کہا کہ: تم دین کے گھر میں جب آنا چاہتے ہو تو اُس کے دروازے سے

آؤ (۲:۱۸۹) اور ابھی کچھ دیر پہلے میں نے جو کہا تھا کہ: ”وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ“ (۲:۵۸) یہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے زمانے سے متعلّق ہے کہ ظاہر میں دیکھا جائے تو موسیٰ نے ایک چھوٹا سا (gate) بنایا تھا کیونکہ بنی اسرائیل اپنے وقت میں مست ہوئے تھے اور بہت ہی مغرور، متکبّر اور سرکش ہوئے تھے۔ لہٰذا ظاہری روایت کے مطابق خدا کے حکم سے موسیٰ علیہ السّلام نے ایک چھوٹا سا (gate) بنایا تھا کہ وہ (gate) اتنا پست اور چھوٹا سا تھا کہ اُس میں بنی اسرائیل کو داخل ہوتے ہوئے جھکنا پڑتا تھا، یہ گویا کہ شہر کا ایسا (gate) اُنہوں نے بنایا تھا۔ یہ تو ظاہری یعنی روایت ہے اور اِس کی تاویل بھی یہی ہے کہ اصل میں وہ (gate) اُن کے زمانے کا امامؑ تھا، اور پیغمبرؑ کا وصی تھا اور اِس میں خدا کا منشاء یہ تھا کہ حضرتِ موسیٰ سے لوگ (approach) کریں اُن کے وصی، جانشین کے ذریعے سے، امامؑ کے ذریعے سے۔ بات وہاں سے نکلی تھی کہ جو صحیح حدیث ہوتی ہے وہ قرآن کی کسی آیت کے موافق ہوتی ہے، اِس لئے جس حدیث میں ایسے فرشتے کا ذکر ہے، اُس کے مطابق قرآن میں ”حملة العرش“ یعنی عرش کے اُٹھانے والے فرشتوں کا ذکر ہے کہ وہ مومنین کے حق میں دُعا کیا کرتے ہیں، تو یہ ہے گزارش آپ کے اِس سوال کے بارے میں۔ عزیزانِ من! آپ کے خوش نصیب دلوں کی اِس پاکیزگی کے بعد علم کی ایک دو باتیں کریں گے اور چونکہ علم ہمارے، آپ کے اُصول کے مطابق بہت ہی ضروری شیٔ ہے اِس لئے ہم کسی بھی موقع پر علم کی بات کو فراموش نہیں کر سکتے ہیں، علم کے تذکرے کو، اور وہ یہ ہے کہ قرآنِ مقدّس اللہ تعالیٰ کی پُرحکمت کتاب ہے، اللہ تعالیٰ کی عزیز اور پیاری کتاب ہے جس میں خدائے علیم و حکیم نے علم و حکمت کی ساری چیزیں رکھی ہیں اور وہ ایک ایسا امتحان ہے اور وہ ایک ایسا معیار ہے کہ اُسی سے پتا چلتا ہے کہ دُنیا کے اندر خدا کی رضا کے مطابق کون چلتا ہے، یعنی قرآن ایک معیار ہے، ایک کسوٹی ہے اِس بات کی کہ جو اللہ کی رضا کے مطابق چلتے ہیں اُن کو زیادہ سے زیادہ قرآن کا علم ہوتا ہے، تو آج الحمدللہ اسمٰعیلی ہی ایسے ہیں جن کے پاس بحیثیتِ مجموعی دوسروں کی نسبت قرآن کے خزانے بہت زیادہ ہیں کیونکہ قرآن کی ایک آیت میں خدا کا یہ ارشاد ہے کہ: خدا اپنے نور سے اُن لوگوں کو جو اُس کی رضا کو سمجھتے ہیں، سلامتی کے راستے بتلاتا ہے اور اُن کو تاریکی سے نکال کے نور کی طرف لے آتا ہے (۵:۱۶) تو آج اگر ہم تعصّب سے بالاتر ہو کے دیکھیں اور سوچیں تو دُنیا کے اندر مختلف مذاہب میں سے جو اہلِ نجات ہیں، جو امامؑ کے مُرید ہیں اُن کے پاس جو علم کے خزانے ہیں اُن سے پتا چلتا ہے کہ بیشک اِن کو خدا کی رضا حاصل ہے۔ آج دُنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں ریسرچ کا کام ہو رہا ہے یہ اگلے زمانے کی نسبت ایک نیا کام ہے اور جو ریسرچ کرتے ہیں وہ اکثر غیر مسلم ہوتے ہیں، اُن کا کہنا ہے کہ جو علم اور جو حکمت اسماعیلیوں کے پاس ہے وہ کسی کے پاس نہیں ہے، تو یہ ایک دلیل ہے کہ علم اسماعیلیوں کے پاس ہے۔

دوسری بات میں یہ بتانا چاہوں گا کہ قرآن کے اندر مومنوں کی باتیں ہیں اور ساتھ ہی ساتھ دوسری طرف کافروں

کی باتیں بھی ہیں، اِس سلسلے میں ایک حکمت آپ کو میں بتانا چاہتا ہوں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو مختلف زمانوں کے مومنوں کی باتیں ہیں قرآن میں اور جو مختلف ادوار کے کافروں کی باتیں ہیں تو وہ کس طرح سے ہیں؟ آیا وہ باتیں بالکل وہی ہیں جو مومنوں نے کہی تھیں؟ آیا جو کافروں کی باتیں ہیں وہ خود کافروں کی باتیں ہیں یا کیسا ہے؟ اِس میں ایک بہت باریک بات ہے، وہ یہ کہ وہ باتیں ہیں تو صحیح کافروں کی اور مومنوں کی مگر اِن دونوں گروہوں کی طرف سے حکمت ِ خدا نے نمائندگی کی ہے، جو باتیں کافروں کی طرف سے اُن کے احوال کے مطابق کہنی چاہیئے وہ کہی گئیں ہیں اور جو باتیں مومنوں کی طرف سے اُن کے احوال کے مطابق کہنی چاہیئے وہ کہی گئیں ہیں، یعنی اُس ترکیب میں اور اُس اُصول میں حکمتِ خدا کا ہاتھ ہے۔ یہ ایک ایسا پوائنٹ ہے کہ اِس میں زیادہ سے زیادہ توجّہ دینے کی ضرورت ہے کیونکہ سمجھنے میں ذرا مشکل ہے لیکن میں اُمید رکھتا ہوں کہ میں آپ کو اِس کی وضاحت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور پھر میں لوٹ کر ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ خدا چاہے تو پتھر کی نمائندگی کرتے ہوئے پتھر کی زبان سے کچھ کہہ سکتا ہے، حالانکہ پتّھر تو کچھ نہیں کہتا ہے آپ کے نزدیک، ہمارے نزدیک لیکن پتھر کی جو حالت ہے اُس کی خدا ترجمانی کر سکتا ہے۔

اِس مثال میں پتھر نے تو کچھ نہیں کہا لیکن پتھر کو جو کچھ کہنا چاہیئے وہ کہہ نہیں سکتا ہے، لہٰذا خدا اُس کی طرف سے کہہ سکتا ہے کہ پتّھر یہ کہتا ہے تو اِس صورت میں خدا کا یہ فرمانا صحیح ہوگا۔ اِس طرح خدا کی قدرت کافروں کی نمائندگی کرتی ہے اور خدا کی قدرت مومنوں کی نمائندگی کرتی ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ کافروں نے جو کچھ الفاظ کہے تھے وہی خدا پیش کرے بلکہ معنی کو اور اُن کے انکار کو اپنی جگہ رکھتے ہوئے خدا کچھ ایسے الفاظ میں اُن کے نظریات کو، اُن کی باتوں کو پیش کرتا ہے کہ اُس میں حکمت بھی آوے اور اِسی طرح اِس طرف سے، مومنین کی طرف سے مومنین کے جو کچھ اقوال ہیں، یہ ضروری نہیں کہ وہی باتیں اور وہی الفاظ ہوں بلکہ مومنین کے عقیدے اور ایمان کی رُوح کو برقرار رکھتے ہوئے خدا اُن کی بات کو الفاظ کا ایک ایسا جامہ پہنا سکتا ہے کہ اُس میں حکمت بھی آوے اور مومنوں کی جو بات ہے وہ بھی برقرار رہے۔ ابھی آپ نے کچھ سمجھ لیا؟

مثال کے طور پر آپ قرآن کو جب دیکھتے ہیں تو قرآن نظم اور نثر کے درمیان ہے، وہ مکمّل نظم بھی نہیں ہے، وہ خالص نثر بھی نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسے (style) سے ہے، ایک ایسے انداز سے ہے کہ وہ انداز نظم کو بھی اور نثر کو بھی (cover) کرتا ہے، ہوگئی نا یہ بات۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کہیں آیت کے آخر میں 'ن' آتا ہے، کبھی 'ا' آتا ہے جس طرح ردیف و قافیہ میں چلتا ہے، اِس سے ایک چیز آپ کو مل جائے گی، کیا ملے گی؟ اِس سے پتا چلا کہ یہ جو قرآن کے اندر جو کچھ فرمایا گیا ہے یہ خدا نے اپنے طور سے کہا ہے اُن تمام مطالب کو سموتے ہوئے جو اگلے زمانوں کے کافروں کے نزدیک جو کچھ نظریہ تھا یا جو کچھ وہ انکار کرتے تھے یا جس طرح اُن کے خیالات تھے، اُن کی رُوح کو لیتے ہوئے اور مومنین کی طرف سے جو کچھ کہنا چاہیئے اُس

کی رُوح کو لیتے ہوئے خدا نے اپنی حکمت کے دوسرے الفاظ بنائے ہیں اور قرآن کے بنانے کے لئے ایک دوسرا (style) ہے۔ اِس (style) سے پتا چلتا ہے کہ قرآن کے اندر جو کچھ باتیں ہیں یعنی لوگوں کی طرف سے وہ ہو بہو وہی باتیں نہیں ہیں۔ پھر کہتا ہوں کہ رُوح اور معنی اور مطلب وہی ہے، تو یہ جو یعنی الفاظ کا جو طریقہ ہے کیوں بدل گیا؟ اِس لئے کہ خدا چاہتا ہے کہ اُس کے اندر زیادہ سے زیادہ حکمت ہو۔ مثال کے طور پر اگر کافروں کی وہی باتیں ہوتیں جو اُنہوں نے کہی ہیں تو تقریباً نصف قرآن یا اتنا حصّہ جتنا کہ کافروں سے متعلّق ہے، اُس میں نعوذ باللہ منہا لاعلمی اور جہالت کی باتیں ہوتیں، اُس میں حکمت نہ آتی، ۔۔۔کافر کی بات میں کیا حکمت ہے جب تک کہ خدا اُس کو نہ چھیڑے، جب تک کہ خدا اُس کو ایک خاص رنگ نہ دے، جب تک کہ خدا اُس کو ایک خاص (style) سے پیش نہ کرے تو کافر کی بات اور شیطان کی بات اور فرعون کی بات جو ہے اُس میں کیا حکمت ہو سکتی ہے؟ کیا ایسی بات خدا کے کلام کے برابر ہو سکتی ہے؟ اور صحیح معنوں میں وہ خدا کا کلام ہو سکتا ہے؟ تو اگر ایسا ہوتا کہ لوگوں کی باتیں ہوتیں جہاں لوگوں کا ریفرینس ہے جس طرح کہ یعنی قرآن میں ہے کہ فرعون نے یوں کہا، شیطان نے ایسا کہا اور فلاں کافروں نے ایسا کہا، اِس قسم کی باتیں بہت ہیں۔ اگر اُس کے اندر خدا کا ہاتھ نہیں ہوتا اور خدا اُس کو کچھ اِس طرح سے نہیں پیش کرتا کہ کافروں کے انکار کے ذکر کے ساتھ ساتھ اُس میں کافی حکمت بھی آئے تو پھر کبھی یعنی قرآن کا ایسا حصّہ جو ہے وہ حکمت سے پُر نہیں ہوتا۔ یہ ایک بہت باریک بات ہے جو کہ آپ کو کتابوں میں اِس کا ذکر نہیں ملے گا اور اِس کا مقصد یہ ہے کہ قرآن جو ہے وہ سراپا حکمت ہے کہ اگر کسی کافر کا ذکر ہے تو اُس میں بھی حکمت ہے اور مومن کا ذکر ہے تو اُس میں بھی حکمت ہے، جہاں قصّے ہیں اُن میں بھی حکمت ہے اور حکمت کے بغیر کوئی آیت نہیں ہے، حکمت کے بغیر کوئی قرآن کا تذکرہ نہیں ہے، تو اِس کے ساتھ میں ذرا رُکتا ہوں کیونکہ ہمارے یہاں ایک اور مضمون ہے اُس مضمون کو آگے کرنا ہے اور وہ مضمون ایک اہم مضمون ہے۔

وہ اہم اِس لئے ہے کہ اسلام کے اندر بہت بڑی باتیں دو ہیں، بنیادی باتیں، ایک امامت کی بات ہے، امامت کا تصوّر ہے یا خلافت کا تصوّر ہے۔ اِس میں ذرا مزید تشریح کی ضرورت ہے کہ ہمارے نزدیک امامت کچھ اور حقیقت ہے اور دوسروں کے نزدیک امامت اور خلافت کچھ اور معنی میں ہے، اِس فرق کا ہم یہاں فی الحال ذکر نہیں کرتے ہیں لیکن بہرحال امامت اور خلافت ایک بنیادی چیز ہے اسلام کے اندر اور اِسی کے ساتھ ساتھ ایک اور تصوّر ہے۔ وہ تصوّر کس طرح سے قرآن کو چھوتا ہے لیکن اُس میں بھی تشریح کی ضرورت ہے، تشریح کا فرق ہے، سمجھنے میں فرق ہے وہ ہے شوریٰ۔ شوریٰ ایک طرح سے اسلام میں جمہوریت ہے اور لیکن ہم کو اسماعیلیوں کی حیثیّت اِس شوریٰ کے بارے میں کچھ معلومات کی ضرورت ہے۔ شوریٰ کا مطلب یعنی کہ آپس میں مشورہ کر کے کسی بات کو طے کرنا۔۔۔اور یہی سورج دُنیا کے لئے باعثِ ہلاکت بھی ہو سکتا ہے، بارش کو لیجئے کہ اُس سے دُنیا کے لئے، زمین کے لئے حیات ہے، زندگی ہے، آبادی ہے

اور رزق وروزی اُسی سے ہوتی ہے لیکن یہ بے جابر سے یا اُس سے صحیح طور سے فائدہ نہ اُٹھایا جائے، آگ کو لیجئے کہ اُس سے فائدے ہیں اور اُس سے بہت سے کام لئے جاسکتے ہیں لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُس سے کوئی غلط کام لے تو گھر کو اور سامان کو آگ لگے۔ اِسی طرح علم ہے، اُس کو صحیح طور سے استعمال کریں، اُس کو سمجھیں قوانین ہیں اُن کو سمجھیں تو اُن سے فائدہ ہے اور نہیں سمجھتے ہیں تو اُسی میں سے گمراہی ہوتی ہے، تو مطلب یہ ہے کہ شوریٰ جو ہے وہ ایک باہمی مشورے کو کہا جاتا ہے۔ اگر آج ہم یہ خیال کریں کہ زمانۂ رسول میں ایسا تھا، آج بھی ایسا ہونا چاہئے۔ ٹھیک ہے! بہت اچھی بات ہے لیکن زمانۂ رسول میں رسولؐ بھی تھے کہ جو بھی بات وہ چاہیں یا جو بھی روایت یا سنّت کو سامنے رکھنا چاہیں تو اُس میں رسولؐ ساتھ ہوگا یعنی ہادیٔ برحق کے بغیر کوئی کام نہیں ہے اسلام کے اندر ہے نا! تو زمانۂ رسول میں شوریٰ تھا مجلسِ شوریٰ تھی تو رسولؐ بھی تھے اور اِس کے بعد جیسا کہ انھوں نے آپ کو واضح کر کے بتایا کہ ہمارے امام برحق آج اسمٰعیلی مذہب میں سے یعنی بہت سارے لیڈروں کو اپنے پاس بلا لیتے ہیں۔ اِس میں کسی مومن کو یہ غلط فہمی بھی ہوسکتی ہے جو سمجھ بیٹھے کہ مولا لوگوں سے، لیڈروں سے پوچھ پوچھ کے اپنا کام چلاتے ہیں، یہ بات اس طرح سے نہیں ہے، امامؑ وہی ہے جو اِس سے پہلے تھے، آج بھی وہی طاقت ہے، آج بھی وہی نور ہے۔ آپ کو یاد ہوگا تواریخ میں کہ یعنی آج جو کچھ ہو رہا ہے وہ پہلے نہیں ہوتا تھا یا بہت کم ہوتا تھا، مثلاً آج جس طرح ہمارے جماعت کے ادارے ہیں اور اداروں کے سربراہ ہیں، (leaders) ہیں تو اُن کو مولا وقتاً فوقتاً بلا کر اُن کے ساتھ بیٹھ کے میٹنگ کرتے ہیں، پہلے کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا، کیوں؟ اس لئے کہ زمانہ بدل گیا اور وقت یہ آیا کہ وہ نور مکمّل ہوگیا، پہلے بھی نور مکمّل تھا لیکن اِس معنیٰ میں مکمّل ہوگیا کہ ابھی وہ امامؑ اپنے رُوحانی فرزندوں کو بہت کچھ دینا چاہتے ہیں، بہت کچھ عقل، بہت کچھ علم، بہت کچھ روشنی اور بہت کچھ نور دینا چاہتے ہیں۔

اِس کے لئے وہ اُن کو ایک طرف سے ذمہ داری کا احساس دِلانا چاہتے ہیں، دوسری طرف سے اُن کو یعنی جماعت سے وابستہ رکھنا چاہتے ہیں تو یہ ہے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ جماعت کے کسی ادارے کے لئے کسی بھگت کو منتخب کیا گیا ہو یا جو زیادہ عبادت کرتا ہے، جو زیادہ رُوحانیت میں جاتا ہے، اُس کو یعنی (leadership) کے لئے منتخب کیا گیا ہو، یہ بھی امامؑ کی حکمت ہے، تو جماعت کے اندر آپ کو دو قسم کے افراد ملیں گے۔ ہیں تو ہم دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ہم اہلِ باطن ہیں اور ہم سب رُوحانی ہیں لیکن پھر بھی اگر یہاں ذرا تقسیم ہو یا انتخاب ہو تو آپ کو دو قسم کے [لوگ] ملیں گے۔ ایک لوگ بھگت (type) کے ہوں گے جن کو زیادہ سے زیادہ باطن پر بھروسہ ہے اور کسی قدر وہ دُنیا سے اور ظاہریت سے جو ہے وہ یعنی کہ بے پروہ، بے نیاز ہیں اور دوسرے لوگ آپ کو ایسے ملیں گے وہ ہیں تو مومن لیکن وہ کسی قدر یعنی اُن کے اندر ظاہریت کے عناصر زیادہ ہوں گے اور دوسری بات آپ کو یہ جاننے کا ہے کہ جب بھی یعنی جماعت کے اداروں کے لئے انتخاب وغیرہ ہوگا تو اُس میں ایسے لیڈروں کا انتخاب ہوگا جو کہ عبادت بندگی پر جن کا بھروسہ ہے، ایمان ہے، سب کچھ ہے

لیکن وہ ایسے یعنی گوشے میں بیٹھ کر عبادت کرنے والے نہیں ہیں، کچھ دُنیا سے بھی خبر رکھتے ہیں، کچھ حکومت کے سامنے بھی جاتے ہیں، کچھ مالی حالت میں بھی اچھے ہیں اور کچھ جہان داری [دنیاداری] اور سیاست بھی جانتے ہیں۔ ایسوں کو (leadership) کے لئے منتخب کیا جائے گا تو اِس میں امام کی بڑی بڑی حکمتیں ہیں، ایک حکمت تو اِس میں یہ ہے کہ مولا یعنی سب لوگوں کو جکڑنا چاہتے ہیں۔

ایک علاقے میں بادشاہ (type) کا کوئی شخص تھا اور حالانکہ وہ صحیح اسمٰعیلی بھی نہیں تھا لیکن امامؑ اُس کو ہر وقت جماعت کی عملداری میں رکھتا تھا تو کچھ لوگوں کو اِس میں اعتراض ہوتا تھا کہ یہ تو صحیح معنوں میں اسمٰعیلی بھی نہیں ہے تو امامؑ اِس کو عملداری میں لیتے ہیں لیکن جاننے والے ہی جانتے تھے کہ مولا اُس کو کیوں اِس (post) پر رکھتا تھا۔ اُس میں حکمت یہ تھی کہ اگر اُس شخص کو آزاد چھوڑتا تو وہ جماعت کی غیبت کرتا پھرتا اور بہت سارے لوگوں کو اپنے ساتھ اُس طرف لے جاتا، ہے نا؟ تو امامؑ کی حکمت نے اُس کو وہاں جماعت سے وابستہ کرکے رکھا اور اب وہ تو مجبور تھا کہ اگر دل سے اسمٰعیلی نہیں تھا تو زبان سے بھی اسمٰعیلی اسمٰعیلی کہے اور جماعت کے خلاف یعنی کہ (propaganda) کرنے سے رُک جائے۔ دیکھا امامؑ کی کتنی کتنی حکمتیں ہوتی ہیں تو اِسی طرح امامؑ جن کے ساتھ (conferences) بلاتے ہیں اور (meetings) کرتے ہیں تو اُس کا اصل مقصد یہ نہیں ہوتا ہے کہ امامؑ اُن سے عقل کو حاصل کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ اُن کو ہر وقت یعنی احساسِ ذمّہ داری کے ساتھ آگے بڑھانا چاہتا ہے، اُن کو تقویت دیتا ہے اور جماعت کے اندر جو نظامِ اتّفاق ہے، اُس کو قائم رکھتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں آئین کے اندر کہ امام کا جو فیصلہ ہے وہ آخری ہے اور امام کو ہر وقت ترجیح ہے اور میٹنگ میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ امامؑ وہاں ایک فرد کی حیثیّت سے نہیں بیٹھتا ہے، ایک ممبر کی حیثیّت سے نہیں بیٹھتا ہے، ایک عملدار کی حیثیّت سے نہیں بیٹھتا ہے، امام جو ہے وہ صاحبِ امر کی حیثیّت سے بیٹھتا ہے۔ آپ آئین میں دیکھیں، اُس سے پتا چلے گا اور میٹنگ کے نظام کو دیکھیں تو اُس سے پتا چلے گا، تو ہر شخص جو ہے اپنی ناقص رائے کو پیش کرتا ہے، تو اتّفاق سے اگر اُس کی رائے اچھی ہے تو وہ آگے بڑھتی ہے، اگر اُس کی رائے اچھی نہیں ہے تو دوسرا کوئی ممبر اُس سے بڑھ کر کوئی اچھی رائے پیش کرتا ہے یا اگر کچھ اُلجھن ہو تو امامؑ جو اپنی ہدایت ہے، نورانی ہدایت کو اُس پر مسلّط کر دیتا ہے تو یہ جو ہے یعنی کہ جمہوریت ہے، یہ شوریٰ ہے، تو زمانۂ رسولؐ میں بھی اِس قسم کا شوریٰ ہوتا تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ شوریٰ جو ہے رسولؐ سے الگ ہوتا تھا بلکہ اُس محفل میں، اُس مجلس میں رسولؐ موجود ہوتے تھے، تو جیسا کہ اِنہوں نے کہا کہ اسلام کے اندر دو چیزیں ہیں، شوریٰ بھی ہے اور آمریت بھی ہے لیکن جو شوریٰ ہے وہ آمریت کے اندر ہے لیکن آمریت جو لفظ آپ کو روزمرّہ کی اصطلاحات میں یہ اچھا لفظ نہیں ملے گا لیکن (originally) جو آمریت جو ہے یہ کوئی بُرا لفظ نہیں ہے یعنی امر کرنے کو آمریت کہا جاتا ہے لیکن دُنیا کے لوگوں نے اس لفظ کو بُرے (sense) میں لیا ہے تو ہمارے نزدیک یہ جو امر ہے یہ

بہت ہی پاکیزہ اور مقدّس شئ ہے۔

بہر حال یعنی یہ ایک فکر انگیز موضوع تھا، آپ کبھی اِس کے سلسلے میں کبھی ذاتی طور پر سوچیں، کبھی اِس میں سے ایک سوال بنا کر پوچھیں کہ شوریٰ جو ہے یعنی اسلام میں ہے لیکن پیغمبر اور امامؑ کی نگرانی میں ہے اور جہاں ایک آیت ہے اُس میں آپ سوچیں کہ: "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ" (۵۹:۴) میں سب احکام دین کے اور دُنیا کے اسی کے تحت آتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ تم صرف دین کے معاملے میں اطاعت کرو، ایسا بھی نہیں کہ تم صرف دُنیا کے معاملے میں اطاعت کرو، یہ کوئی فرق نہیں ہے۔ تمام احکام میں، تمام باتوں میں، تمام اُمور میں خدا کی اطاعت کرو، پھر رسولؐ کی اطاعت کرو اور پھر صاحبِ امر کی اطاعت کرو تو یہاں پر ختم ہے اور دوسری بات یعنی جس آیت میں شوریٰ کا ذکر ہے، اُس آیت میں لفظِ امر مذکور ہے تاکہ کوئی یہ نہ خیال کرے کہ یہ امر سے اور ہدایت سے کوئی الگ چیز ہے (۳۸:۴۲)۔ لہٰذا جو شوریٰ ہے یا شوریٰ سے متعلّق جو آیت ہے اُس میں بھی لفظِ امر بیان کیا گیا ہے، جس طرح آیۂ اطاعت میں امر ہے کہ: "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ" (۵۹:۴) تاکہ لوگ سمجھیں کہ امر کا کوئی مالک ہے اور امر کا مالک جو ہے وہ امامؑ ہے۔ رسولؐ کے زمانے میں بھی امر کا مالک جو ہے وہ امام تھا، خدا نے اور رسولؐ نے یعنی امام ہی کو صاحبِ امر قرار دیا تھا، تو اِسی کے ساتھ ہماری باتیں یہاں پر ختم ہو جاتی ہیں اور بہت شکریہ، بہت مہربانی کہ آپ آئے اہتمام سے اور محنت اُٹھائی، آپ نے مشقّت کی اور خصوصی بندگی کے لئے آپ بیٹھے اور علم کی باتوں کی طرف آپ نے توجّہ دی۔ اِس لئے شکر گزاری ہے اور قدردانی ہے آپ کی اِن کوششوں کی اور اِنہوں نے جو بہت اچھی طرح سے باتیں پیش کیں اور بہت ساری باتوں کو، نئی نئی باتوں کو آپ کے سامنے اِنہوں نے رکھا تو اِس سے آپ کو اندازہ ہوتا ہے کہ اسمٰعیلی مذہب میں کیسے کیسے علوم ہیں، کیسی کیسی عظیم حکمتیں ہیں کہ اِس میں ہر چیز کا ذکر ہے، تو ایک بات میں آخر میں یہ کروں گا کہ اسماعیلیت میں یہ ہے کہ قرآن ایک بہت بڑا تالاب ہے اور ایک شخص تالاب کے اندر ہاتھ دیتا ہے، ایک ہی جگہ پر پانی کو ہلاتا ہے تو ایک لہر دوڑتی ہے جو تالاب کی تمام سطح سے گزرتی ہے۔ اِسی طرح اگر ایک اسمٰعیلی کسی قرآنی آیت کو چھیڑتا ہے اُس کی وہ حکمت اتنی (powerful) ہوتی ہے کہ آہستہ آہستہ تمام قرآن کی حکمتوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے کیونکہ وہ صحیح ہے اِس لئے، اور قرآن کے آپس میں ربط ہونے کے سلسلے میں کسی کو کوئی شک نہیں ہے۔

قرآن بالکل مربوط ہے یعنی ایک آیت میں جو کچھ حکمت ہے وہی حکمت دوسری تمام آیتوں میں بھی ہے۔ لہٰذا کسی ایک آیت کی حکمت جب بیان کی جاتی ہے تو دوسری سب حکمتیں جو ہیں اپنی جگہ پر حرکت کرتی ہیں، تو یہ ہے اسمٰعیلی علوم کی ایک مثال اور اِن علوم کو ہمارے بزرگانِ دین نے اپنے اپنے زمانوں میں کتابوں کے خزینوں میں جمع کی تھی لیکن آج

افسوس ہے کہ بہت ساری کتابیں عربی میں ہیں، فارسی میں ہیں یا یہ کہ کچھ کتابیں ضائع ہو چکی ہیں، اِس لئے اِن چیزوں کی تلاش کی ضرورت ہے۔

بہرحال شکریہ، مولا آپ کو سلامتی دے، ترقّی دے، کامیابی دے، مال، جان اور اولاد کی برکت ہو، سلامتی ہو اور دین و دُنیا کی سرفرازی ہو۔ مولا آپ کے تمام نیک مقاصد کی تکمیل فرمائے، ساری مشکلات آسان ہوں، سب بلائیں دُور ہو جائیں اور خداوند آپ کو دیدارِ ظاہر اور دیدارِ باطن کی نعمتوں سے نوازے، سرفراز فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپ: سیما عظیم نظرِ ثانی: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: شیطان کا حملہ اور مومن کا دفاع، اختیار

کیسٹ نمبر: ۵۶   تاریخ: اکتوبر ۱۹۸۱ء، کراچی

Click here for Audio

عزیزانِ من! قرآنِ مقدّس میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: خدائے برحق انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہے اور وہ جانتا ہے کہ انسان کے دل کے اندر کیسے وسوسے گزرتے ہیں (۵۰:۱۶)۔ یہ ایک پُرحکمت اشارہ ہے جس کا مقصد ہمیں یہ سمجھانا ہے کہ اگر آج ہمارے دل میں وسوسے پائے جاتے ہیں، تو کل کو بہت ہی ممکن ہے کہ اُن کی جگہ پر کوئی اور شیٔ ہو، یعنی اِن وسوسوں کی جگہ پر خداوندِ عالم کی طرف سے توفیقات ہوں، ہدایت ہو، الہام ہو، وحی کی کوئی جھلک ہو، اُس کا کوئی نمونہ ہو کیونکہ انسان کے سامنے دو رستے ہیں خیر کا رستہ بھی ہے اور شرّ کا رستہ بھی ایسا نہیں کیا گیا کہ اُس کے لئے خیر کا راستہ ناممکن ہو اور صرف وہ ہمیشہ شرّ کے رستے پر چلے، یہ بات رحمتِ خداوندی سے دُور ہے۔ ہونا یوں چاہئے کہ جس طرح کسی کے دل میں شیطان کے وسوسوں کا آنا ممکن ہے اِسی طرح دوسری طرف سے یہ بھی ممکن ہو کہ رحمٰن کی طرف سے توفیقات اور تائیدات کی روشنی آتی رہے، فرشتوں کی آوازیں آتی رہیں، ہدایت کے سرچشمے کی طرف سے کوئی خوشخبری، کوئی بُشارت اور کوئی ہدایت آتی رہے۔ تب ہی تو کہا جائے گا اور مانا جائے گا کہ خدا کا عدل برحق ہے۔

خداوندِ عالم نے اپنی عزیز کتاب میں فرمایا ہے انسان کے متعلق، نفسِ انسانی کے بارے میں کہ: "فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا" (۹۱:۸) خدا نے بذریعۂ الہام انسان کو نافرمانی کا رستہ بھی بتلا دیا اور پرہیزگاری کا رستہ بھی بتلا دیا۔ اِس مقام پر لفظِ الہام آیا ہے "فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا" (۹۱:۸) یہ ایک ایسا جامع لفظ ہے، یہ ایک ایسی حکمت ہے اور خیر اور شرّ کی طرف سے یہ ایک ایسا مشترکہ اُصول ہے کہ جس کے تحت یہ ممکن ہے کہ جس طرح آج کسی کے دل میں شیطان کے وسوسے آتے رہتے ہیں تو کل کو اُسی بندۂ خاکی کے دل میں رحمٰن کی تائیدات، اُس کی توفیقات اور علم و حکمت کی باتیں بھی آتی رہیں، اور اگر یہ نہ ہوتا تو دُنیا میں انسانوں کے لئے یہ بھی ممکن نہ ہوتا کہ وہ رحمٰن کے رستے کو پائیں اور نیکی کی طرف چلے جائیں اور اگر یہ نہ ہوتا تو گویا خدا (by-force) سب کو شرّ کے رستے پر لگا دیا ہوتا اور نیکی کا رستہ سب کے لئے مسدُود ہوتا لیکن یہ بات نہیں ہے۔ اِس کُلیّہ سے، اِس ارشاد سے صاف ظاہر ہے کہ خداوندِ عالم فرماتا ہے کہ: "فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا" (۹۱:۸) خداوندِ عالم نے نفسِ انسانی کو نیکی کی بھی تعلیم دی اور بدی کی بھی تعلیم دی، تب ہی تو اختیار مانا جاتا

ہے، تب ہی تو کہا جاتا ہے کہ انسان ایک محدود دائرے کے اندر مختار ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ وہ اپنے اختیار سے کائنات پر حکمرانی کر سکے اور ایسا بھی نہیں کہ اُس کے اندر جو اختیار کی صلاحیت ہے اُس کو سَلب کیا ہو یعنی ختم کیا گیا ہو۔ اگر انسان کا کچھ بھی اختیار نہ ہوتا اور وہ ہر طرف سے اور ہر معنی سے مجبور ہوتا تو قیامت کے دن خدا سے اُس کی رُوبروئی میں کوئی سوال اُس سے نہ کیا جاتا، کوئی باز پُرس نہ ہوتی اور ساتھ ہی ساتھ اتنا عظیم ہدایت نامہ یعنی آسمانی کتاب اِس کو سکھانے کے لئے، اِس کو سمجھانے کے لئے، اِس کی مدد کے لئے نہ آتا، تو جب ہمیشہ سے خداوندِ عالمین کی بارگاہ سے، اُس کے حضور سے اتنے سارے انبیاء دُنیا میں آئے اور اُن کے ساتھ ایسی عظیم عظیم الہامی کتابیں، آسمانی کتابیں نازل کی گئیں تو یہ سب کچھ کیوں اور کس لئے؟ اِس لئے کہ انسان کو ایک اختیار دیا گیا ہے اور وہ اپنے دائرے میں مختار ہے، تو اِس اختیار کی وجہ سے اُس کی ہدایت کی ضرورت ہے، اُس کی مدد کی ضرورت ہے اور جیسے اِس سابقہ آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ خداوندِ عالم نے دونوں رستے برابر برابر بتلادیئے ہیں، بھلائی کا رستہ بھی اور بدی کا رستہ بھی، تو بدی کا رستہ بھی بتلا کے رکھنا چاہئے تا کہ بدی کا کیا انجام ہے، اُس کا کیا نتیجہ ہے انسان کو معلوم ہو اور نیکی کے رستے کو بھی بتانا چاہئے تا کہ اُس کو ظاہر ہو کہ نیکی کا کیا نتیجہ ہے اور اُس میں کیا مزہ ہے، اُس میں کیا لذّت ہے، تو یہ جو فرمایا کہ ''فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا'' (۹۱:۸) یہ کوئی ازل کا واقعہ نہیں ہے۔ خدا کے الفاظ کبھی ماضی، صیغۂ ماضی میں ہوتے ہیں، کبھی حال میں ہوتے ہیں، کبھی مستقبل میں ہوتے ہیں لیکن حقیقت یوں ہے کہ خدا زندگی میں اور زندگی بھر میں یہ کام کرتا ہے، انسان کی زندگی میں اُس کو ہر چیز بتلاتا ہے، نیکی بھی سکھاتا ہے، بدی بھی سکھاتا ہے اور نیکی اِس لئے سکھاتا ہے کہ وہ نیکی کو اختیار کرے، اُس کو پسند کرے اور بدی اِس لئے سکھاتا ہے کہ بدی سے گریز کرے، اُس کی تلخی کو دیکھے، اُس کی تلخی کا تجربہ کرے، اُس کے بُرے نتائج کو ملحوظِ نظر رکھے اور دُنیا میں انسان کئی طرح سے اِس کا تجربہ کرتا ہے۔ ایک تو وہ ذاتی طور پر اور ایک اِس بیرونی دُنیا میں وہ دیکھتا ہے کہ یہ دُنیا اور اِس کے اندر جو لوگ ہیں وہ ایک کُھلی کتاب کی حیثیّت سے ہیں اور اِس دُنیا کی کتاب کے جو اوراق ہیں وہ خودبخود کھلتے رہتے ہیں، اور دُنیا کی جو کتاب ہے خود ہی داستان سُناتی ہے، قصّے بتلاتی ہے زبانِ حال سے اور اِس سے ایک ہوشمند انسان کو عبرت ملتی ہے، نصیحت ملتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا کے اندر بُرائی کا کیا انجام ہے اور نیکی کا کیا ثمرہ ہے، تو اِنہی تمام معنوں میں خدا نے انسان کو نیکی کا رستہ بھی بتلادیا ہے اور بُرائی کا رستہ بھی۔

اب خداوندِ عالم کا یہ ارشاد کہ وہ انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ اُس کو قریب ہیں (۵۰:۱۶) تو اِس میں توجّہ دلانا مقصود ہے انسان کو، کہ خدا انسان کے بہت ہی قریب ہے۔ جہاں خدا انسان کے قریب ہے وہاں خدا اپنے تمام تر اوصاف کے ساتھ ہے، اپنی ساری خوبیوں کے ساتھ ہے، جو خوبیاں، جو صفات، جو اوصاف قرآن میں بیان کئے گئے ہیں اُن تمام اوصاف کے ساتھ خدا انسانوں کے قریب ہے، تو پھر رحمت کس طرح دُور ہو سکتی ہے، رحمتِ ایزدی، رحمتِ خداوندی،

اُس کی تائید، اُس کی ہدایت، اُس کا نور اور روشنی، دیدار کوئی صفت جو خدا کی ہے انسان سے دُور نہیں ہے۔ جہاں خدا خود ہی قریب ہے تو اُس کے ساتھ اُس کی تمام تر رحمتیں بھی انسان کے قریب ہیں اور خداوندِ عالم کا یہ فرمانا کہ وہ جانتا ہے کہ انسان کا نفس جو ہے وہ کیا کیا وسوسے ڈالتا ہے اور کیونکہ وہ رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہے، تو یہ اشارہ ہے کہ جیسے ہی یہ وسوسے کم ہوں گے تو اُن کی جگہ پر آسمانی ہدایات کی روشنی نمودار ہونے لگے گی کیونکہ یہ اُصولِ کائنات ہے کہ ایک چیز ہے، ایک ظرف ہے، ایک برتن ہے یا کوئی مکان ہے تو وہ دو حال سے خالی نہیں، ایک مقام ہے تو اُس میں یا تو سردی ہوتی ہے یا گرمی ہوتی ہے یا ایک مشترکہ کیفیّت ہوتی ہے، اعتدال ہوتا ہے۔

مطلب کی بات یہ ہے کہ انسان کے دل میں یا تو شیطان کے وسوسے ہوتے ہیں یا توفیقِ الٰہی ہوتی ہے یا یہ ہے کہ کچھ درمیانی حال ہوتا ہے کچھ وہ اور کچھ یہ، لیکن جب مومن باور کرتا ہے کہ خدا کی ہدایت سے رسائی ممکن ہے تو اُس کو چاہئے کہ اپنے دل سے وسوسے کو کم کرے۔ وسوسے کو کس طرح کم کرنا چاہئے؟ ایک مومن ضرور جانتا ہے، اِس مرض کی دوا وہ ضرور جانتا ہے اور خوب جانتا ہے۔ کبھی ہم نے آپ کی محفل میں کہا تھا، حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام کے ایک ارشاد کے حوالے سے کہ: انسان کے دل کے دو کان ہیں جس طرح ہمارے سَر کے دو کان ہیں، تو دل کے دو کان کی یہ کیفیّت ہے کہ ایک طرف ایک فرشتہ منتظر ہے، انتظار کر رہا ہے اور دوسرے کان کی طرف ایک شیطان منتظر ہے، اب دونوں دیکھتے ہیں کہ دل کی کیفیّت کیا ہے۔ اگر دل اِس بات کا حقدار ہے کہ اُس میں توفیق کی کوئی بات، کوئی خدائی ہدایت ڈالی جائے تو فرشتے کو موقع ملتا ہے۔ وہ خداوند کے حکم سے کچھ بُشارت، کچھ خوشخبری، کچھ اچھی بات، علم کی بات، معرفت کی بات، توفیق کی بات، ہدایت کی بات، الہام کی بات کر دیتا ہے اور اگر اُس بندے کا دل اِس قابل نہیں ہے، آلودہ ہے، غافل ہے ذکر سے، عبادت سے دُور ہے، تاریکی ہے، گناہ کا زنگ لگا ہوا ہے تو پھر شیطان کو موقع ملتا ہے۔ وہ اُس کے اندر وسوسے ڈالتا ہے اور یہ امام کا قول ابھی جو آیت بتائی گئی اُس سے مختلف نہیں ہے جس میں خدا فرماتا ہے: ''فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا'' (۹۱:۸) اور انسان کو جس حد تک اختیار دیا گیا ہے اُس اختیار کے تحت انسان خود کو تقویٰ کے قابل بناتا ہے تو تقویٰ کی باتیں، پرہیزگاری کی باتیں دل میں آتی ہیں، نیک خیالات آتے ہیں اور اگر وہ اِس قابل نہیں ہے تو اللہ کا قانون جو ہے وہ عدل سے بھرپور ہے تو اُس شخص کو یعنی کوئی وسوسہ ڈالا جاتا ہے اور یہ بات، یہ نکتہ یاد رہے کہ ایک اعتبار سے خداوند خود فاعل نہیں ہے، وہ کام نہیں کرتا ہے۔ جہاں دُنیا میں کسی عظیم شاہنشاہ کی یہ شان ہوتی ہے کہ اُس کے تحت وزیر ہوتے ہیں، کام کرنے والے ہوتے ہیں، (officers) ہوتے ہیں اور سارے کام وہی کرتے ہیں تو وہاں خدا جو ''أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ'' (۲۳:۱۴) اُس کی یہ شان نہیں ہے کہ ہر چھوٹی بڑی بات خود ہی کرے بلکہ اُس کی تعریف یہ ہے کہ اُس کے تحت اُس کے حکم سے، اُس کے اِذن سے فرشتے اور شیاطین کام کرتے ہیں۔ شیاطین بُرے کاموں کے لئے معمور ہیں،

آزاد ہیں اور فرشتے اچھے کاموں کے لئے معمور ہیں۔ کیا اُس روز شیطان نے نہیں کہا تھا جبکہ سجدۂ آدمؑ کے سلسلے میں وہ قصوروار ٹھہرایا گیا تو بہت ہی غمگین ہو کے اُس نے کہا کہ میں دُنیا میں اولادِ آدم کو گمراہ کروں گا اور صراطِ مستقیم پر تاک لگائے بیٹھوں گا۔ خدا نے اِس بات پر اُس کو منظوری دی تھی (۱۵:۳۰۔۴۰) اب اُس منظوری کے مطابق شیطان یہی کام کرتا ہے اور ایسا بھی نہیں کہ یعنی ساری حکومت شیطان کی ہو اور ہدایت کی طرف سے کوئی وسیلہ نہ ہو، تو کہا گیا کہ ایک طرف اگر شیطان منتظر ہے تو دوسری طرف وہ فرشتے ہیں، رحمان کے لشکر ہیں وہ منتظر ہیں، تو خدا اِس فعل کو اپنی ذات سے منسوب کر لیتا ہے اپنی بادشاہت کی وجہ سے۔ اگرچہ بذاتِ خود خدا نہ تو نیکی کا الہام کرتا ہے اور نہ بدی کا، وہ دونوں کیفیات سے بالا و برتر ہے لیکن چونکہ بادشاہی اُسی کی ہے،، شاہنشاہیت اُس کی ہے، لہٰذا اِس فعل کو اپنی ذات سے وہ منسوب کرسکتا ہے، اور اگر یہ بات نہ ہوتی تو خیر نیکی کے سلسلے میں خدا جو کچھ الہام کرتا ہے اُس کے بارے میں شاید کسی کو سوال نہ ہوتا لیکن جہاں وہ بُری باتوں کے لئے الہام کرتا ہے تو اُس میں ہر دانشمند کے سامنے یہ سوال پیدا ہوتا کہ اگر خداوندِ عالم بُری باتوں کے لئے خود حصّہ لیتا اور بُرائی سے متعلّق وسوسے خود ڈالتا تو پھر شیطان کی کیا ضرورت رہتی؟ شیطان درمیان سے ہٹ جاتا، یہ بات نہیں ہے۔ دانشمند اِس کو اِس طرح سے نہیں سوچتا ہے، تو بُرا کام جہاں شیطان کرتا ہے اور اچھا کام جو ہے وہ ہادیٔ برحق اور اُس کے لشکر کرتے ہیں کیونکہ یہ بھی نہیں ہونا چاہئے کہ خدا کا جو درجہ ہے وہ شیطان کے مدِمقابل ہو جائے، تو یہ عیب کی بات ہوگی، خدا کی شان کے خلاف ہے کہ ایک طرف وہ شیطان ہو میدان میں اور پھر دوسری طرف یعنی خداوند بذاتِ خود ہو، تو اُس کی شان جو ہے وہ گھٹ جائے گی اور یہ بات جو ہے بڑی معیوب ہوگی۔

لہٰذا امامؑ نے جو اشارہ فرمایا وہی بات صحیح ہے کہ شیطان کے مقابلے میں فرشتے ہیں اور ہادیٔ برحق ہے اِس دُنیا کے اندر۔ جس طرح ظاہر کی ایک مثال لیں گے اور ظاہر کی بات یہ ہے، ہم اِس بات کو ذرا سی جھجھک کے بغیر کہیں گے کہ امامؑ کے جو دشمن ہیں ظاہر میں وہ شیاطین ہیں اور امامؑ جو ہیں وہ ہادیٔ برحق ہیں۔ شیطان اور شیاطین کی کیا صفت ہے قرآن کے اعتبار سے؟ ''مُضِلّ'' شیطان کی صفت ہے۔ یہ ایک عربی (word) ہے، میں آپ کو اِس کی تشریح کر کے بتاؤں گا۔ ''مُضِلّ'' گمراہ کُن، گمراہ کردینے والے کو کہتے ہیں اور شیطان انسانوں کو گمراہ کر دیتا ہے۔ اِس لئے اُس کا ٹائٹل، اُس کا نام ''مُضِلّ'' ہے اور لفظ ''مُضِلّ'' ہادی کا (opposite) ہے۔ ہادی کے معنی ہیں رہنما (guide)، رہبر، راستہ بتلانے والا اور ''مُضِلّ'' کے معنی ہیں گمراہ کُن اور رستے سے ہٹانے والا، راہِ راست سے بھٹکانے والا۔ آپ خوب سوچیں! اگر ہم امامؑ کے کسی دشمن کو مانتے ہیں تو یہ دشمنی کس بنیاد پر ہے؟ دُنیا کی کسی جائیداد کی دشمنی تو نہیں ہے، زمین کی دشمنی تو نہیں ہے اور کسی چیز کی دشمنی تو نہیں ہے، دشمنی یہ ہے کہ امامؑ جو ہے وہ خدا اور رسولؐ کی طرف سے راہِ راست کے رہنما ہیں۔ جو امامؑ کے دشمن ہیں وہ راہِ راست سے لوگوں کو بہکانے والا ہے، ہٹانے والا ہے، تو یہاں دو لشکر کا آمنا سامنا ہے۔ ایک طرف رحمانی لشکر ہے

جو امامؑ کی سرپرستی میں ہے، جو امامؑ ہیں، فرشتے ہیں یعنی حدودِ دین ہیں اور مومنین ہیں اور پھر دوسری طرف جو ہیں وہ شیطان ہے، ابلیس ہے، اور شیاطین ہیں اور اُن کا ایک زبردست لشکر ہے، تو اِسی طرح سے خدا کا کام، خدا کا فعل جو ہے اِسی طرح سے انجام پاتا ہے۔ ایسا نہیں کہ خدا بذاتِ خود کوئی کام کرتا ہے، اگر خداوندِ عالم بذاتِ خود کام کرتا ہوتا تو یہ شریعت میں تصوّر کیوں دیا گیا ہے کہ اللہ کا ایک قلم ہے، اُس کی ایک لوحِ محفوظ ہے اور یہ اُس کا قلم بھی انسانی قلم جیسا نہیں ہے کہ اُس کو ہاتھ سے (hold) کریں اور انسان اپنے دماغ کے اِرادے کو، خیالات کو قلم کے ذریعے سے شکل دے، صورت دے بلکہ خدا کا قلم اِس طرح سے ہے کہ وہ خدا کے منشاء کو جانتا ہے، خدا کے اِرادے کو جانتا ہے اور وہاں البتہ حکم کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو خدا کی شان ہے اور اُس کی تعریف ہے کہ اُس نے قلم کو ایسا بنایا ہے کہ قلم خود آگاہ ہے کہ خدا کیا چاہتا ہے اور خدا کے اِرادے اور اُس کی مشیّت کے مطابق یہ قلم کام کرتا جاتا ہے، تو اِس سے معلوم ہوا کہ خدا کا فعل نہیں ہے، قول بھی نہیں ہے، اِرادہ بھی نہیں ہے وہ اِن چیزوں سے بالا و برتر ہے۔ یہ اسمٰعیلی (philosophy) ہے، ہمارے پیروں نے، بزرگوں نے اپنی گرانقدر کتابوں میں یہ تصوّر دیا ہے۔ اِس سے خدا کی شان اور بالا و بلند ہو جاتی ہے۔ درمیان میں ایک مثال پیش کریں، کسی گھر میں جو سرپرست ہے وہ اُس وقت فخر کرتا ہے جبکہ اُس کے گھر کا کام خود بخود انجام پاتا ہے، اُس کے بچّے، اُس کی فیملی، اُس کے گھر کے افراد اِس قدر دانا ہیں کہ وہ گھر کے سرپرست کی منشاء کے مطابق ہر چیز کو نبھاتے ہیں اور ہر کام کو انجام دیتے ہیں۔ یہ ایک گھر کی چھوٹی مثال ہوئی، تو اُس وقت گھر کا جو سرپرست ہے وہ بڑا خوش ہوتا ہے، کہتا ہے کہ میں نے اپنے بچّوں کو ایسی تربیت دی ہے اور میری (wife) ایسی ہوشمند ہے کہ ہر چیز جو ہے ٹھیک وقت پر کرتی ہیں اور میرے بچّے ہر کام کو جانتے ہیں، یہ ایک گھر کی مثال ہے۔ اب ایک بادشاہ کی مثال لیجئے، ایک بادشاہ ہے، اُس کے اہلکار ہیں، اُس کے وزیر ہیں، امیر ہیں، وہ اِس قدر ہوشمند ہیں کہ یعنی کسی کام کے لئے یہ نوبت ہی نہیں پہنچتی ہے کہ بادشاہ جو ہے اُس میں تکلیف کرے اور بادشاہ کو ذاتی طور پر ہر چیز انجام دینے کی نسبت اِس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ اُس کی سلطنت میں ایسے ایسے منتظمین ہیں، ایسے کام کرنے والے ہیں کہ امورِ سلطنت کو حسن و خوبی سے انجام دیتے ہیں، اِس پر بادشاہ کو فخر کرنا چاہیئے اور اِس کو زیادہ خوشی ہے، تو اِن دو مثالوں سے بڑھ کر خداوندِ عالم کے حضور میں، اُس نے جو قلم پیدا کیا ہے وہ دُنیا کے قلم سے بہت ہی مختلف ہے۔ وہ ایک جاندار شئے ہے، وہ ایک عقلی حقیقت ہے، وہ ایک عظیم فرشتہ ہے، وہ عقلِ کُلّی ہے، تو عقلِ کُلّی خدا کے تمام کاموں کو حسن و خوبی سے انجام دیتا ہے۔

لہٰذا یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ فعل اور قول جو ہے وہ خدا کی شان کے قابل نہیں ہے اور خداوندِ عالم بہت ہی بالا و برتر ہے لیکن اُس نے جو وسائل پیدا کئے ہیں وہ وسائل اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ لہٰذا چونکہ خدا بادشاہ ہے، اِس بادشاہی کی وجہ سے اِن تمام چیزوں کو اپنی ذات سے منسوب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ میں نے کیا ہے اور صحیح ہے۔ چونکہ وسائل اُسی کے

ہیں، قوتیں اُس کی ہیں، بادشاہی اُس کی ہے اور ہر چیز اُسی کی ہے لہٰذا وہ چاہے تو اچھے کام کے علاوہ بُرے کام کو بھی اپنی ذات سے منسوب کرسکتا ہے۔ بغیر اِس کے کہ یعنی اُس کی ذات پر کوئی حرف نہیں آتا ہے۔ قرآن کی ایک آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: ''خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۗ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۗ''(۲:۷) خداوندِ عالم نے لوگوں کے دلوں پر مہر لگائی ہے کہ اُن کے دل اب یعنی کام نہیں کر سکتے ہیں۔ جس طرح کوئی حکومت اور کوئی ادارہ کسی چیز پر (condemnation) کی مہر لگاتی ہے تو وہ چیز جو ہے قابلِ استعمال نہیں رہتی ہے، اُس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ ''خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۗ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ (۲:۷) اس ''خَتَمَ'' میں یعنی ایک (literal sense) بھی ہے یعنی ختم ہو چکا ہے، تو محاورے کے اعتبار سے مہر لگانے کے معنی ہیں لیکن ساتھ ساتھ اِس کے اندر لغوی معنی کا بھی دخل ہے۔ وہ یہ کہ اُن کے دل جو ہیں وہ دل نہیں رہے ہیں کہ اُن پر خدا نے مہر لگائی ہے کہ وہ سمجھ نہیں سکتے ہیں اور اُن کے کانوں پر بھی مہر لگی ہوئی ہے، خدا نے مہر لگائی ہے کہ وہ کان جو ہیں حقیقت کی بات نہیں سُن سکتے ہیں اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے، لہٰذا وہ حقیقت کو بھی دیکھ نہیں سکتی ہیں۔ اب ذرا یہاں رُکیں اور فراخ دلی سے غور کیجئے کہ اگر اِس آیت کی تاویل میں نہ جائیں اور ابھی جو ہم نے صراحت کی تھی، وضاحت کی تھی اُس کو نہ لیں، تو پھر یہاں پر ایک بہت بڑا سوال یہ پیدا ہوگا کہ خدا کو خدا ہوتے ہوئے اور اپنی عظیم الشان صفات کے باوجود کیوں ایسا کام کرنا چاہئے کہ لوگوں کے دلوں پر مہر لگائیں اور اُن کو سمجھنے سے قاصر کرے، اور اُن کے کانوں پر مہر لگائیں کہ وہ کان حقیقت کی بات کو نہ سُن سکیں اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ڈالے کہ وہ اُس چیز کو، اُس حقیقت کو نہ دیکھ سکے جو دُنیا میں اُن کے سامنے ہے، یہ کیوں ایسا ہونا چاہئے؟ تو کیا خدا کے لئے مناسب ہے، جائز ہے کہ وہ انسانوں کو دُنیا میں جو مہلت اُس نے دی تھی اُس دوران، حالانکہ یہ مہلت مرتے دم تک ہونی چاہئے تھی تو درمیان میں کیوں ایسی عُجلت سے کام لیتا ہے؟ یہ بات نہیں ہے بلکہ اِس کی حقیقت یوں ہے کہ یہ کام لوگوں کے اپنے اعمال کے نتیجے میں ہوتا ہے یعنی یہ واقعہ اُن پر اُن کے اعمال کے نتیجے میں گزرتا ہے اور خود بخود یہ کیفیّت پیدا ہوتی ہے لیکن خدا چونکہ بادشاہ ہے، جہاں چاہے کسی کام کو اپنی ذات سے منسوب کرتے ہوئے فرما سکتا ہے کہ میں نے یہ کام کیا۔

ایک مثال میں آپ کو بتاؤں گا، فعل یعنی خدا کی ذات تک نہیں پہنچتا ہے اُس کے بارے میں۔ ایک بادشاہ تھا، اُس نے اپنے وزیرِ اعظم سے فرمایا کہ اے میرے وزیرِ اعظم! تم فلان دشت اور بیابان کو آباد کرو اور وہاں کے لئے فلان ندّی سے ایک نہر کی تعمیر کرو۔ یہ اُس نے حکم دیا منسٹر کو، تو منسٹر نے اپنے سے جو (junior) جو وزیر تھا اُس کو بتایا۔ اُس سے اُس کے بعد جو (officer) تھا اُس کو حکم دیا۔ کرتے کرتے یہ حکم جو ہے کچھ ٹھیکے داروں تک اور جو یعنی کمتر کارکُن ہیں اُن تک یہ حکم پہنچ گیا، تو اُنہوں نے لوگوں کو جمع کیا، (public) کو جمع کیا، یا مزدوروں کو جمع کیا، تو نتیجے کے طور پر نہر بن گئی اور جب نہر بن گئی تو مزدوروں نے اپنے اوپر جو کام کرانے والے تھے اُن کو رپورٹ کی یا اُنہوں نے دیکھا، پھر یہ رپورٹ

ہوتی ہوتی اوپر تک گئی، وزیرِ اعظم تک گئی، تو وزیرِ اعظم نے بادشاہ کو بتایا کہ آپ کے حکم کی تعمیل ہوگئی۔ ایک روز بادشاہ یعنی جشن مناتا ہے یا خوشی کرتا ہے یا کسی دوسرے موقع پر اعلان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ میرے آباؤ اجداد کے زمانے میں یہ کام نہیں ہوا تھا، میں نے یہ کام کیا کہ فلاں بستی بسائی، اتنا بڑا زبردست شہر جو ہے میں نے آباد کیا۔ دیکھیں! اور ہر طبقہ، ہر شخص اِس فعل کو اپنی ذات سے منسوب کرتے ہیں۔ مزدور کہتے ہیں کہ ہم نے کام کیا، اُن کے اُوپر جو ٹھیکے دار ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم نے کام کیا، اُن کے اُوپر جو بڑا (officer) ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے کام کیا۔ اسی طرح یہ جو فعل ہے یعنی اُوپر سے اُوپر جاتا ہے۔ حالانکہ کام جو کیا وہ (workers) نے کیا، مزدوروں نے کیا لیکن حکم کی وجہ سے بھی جو حاکم ہیں، جو حکم کرنے والے وہ بھی کہتے ہیں کہ ہم نے کام کیا۔ اُن کی مُراد یہ حکم ہے تو اگر، یعنی کام جو ہے مزدور غلط کرے یا صحیح کرے تو اِس میں کوئی عدل ہو، انصاف کی نوبت آئے تو کیا اِس میں بادشاہ پر کوئی حرف آئے گا؟ یا یہ جو (case) ہے، یا یہ جو معاملہ ہے نیچے سے نیچے ختم ہو جائے گا؟ میرے کہنے کا مقصد ہے کہ خداوندِ عالم نے خیر و شرّ کے دو وسیلے پیدا کئے ہیں، ایک شیطان جو ''مُضِلّ'' ہے یعنی گمراہ کر دینے والا وسیلہ اور ہدایت دینے والا وسیلہ، دو وسیلے خدا نے پیدا کئے ہیں اور یہ اُس کا انصاف ہو گیا حقیقت کے ساتھ، سچائی کے ساتھ مکمّل طور سے اور اِس میں کوئی چیز کی کمی نہیں رہی، تو پھر کون کہہ سکتا ہے کہ خدا نے ظلم کیا، خدا نے تو انصاف کیا۔ دُنیا میں اگر بُرائی کا امتحان نہ ہوتا تو صبر نہ ہوتا، نفس نہ ہوتا تو پھر یعنی انسان کے لئے جہاد کا کوئی میدان نہ ہوتا، کوئی فضیلت نہ ہوتی، کوئی مرتبہ نہ ہوتا۔

آج حیوان کے سامنے کوئی امتحان نہیں ہے۔ لہٰذا وہ فضیلت سے محروم ہے، بہشت سے بھی محروم ہے۔ فرشتے کے سامنے کوئی امتحان نہیں ہے تو وہ بھی فضیلتوں سے خالی ہے، وہ (automatic) ہے، جو کام (automatic) ہوتا ہے تو اُس میں کوئی فضیلت نہیں ہے، مشقت اور محنت اور جدوجہد کے بغیر کوئی فضیلت نہیں ہے، کوئی انعام نہیں ہے۔ جہاں امتحان نہیں ہے تو کوئی درجہ نہیں ہے، کوئی (degree) نہیں ہے، کوئی نمبر نہیں ہے۔ تو خداوندِ عالم نے یہ دو وسیلے جو دُنیا میں پیدا کئے اِس میں حکمت ہے اور جو کچھ ہوتا ہے وہ یہی اِن دو وسائل کے نیچے ہوتا ہے، اور حالانکہ ظلم جب شیطان کو نہیں چھوتا ہے تو خدا تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ شیطان کو نہیں چھوتا ہے، آپ قرآن کو کھول کر دیکھیں، شیطان کے مضمون کو دیکھیں، قیامت کے دن جب خدا کے حضور سے سوال اُٹھے گا اور کہا جائے گا، جانتے ہوئے بھی کہے گا خدا لوگوں کو معلومات دینے کے لئے اور اپنی رحمت کو ظاہر کرنے کے لئے، علم کو ظاہر کرنے کے لئے، عدل کو ظاہر کرنے کے لئے کہ اے شیطان تم نے لوگوں کو کیوں گمراہ کیا؟ شیطان کہے گا اے ربّ العزّت تُو دانا و بینا ہے، تمام احوال کا جاننے والا ہے، میں نے کچھ اُن کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ کے کھینچ کے اپنے رستے پر تو نہیں لایا، یہ صرف ایک آواز تھی، ایک دعوت تھی جس کو اِنھوں نے جان بوجھ کے قبول کیا [۲۰:۸۸]۔ جس طرح دوسری (side) سے نیکی کی دعوت تھی، دعوتِ حق

تھی تو کچھ لوگوں نے اُس کو قبول کیا۔ اِس طرح میں نے اپنی دعوت دی تو اِنہوں نے اِس دعوت کی پیروی کی میں نے کچھ کام نہیں کیا ہے، تو شیطان قیامت کے دن اپنی صفائی کو اِس طرح سے پیش کرے گا اور بالکل یہی بات (by-force) ہے، اگر شیطان کے لئے کوئی سمجھتا ہے کہ اُس کے اندر کوئی (force) ہوتا ہے تو وہ (force) بھی، وہ طاقت بھی انسان خود پیدا کرتا ہے یعنی ہر روز شیطان کی طرف کوئی جھکتا ہے، اُس کی طرف مائل ہو جاتا ہے، تھوڑی سی پیروی کرتا ہے تو کرتے کرتے کرتے وہ اُسی رستے سے وابستہ ہو جاتا ہے، وہ یعنی اپنے خیال میں، اپنے بُرے خیال میں جکڑ جاتا ہے، تو شیطان کیا کرتا ہے؟ شیطان کچھ نہیں کر سکتا ہے، تو کہنا یہ ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے انسان کرتا ہے۔ شیطان کی کوئی حد نہیں ہے، کوئی طاقت نہیں ہے، تو یہ نادانی ہوگی اگر ہم شیطان کو ایک (powerful) مخلوق یا ''مُضِلّ'' سمجھیں۔ ہاں! تو میں نے کہا کہ ہم اُس کو (power) دیتے ہیں اور روز بروز وہ طاقتور ہو سکتا ہے، نہیں تو بنیادی طور پر دیکھا جائے تو شیطان صرف ایک دعوت ہے۔ اُس کو قوّی بناتے ہیں تو انسان بناتے ہیں، اُس کو طاقت دیتے ہیں تو انسان خود ہی دیتے ہیں اور کوئی شک نہیں کہ ایک دن انسان کے لئے نیک رستے کی طرف لوٹنا مشکل ہو جاتا ہے کہ روز تھوڑی تھوڑی قوّت شیطان کو دیں اور اُس رستے کے ساتھ مانوس ہو جائیں تو پھر مشکل ہو جاتا ہے، ورنہ شیطان کوئی (powerful) مخلوق نہیں ہے۔ اِس میں مقصد کیا تھا؟ بات کیا تھی اور کہاں سے آئی تھی بات؟ بات وہاں سے آئی تھی کہ خدا کو ظلم کہاں چھوتا ہے کہ کوئی خیال کرے یا سوال کرے کہ یہ ایسا کیوں ہے کہ خدا نے اِن لوگوں کے دل پر کیوں مہر لگائی اور اِن کے کانوں پر کیوں مہر لگائی اور اِن کی آنکھوں پر کیوں پردہ؟ تو قرآن میں ایسی بہت سی باتیں آپ کے سامنے آئیں گی جس کو ظاہری نگاہ سے، جن کو دیکھنے سے پتہ یوں چلے گا، ایسا معلوم ہوگا جیسا کہ خدا جو ہے اپنی منشاء کے مطابق کبھی یہ کرتا ہے، کبھی وہ کرتا ہے، تو خدا ایسا نہیں ہے، ایک انسان جو ہے اُس کے ارادے میں تذلزل آتا ہے، اُس کا ارادہ ایک جیسا نہیں ہوتا ہے، کبھی وہ نیکی کی طرف جھکتا ہے، کبھی بدی کی طرف وہ مائل ہو جاتا ہے، کبھی اُس کو غصّہ آتا ہے، کبھی اُس کا (mood) بہت اچھا بنتا ہے کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ کبھی، ماتحت دوستوں کے ساتھ، لوگوں کے ساتھ بہت اچھی باتیں کرنے لگتا ہے، تو کیا خدا بھی ایسا کوئی (moody) ہے؟ نہیں، نہیں، نہیں، نہیں۔ خدا کے ارادے کے متعلّق بہت کچھ جاننے کی ضرورت ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ خدا کا جو ارادہ ہے وہ ایک (set) قانون ہے اور (law) ہے۔ وہ (law of nature) ہے اور وہ (law of religion) ہے، خدا کا ارادہ ایک قانون کی شکل میں ہے، اُس میں کچھ یعنی لچک نہیں ہے، وہ (fix) ہے، اور خدا کی صفات جو ہیں وہ اعلیٰ حدود میں ہیں، اعلیٰ حدود میں ہیں۔ کیا آپ نے کبھی انسانِ کامل کے متعلّق نہیں سوچا؟ کہ انسانِ کامل یعنی پیغمبر اور امامؑ دُنیا کے لوگوں سے بہت ہی مختلف ہوتے ہیں۔ کیا آپ حضرت مرتضیٰ علی صلوات اللہ علیہ کے اُس واقعے سے واقف نہیں ہیں کہ ایک روز مولا علیؑ نے ایک کافر پہلوان کو پچھاڑا جنگ میں کیونکہ جنگ کا طریقِ کار یوں ہوتا تھا کہ پہلے کلمہ کو پیش کریں اور اگر

اِس کے لئے وہ قبول نہیں کرتے ہیں تو اعلانِ جنگ کریں اور جنگ لڑیں، تو کیسا کافر پہلوان تھا، بہت بڑا زبردست، تو اُس کو مولا علیؑ نے اُٹھا کر زمین پر دے مارا اور ذوالفقار سے اُس کو قتل کرنا چاہا، تو زمین پر وہ پڑا ہوا تھا۔ اُس پہلوان نے مولا کے چہرۂ مبارک پر تھوک مارا، مولا کے پاک چہرے کو تھوکا، تو اُسی وقت مولا علیؑ پیچھے ہٹ گئے، اُس کے قتل سے ہاتھ اُٹھایا، اُس کے مارنے سے، تو اِس کافر کو تعجّب ہوتا ہے، کہتا ہے کہ اے علیؑ! یہ کیا بات ہے؟ مجھے قتل کرتے کرتے چھوڑ دیا اور کس چیز نے جو ہے تیرے دل میں یہ تبدیلی لائی؟ حالانکہ میرے دل میں ذرا بھی آپ کی حُرمت نہیں ہے تو میں مرتے وقت یہ انتقام بھی لینا چاہتا تھا کہ تیری بے حرمتی چاہتا تھا۔ مولا نے فرمایا کہ اب بس! میں تم کو قتل نہیں کرسکتا ہوں۔ یہ دین کا معاملہ تھا تو یہ ذاتی بن گیا، اب ذاتی معاملہ ہوگیا۔ یوں سمجھا جائے گا کہ میں نے ذاتی غرض سے تم کو قتل کیا اب میں یہ نہیں چاہتا ہوں۔ تو مولائے روم نے مثنوی میں اِس قصّے کو اچھے سے بیان کیا ہے اور بہت تفصیل کے ساتھ۔ آپ چاہیں تو ''حکایاتِ مثنوی'' سے اور دوسری کتابوں سے آپ خود مثنوی سے اِس قصّے کو لے سکتے ہیں تو میں کیا عرض کر رہا تھا؟ میں عرض کر رہا تھا کہ انسانِ کامل جو ہے وہ دُنیا کے انسانوں سے الگ تھلگ ہوتے ہیں۔ میں ارادۂ الٰہی کے بارے میں بات کرتا ہوں کہ اُن کے ارادے میں تزلزل نہیں ہے، وہ پہاڑ کی طرح استقامت کے ساتھ ہے کہ اگر خدا کا کوئی ارادہ ایسا ہوتا جیسے انسان کا تو اِس کائنات کی کوئی شیٔ قائم نہیں رہ سکتی کیونکہ خدا کا اگر غصّہ ہوتا تو بڑا زبردست ہوتا جس طرح ایک ٹیچر کو غصّہ آتا ہے تو سب بچّے سہم جاتے ہیں، گھر کے سرپرست کے غصّے سے فیملی ڈر جاتی ہے اور خدا کی جو شان ہے اُس کے مطابق اگر اُس کا صحیح معنوں میں غصّہ ہوتا تو اِس سے جو ہیں فرشتے اور سب رُوحیں ہلاک ہو جاتیں اور آسمان زمین جو ہے وہ ٹھہر نہیں سکتیں، تو اللہ نے قرآن کے اندر جو اپنی قہر کا ذکر کیا ہے یا جو اپنے غصّے کا ذکر کیا ہے وہ بھی مختلف ہے انسانوں کے غصّے سے، بہت ہی مختلف تو اللہ کا ارادہ بھی مختلف ہے اِس لئے مومن کو سوچنے کی ضرورت ہے، جاننے کی ضرورت ہے تا کہ عرفانی طور پر مومن کا جو درجہ ہے وہ بلند ہو جائے، اور حقائق کی تلاش ہر وقت چاہیئے، اگر آپ کو حقائق ملتے ہیں، اگر آپ کو اِس زندگی میں علمُ الیقین کی روشنی ملتی ہے، امامؑ کا علم کسی وسیلے سے آپ کو ملتا رہتا ہے تو اِس کے لئے ذرا بھی سُستی نہیں ہونی چاہیئے، نہیں تو قیامت کے دن ضرور پوچھا جائے گا کہ آپ نے اِس عظیم نعمت کے لئے کیوں ناشکری کی۔

عزیزانِ من! میں اب موضوع کو ذرا بدلنا چاہتا ہوں۔ یہ ہے کہ ہر ممبر اپنے سامنے ایک منصوبہ ایسا رکھے کہ زندگی میں اُس نے علم کی ایک مقدار کو جماعت کے سامنے پیش کرنی ہے اور وہ فرض کرے کہ ہزار، پانچ ہزار، دس ہزار اور بیس ہزار افراد کو علم کی باتیں پیش کرنی ہیں۔ اِس سلسلے میں مَیں نے ایک علمی خط میں کچھ منصوبہ یا کچھ خاکہ بنا کے بھیجا تھا، وہ بہت اچھی چیز ہے، کبھی اُس کو دیکھ لینا۔ لیکن فی الحال جو کچھ میرے ذہن میں ہے وہ بتا دیتا ہوں۔ میرے کہنے کا مقصد یوں ہے کہ اگر آپ دس (students) کو علم کی باتیں بتاتے ہیں اور وہ اپنے وقت میں سَو کو بتاتے ہیں اور وہ ہزار کو

بتاتے ہیں تو یہ ایک سلسلہ ہوگا، کیوں نہ آپ کے علم میں برکت ہو۔ خداوندِ عالم فرماتا ہے ایک صدقہ کی مثال میں کہ صدقہ سچائی کو کہتے ہیں۔ صدقہ مالی بھی ہوتا ہے، صدقہ علمی بھی ہوتا ہے اور صدقہ کی کئی قسمیں ہیں تو صدقے کے بارے میں خداوندِ عالم نے قرآنِ مقدّس کے اندر ایک مثال دی ہے کہ: جس صدقے کو، جس نیکی کو خدا قبول کرتا ہے اُس کی مثال ایک دانۂ گندم کی طرح ہے کہ کوئی دہقان، کوئی زمیندار اپنے کھیت میں ایک دانے کی کاشت کرتا ہے، ایک دانے کی کاشت تو نہیں کی جاتی ہے لیکن خداوندِ عالم ایک ہی دانے کو لیتا ہے مثال کے طور پر۔ کوئی اچھی زمین ہے اُس میں ایک دانہ بویا جاتا ہے تو اُسی فصل میں اُس گندم کے سات خوشے ہوتے ہیں، سات بالیاں ہوتی ہیں، ہر خوشے میں سَو دانے ہیں تو کتنے دانے ہوئے اُسی ایک (season) میں؟ سات سَو دانے ہو گئے، ایک فصل میں ایک دانے کے سات سَو دانے ہوئے۔ خدا اپنی برکت کی بات بتلاتا ہے اور اگر اِنہی دانوں کو دوسری فصل میں، دوسرے موسم میں یا دوسرے سال میں بو دیئے جائیں تو پھر ہر دانے سے سات سَو دانے ہوں گے، تو اِسی طرح نیکی، علم اور صدقہ، خیرات میں اضافہ ہوتا ہے، تو آپ کا علم اگر صحیح ہے اور اگر وہ ایک دانۂ گندم کے برابر ہے، تعداد میں، مقدار میں تھوڑا سا ہے لیکن آپ اُس کو دیتے ہیں اپنے شاگردوں کو، جماعت کے اچھے افراد کو دیتے ہیں، اور وہ علم چونکہ روشن ہے، صاف ہے، ستھرا ہے، پاک اور پاکیزہ ہے تو لازمی طور پر آپ کے شاگرد دوسروں کو دے دیں گے اور جو دوسرے ہیں تیسروں کو دے دیں گے۔ اِسی طرح کرتے کرتے وہ علم جو ہے پھیل جائے گا اور اُس میں بہت برکت ہوگی اور آپ کو ہر مقام سے ایک حصّہ ملے گا کیونکہ اِس کام کے محرّک آپ ہیں اور آپ سے یہ کام شروع ہوا ہے۔ حدیث میں ہے کہ: ''الدَّالُّ عَلَى الْخَيْرِ كَفَاعِلِهِ'' [ترمذی، حدیث نمبر: ۲۶۷۰] نیکی کے کام کو سمجھانے والا یعنی نیکی کا رستہ بتلانے والا جو ہے تو وہ اُس کام کرنے والے کی طرح ہے یعنی اُتنا ثواب جتنا کہ اُس نیک کام کرنے والے کو ملنے والا ہے اِس اُستاد کو بھی ملے گا اور آپ اُستاد ہیں تو اِس کے لئے خوب تیاری کریں لیکن تیاری ٹارگٹ کے بغیر نہیں ہونا چاہیئے۔ آپ فرض کریں کہ یعنی جو زندگی ہے اُس میں آپ ہزار لوگوں کو علمی طور پر فائدہ دِلانا چاہتے ہیں کہ اِس منصوبے سے آپ کے اندر جو ہے وہ حوصلہ آئے گا اور خوب تیاری ہوگی۔ لہٰذا اِس علم کو بڑی ذمّہ داری سے سنیں تو اچھا ہے، شغل کے طور پر سننے سے کچھ فائدہ نہیں ہے یعنی وقت گزارنے اور وقتی طور پر حظ اُٹھانے یا لذّت پانے کے طور پر اِس کو نہیں لینا چاہیئے۔ مومن کی عادت یہ ہونی چاہیئے کہ وہ تبلیغ کا کام کرے، تبلیغ سے میری مُراد نصیحت، اپنی جماعت کے اندر، اپنے احباب کے اندر، اپنے خاندان میں، اپنے دوستوں میں علم کی بات ہونی چاہیئے۔

اُس میں بہت بڑا ثواب ملتا ہے، تو حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ کے ایک ارشادِ گرامی میں یہ ہے کہ: ''ہر اسمٰعیلی مشنری کی حیثیت سے ہے، ہر حقیقی اسمٰعیلی''۔ آپ جو علم کو سنتے ہیں، علم کی باتوں کو تو کچھ اِس ذمّہ داری سے ہونا چاہیئے اور اِن شاء اللہ جب یہ علم امام کا ہے اور صحیح ہے اور اِس میں بہت ہی پاکیزگی ہے، اِس میں کوئی اُلجھن نہیں، اِس میں

کوئی شک نہیں،بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ باتیں ہم سنتے ہیں تو اُن میں شکوک وشبہات ہوتے ہیں، وہ مطلب (clear) نہیں ہیں تو ہم ایسی چیز کو لے کے کیا کریں جس کے متعلق ہم کو شک ہے؟ ہمارے اپنے لئے اُس میں کوئی اطمینان نہیں ہے،سکون نہیں ہے تو ایسی چیز کو پھیلائیں تو یہ ایک بیکار کوشش ہوگی،اِس سے کوئی نتیجہ خاطرخواہ نہیں ملے گا لیکن جہاں آپ کو علمُ الیقین ملتا ہے کہ جس میں یقین ہے اور وہ شکوک وشبہات کا اِزالہ کرنے والا ہے تو آپ لازمی طور پر اِس کو مضبوطی سے لیں، باقاعدگی سے لیں،اور کوشش کریں۔ ہوسکتا ہے کہ سمجھنے میں تھوڑا سا فرق ہو،ہوسکتا ہے کہ الفاظ میں کوئی فرق ہو لیکن آپ سب سے پہلے اِس سے مطمئن ہو جائیے،اِس قدر اطمینان حاصل کریں کہ آپ کو بھروسہ آئے اور پھر اُس کے بعد آپ علم دوسروں کو دے سکتے ہیں،اِس کی سخت ضرورت ہے۔

میں آپ کو ایک بات بتاؤں؟ چلو سوال کی صورت میں، میں اِس بیان کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔آپ ہی بتائیں کہ امامؑ میں بہت سی چیزیں ہیں، امام کے بہت سے پہلو ہیں لیکن آپ بتائیں کہ امام کا اصل کام کیا ہے؟ امام ہمارے باپ بھی ہیں، باپ کی حیثیّت سے بھی بات کرتے ہیں، امامؑ ہمارے دُنیاوی رہنما بھی ہیں، امامؑ ہم کو طرح طرح کے مشورے دیتے ہیں لیکن سب سے اہم بات کون سی ہے اور امامؑ کی خاصیّت کیا ہے؟ تو امامؑ کی خاصیّت ہدایت ہے، مراد علم ہے۔علم، کون سا علم؟ رُوحانی علم، دینی علم اور ایسا علم کہ تمام اعلیٰ علوم اُسی سے ہیں اور سارے علوم اُسی میں جذب ہو جاتے ہیں اور جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ امامؑ کی خاصیّت جو ہے وہ علم ہے، ہدایت ہے تو ہم بحیثیتِ مومنین کے کیوں نہ کوشش کریں کہ امام کا وُجودِ مبارک اِس دُنیا میں جس مقصد کے لئے ہے اُس مقصد سے متعلق ہم زیادہ آگاہ رہیں، باخبر ہو جائیں اور اُسی چیز کو زیادہ چاہیں اور جس کے لئے امامؑ دُنیا میں آئے ہیں اور وہ علم ہے، معرفت ہے اور علم سے برتر کوئی چیز نہیں ہے۔خدا نے اپنے لئے جو تخت بنایا ہے وہ علم کا بنایا ہے، معرفت کا بنایا ہے، تو عزیزانِ من! یہ کچھ جنرل باتیں تھیں اور میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ نے اِن باتوں کی طرف توجّہ دی ہوگی اور یہ بہت ہی ضروری ہے کہ آپ توجّہ سے سنیں، ذمّہ داری سے سنیں اور اِس طرح سنیں جیسے یعنی کسی کورس میں کچھ افراد شرکت کر رہے ہیں اور ہر شخص اِن تمام باتوں کو ذمّہ داری سے سنتا ہے۔ اِس طرح عمل کریں تو پھر کل کو آپ کے لئے بہت فائدہ آئے گا اور مزہ آئے گا اور نیّت رکھنا کہ آپ اپنے علم کو دوسروں میں منتقل کریں گے، اپنے احباب کو، دوستوں کو اور اپنی اولاد کو بتائیں گے اور ہمیشہ آپ کی عادت یوں ہونی چاہئے کہ ہر وقت یعنی علمی طور پر مصروف ہو جائیں۔ ہم نے اپنی زندگی میں کچھ افراد کو دیکھا ہے اور اچھے مومنین کو دیکھا ہے اور وہ جہاں بھی ہوتے ہیں وہ بزرگانِ دین کی علمی باتیں کیا کرتے ہیں اور مزہ لے لے کر وہ باتیں کرتے ہیں اور مجھے اِس لمبے سفر میں اور مختلف علاقوں میں جانے سے یہ موقع ملا ہے اور بہت اچھے مومنین کو میں نے دیکھا ہے، پایا ہے کہ اُن کی بہت اچھی عادت ہے کہ اپنے احباب میں جب بیٹھتے ہیں تو ایک علم کی بات چھیڑتے ہیں خواہ وہ کسی کتاب سے ہے یا کسی بزرگ سے

اُنہوں نے زبانی سنی تھی اور امامؑ کی بات کرتے ہیں، دین کی بات کرتے ہیں اور کتنا ہی اچھا ہے کہ کوئی علم کی بات کرتا ہے۔ اِس لئے آپ اپنی عادت جو ہے وہ علمی بنائیں اور اِس سے بڑا فائدہ ہوگا اور اِس سے امام آپ سے بہت راضی ہوں گے، بہت آپ کی مدد کریں گے، بہت نوازیں گے دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، تو یہ دوستی کا تقاضا ہے کہ دوست دوست کو یاد کرتا ہے اور اگر ہم امام کے دوست ہیں تو ہمیں اُس کے دین کی خیر خواہی کرنی چاہئے اور ہر وقت اُس کے دین کی باتیں، اُس کے علم کی باتیں ہوں تو اِس سے بہت ہی خوشی اور کامیابی ہوسکتی ہے۔ شکریہ، میں ذرا رُکوں گا، آپ میں سے کسی کا کوئی سوال ہو تو وہ پوچھا جاسکتا ہے۔

اِنہوں نے سوال کیا میری گفتگو کے حوالے سے جس میں، میں نے کہا تھا کہ خدا کے قانون میں لچک نہیں ہے اور شاید مناسب ہے کہ اِس موقع پر سوال ہو۔ اِس لچک سے میری مُراد یہ ہے کہ خدا کا جو قانون ہے وہ انسان کے قانون سے مختلف ہے، جو کچھ چاہئے اُس قانون میں ہے اور جو چیز نہیں چاہئے اُس میں نہیں ہے۔ لہٰذا ایک طرح سے اُس میں وسعت ضرور ہے جو کچھ کہ ہونا چاہئے لیکن وہ قانون ایسا نہیں ہے جس طرح انسانوں کا قانون ہوتا ہے کہ انسانوں کے قانون میں کبھی کمزوری آتی ہے کبھی وہ زمانے کے ساتھ نہیں چل سکتا ہے اور وغیرہ۔ خدا کا قانون جو ہے، میں اب اِس بات کو نہیں بناؤں گا بلکہ پہلے ہی سے میں نے کہا ہے کہ وہ (law of nature) ہے۔ (law of nature) ہونے کے بعد پھر کسی لچک کی اور مزید ضرورت نہیں ہے، (law of nature) سے میری مُراد یہ ہے کہ ایک بچّہ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ وہ ایک ذرّہ ہے یا قطرہ ہے، پھر رفتہ رفتہ اُس کی تکمیل ہوجاتی ہے، تخلیق ہوجاتی ہے، پھر ایک شیر خوار بچّہ پیدا ہوتا ہے اور پھر شیر خوارگی کی حالت بھی اُس سے گزرتی ہے، پھر وہ غذا کھاتا ہے، رفتہ رفتہ جوان ہوتا ہے، پھر بڑی عمر کی طرف بڑھتا ہے، بوڑھا ہوتا ہے، تو اگر وہ مومن ہے تو اُس کے لئے سب کچھ ہے، اور کسی مزید چیز کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور (law of nature) کی دوسری مثال لیجئے، ایک درخت ہے تو سب سے پہلے وہ ایک بیج ہے، پھر اُس بیج کو زمین میں بویا جاتا ہے تو وہ بیج پھوٹ جاتا ہے، اُس میں سے ایک سُوئی پیدا ہوتی ہے، اُس کو سُوئی کہتے ہیں، پھر رفتہ رفتہ یہ ایک پودا بن جاتا ہے، پھر اُس میں پھل لگتا ہے اور آہستہ آہستہ وہ ایک درخت کی شکل اختیار کرتا ہے، یہ (law of nature) کی دوسری مثال ہے۔ اب اِس درخت کے لئے سب کچھ موجود ہے، سب کچھ موجود ہے، (nature) اُس میں سب کچھ کر رہی ہے اور تیسری خود بڑی مثال یہ ہے کہ زمانہ آدم کو لیں، اِس سے آگے کی بات نہیں کریں، زمانہ آدم سے یعنی دین خدا کا آغاز ہوا اور زمانے کے ساتھ اور وقت کے ساتھ یہ چلتا رہا، چلتا رہا۔ جیسے زمانہ آیا اُس میں یہ گنجائش ہے اور پہلے سے یعنی خود لچک ہے تو زمانے کے ساتھ چلتا رہا اور چھ بڑے پیغمبر کے ادوار گزرے، پھر اُس کے بعد تب تک یہ چلتا رہتا ہے اور آخر تک یہ چلتا رہے گا۔

ہم نے ایک چھوٹے سے بچّے میں اور ایک پودے میں اِس کی (study) کی تھی کہ دین کو کیسا ہونا چاہئے؟ تو

اِس کے اندر ہر وقت ارتقاء کی گنجائش ہونی چاہئے، بڑھنے کی گنجائش ہونی چاہئے۔ یہ خود یعنی (law of nature) ہے اور اِس میں مزید کسی چیز کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اِس معنیٰ میں میں نے کہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ لفظ میں کوئی فرق آیا ہو اور لچک سے میری مُراد یہ تھی کہ جس طرح ایک انسان کبھی یہ کرتا ہے، کبھی وہ کرتا ہے، کبھی اُس طرف مائل ہوجاتا ہے، کبھی اِس طرف جھکتا ہے تو اُس کا حال ایک جیسا نہیں رہتا ہے، تو اِس لئے جو قانونِ قدرت ہے وہ ایک ارتقائی شکل میں ہے اور زمانۂ آدم سے لے کر آنحضرتؐ تک جو دین آیا ہے وہ ارتقائی صورت میں آیا ہے، تو پھر آنحضرتؐ کے بعد بھی قیامت تک اِس میں ارتقاء کی یعنی رفتہ رفتہ آگے بڑھنے، ترقّی کرنے کی یہ صورت باقی رہنی چاہئے، تو بہت سے لوگ مانتے ہیں کہ اسلام جو ہے وہ یعنی دین فطرت ہے لیکن غور نہیں کرتے ہیں، اصطلاح کو تو مانتے ہیں، اس نام کو تو قبول کرتے ہیں لیکن دین فطرت کے مطلب کو یعنی (religion of nature) اِس کو نہیں سمجھتے ہیں۔ اگر یہ دین فطرت ہے تو زمانۂ آدم سے آنحضرتؐ تک دین کی ترقّی کی جو رفتار رہی تھی وہی بعد میں بھی رہنی چاہئے تو یہ ہے خدا کا قانون اور اسلام کا نمونہ اسماعیلیت ہے، یعنی (demonstrative power) اسمٰعیلی مذہب میں ہے، تو اسمٰعیلی مذہب جو ہے دینِ فطرت ہے اور دُنیا جس قدر بھی بدلتی جائے گی، عالم جہاں جس قدر بدلتا جائے گا اُتنی اِس میں گنجائش پہلے ہی سے ہے۔ یہ دُنیا، زمانے کے ساتھ چلتا رہے گا، یہ ہے دینِ فطرت اور یہ ہے قانونِ الٰہی اور دوبارہ بھی یعنی میں یاد دلاتا ہوں کہ قانونِ الٰہی کو اور (nature) کو جاننا ہے تو ایک چھوٹے سے بچّے کو سوچیں، یا ایک پودے کو سوچیں یا اگر بڑے پیمانے پر سوچنا ہے تو زمانۂ آدم سے لے کر آنحضرتؐ کے زمانے تک سوچیں۔ بعد کے وقت کا تو میں اِس لئے ذکر نہیں کرتا ہوں کہ وہ تو متنازع فِیہ ہے اور آنحضرتؐ سے آگے جو زمانہ ہے اُس میں کوئی تنازع نہیں ہے، کوئی اختلاف نہیں ہے، سب ہی مانتے ہیں، ہمارے نزدیک آدم سے لے کر خاتم تک جو رفتار رہی تھی وہی رفتار اب بھی ہے اور اب تک یعنی اسی رفتار سے دین آیا ہے۔ دوسرے حضرات یعنی ذرا جھجھک محسوس کرتے ہیں تو اُن کو توجّہ دلانے کے لئے اِس دَور کو نہیں، ہم اُس دَور کو پیش کرتے ہیں جس کے لئے سب قائل ہیں یعنی آدم سے لے کر آنحضرتؐ تک زمانہ کیسے آیا دین کے اعتبار سے؟ تھوڑی تھوڑی تبدیلی کے ساتھ آئی اور یہ ہے کہ: "وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِيلًا" (۴۸:۲۳) کا کیا مقصد ہے؟ اِس کا مقصد یہ ہے کہ جو رفتار آگے تھی وہ رفتار آئندہ بھی رہے گی یعنی اے رسول! اللہ کی عادت کے بارے میں اگر سوال کرتے ہو تو اُس کا جواب یوں ہے کہ اللہ کی عادت جو ہے یعنی اللہ کا جو قانون ہے وہ آگے گزر چکا ہے یعنی وہ ایک رفتار کے ساتھ، ایک ارتقائی شکل میں وہ چلتا آیا ہے۔ "وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِيلًا" (۴۸:۲۳)۔ اِس کے بعد جو آگے رفتار تھی، جو آگے عادت تھی اِس کے بعد بھی یہی ہوگی، اِس میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی، تو تبدیلی نہ آئے گی سے مُراد اِس سے مُراد رفتار ہے اور ارتقائی صورت ہے، تو خدا اُس ماضی کے واقعہ کو سامنے رکھ کر لوگوں کو سمجھانا چاہتا ہے لیکن لوگ نہیں سمجھتے ہیں، کیا کیا جائے۔

یہ بہت بڑی سعادت ہے دُنیا کے اندر، اگر ایک بندۂ مومن عاجزی کا پیشہ اختیار کرتا ہے راہِ خدا میں، تو وہ بہت سے خطرات سے بچ جاتا ہے کیونکہ جس روز شیطان مایوس ہوا تھا اور بارگاہِ الٰہی سے نکالا گیا تھا تو اُس وقت شیطان کی طرف سے یہ طے ہوا تھا یا کہ شیطان نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ ہمیشہ راہِ مستقیم پر تاک لگائے بیٹھے گا اور اپنا جو شکار ہے وہاں کھیلا کرے گا یعنی ہر بار وہ مومنین پر حملہ آور ہوتا رہے گا۔ چاروں طرف سے یعنی صراطِ مستقیم پر مومنین کو گمراہ کرنے کے لئے وہ پیچھے سے حملہ کرے گا، آگے سے کرے گا اور داہنی طرف سے اور بائیں طرف سے کیونکہ راہِ مستقیم کے بغیر جو لوگ گمراہ ہو چکے ہیں اُن لوگوں سے شیطان مطمئن ہے۔ وہ گویا کہ اُس کے لشکر ہیں، اُس کی رعایا ہے، اُس کی (public) ہے، عوام ہیں اور دوسری طرف سے وہ اُس کی ذُرّیت ہیں، اُس کی اولاد ہیں، تو مزید اپنے لئے لشکر بنانے کی کوشش وہ راہِ مستقیم پر، صراطِ مستقیم پر کرتا ہے۔ آج آپ یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ جتنے مومن ہیں وہ مومن ہی رہیں گے اور ایمان کے درجۂ کمال کی طرف بے خوف وخطر آگے بڑھتے چلے جائیں گے، یہ بات نہیں ہے، ہر وقت سالک کے لئے مُہلکات اور خطرات سامنے آتے رہتے ہیں۔ اِس لئے اِس سے بچنے کا واحد علاج یہ ہے، واحد طریقہ یہ ہے کہ ہر بار مومن بڑی مضبوطی کے ساتھ دامنِ مولا سے خود کو وابستہ کردے یعنی وہ ہمیشہ مولا سے التجا کرے، دُعا کرے اور گریہ وزاری کو قائم رکھے، تو جہاں قرآن آسمانی ہدایت نامہ ہے اُس میں بہت سے اہم مضامین ہیں، کوئی مضمون اُس میں فضول نہیں ہے، کمزور نہیں ہے، ہر مضمون اُس کا بڑا اہم ہے۔ تاہم عبادت و بندگی کے لحاظ سے قرآنِ مقدّس کے اندر جو انبیاء سے متعلق موضوع ہے یا اُن کے طریق عبادت کے بارے میں جو موضوع ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے، مومنوں کو چاہئے کہ یہ دیکھا کریں کہ انبیاء علیھم السّلام نے اور ماضی کے نیک بندوں نے، مومنوں نے کس طریقے سے رُوحانیت میں کامیابی حاصل کی یعنی اُن کا طریق بندگی کیا ہے، اُس سے آپ کو ایک چیز ملے گی جو بہت نمایاں طور سے اِس کا ذکر ہے، وہ انبیاء علیھم السّلام کی گریہ وزاری ہے۔

دیکھیں کہ اگر بزرگی اور بڑائی کا کوئی فائدہ ہوتا یا خدا کے بعد بزرگی اور بڑائی کسی کے شایانِ شان ہوتی تو سب سے پہلے یہ بزرگی و بڑائی انبیاء علیھم السّلام اختیار کر لیتے، ایسا نہیں ہے۔ اُنہوں نے تو ہمیشہ کے لئے عاجزی اختیار کی، گریہ وزاری اختیار کی، تو پھر ہم کون ہوتے ہیں جو فخر وغرور کا سر اُونچا کریں؟ دُنیا میں بہت سے لوگ گھمنڈ ہونے کے نتیجے میں گر جاتے ہیں اور اُن کی رُوحانی قوّتیں، صلاحیتیں یکسر ختم ہو جاتی ہیں۔ اِس لئے مومن کی سعادت اِس بات میں ہے کہ وہ ہمیشہ عاجز رہے، عاجزی اختیار کرے اور عاجزی اختیار کرنے کے جتنے بھی طریقے ہیں اُن سب کو اپنائے تاکہ وہ عاجز ہی رہے، تاکہ خدا کی رحمت اُس کی دستگیری کرے اور خدا کی رحمت اُس کی رہنمائی کرے، یہ ہے کہ انسان جب بار بار اپنی انا کو مٹاتا ہے تو اُس کو ایک نئی انا ملتی ہے، ایک نئی خودی ملتی ہے جو بہت ہی عالیشان ہوتی ہے۔ وہ خودی نورانیت کی ہوتی ہے، وہ ایسی خودی ہوتی ہے کہ وہ خدا کی رحمت کی منزل ہوتی ہے یعنی بار بار اُس میں خدا کی رحمت اُترتی ہے اور اُس انا

میں ہر بار اور ہمیشہ تائیداتِ غیبی آتی رہتی ہیں ۔عام اصطلاح میں بھی توفیق ایک چیز تسلیم کی گئی ہے،توفیق اور جس کے لئے ہمارے مذہبی بزرگ مکھی صاحب، کامڑیا صاحب اور دیگر نیک جو مولا کے بندے ہیں وہ ہم سب کے لئے نیک توفیق کی دُعا مانگتے ہیں تو یہ نیک توفیق کیا ہے؟ یہ قابلِ غور بات ہے ۔نیک توفیق ایک نورانی ہدایت ہے جو مومن کے دل میں اُتر سکتی ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ وہ ایک قسم کا اشارہ ہے خدا کی طرف سے یا مانا جائے کہ وہ ایک قسم کی وحی ہے جیسا کہ کل کے موضوع میں جانِ عزیز نے فرمایا کہ وحی کے بہت سے مقامات ہوتے ہیں، وحی کے بہت سے درجات ہوتے ہیں، اگر ہم وحی کی اصطلاح کو استعمال نہ بھی کریں تو توفیق جو ہے وہ ایک عام اصطلاح ہے جس کو سب لوگ مانتے ہیں ۔کہنا یوں ہے کہ ہمیں ہر بار عجز وانکساری سے فائدہ اُٹھانا چاہئے تاکہ ہمارا کام آگے بڑھے اور مولا کی رحمت ہماری دستگیری کرے ۔ اِسی چیز کا نام توبہ بھی ہے، اِسی چیز کا نام عشق ومحبّت بھی ہے اور اِسی چیز کا نام خصوصی بندگی بھی ہے اور یہ ذکرِ الٰہی بھی ہے اور اِسی کو گریہ وزاری بھی کہتے ہیں تو اِس پُرحکمت چیز کے بہت سے نام ہیں ۔ بَارَكَ الله کہ آپ نے بہت خوب مولا کو یاد کیا اور مولا آپ پر بہت بہت مہربان ہو اور آپ کی سب نیک مُرادیں پوری ہو جائیں، آمین ۔شکریہ، مہربانی ۔

ٹرانسکرائب: شمع گیلانی ٹائپ: سیما عظیم علی نظرِ ثانی: اکبر علی پُروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق س) کا پُرحکمت بیان

عنوان: معرفت کی اہمیت

کیسٹ نمبر: ۵۷ تاریخ: اکتوبر/ ۱۹۸۱، کراچی

Click here for Audio

میرے بہت ہی عزیز ساتھیو! آپ کے یہاں جمع ہونے کو دیکھ کر اِس دل کو پگھل جانا چاہئے، اِس تصوّر سے کہ آپ کو عبادت سے کتنی دلچسپی ہے، حصولِ علم کے لئے کس قدر کوشاں ہیں، آپ اپنے پاک امام کو کس قدر چاہتے ہیں، کتنا چاہتے ہیں، کیسے شیدائی ہیں اور کس درجے کے فدائی ہیں، اِن تصوّرات سے ہمیں پگھل جانا چاہئے اور اِسی تصوّر سے اپنے لئے ایک قوّت پیدا کرلینی چاہئے، تو عزیزانِ من! جیسا کہ آپ نے بارہا سُن لیا ہے بلکہ خود اِس حقیقت کا مطالعہ بھی ہو چکا ہے کہ انسانوں کے اِس دُنیا میں آنے کا جو عظیم مقصد ہے وہ معرفت ہے یعنی خدا کی پہچان کیونکہ اِس سے بڑھ کر اور کوئی مقصد ہے نہیں اور جتنے دُوسرے مقاصد ہیں وہ اِس عظیم مقصد کے تحت آجاتے ہیں۔ چنانچہ کوئی مقصد فوت نہیں ہو جاتا تو خواہ اُن مقاصد کو دین سے منسوب کریں یا اُن کو انسانی مقاصد قرار دیں تو ہر حالت میں جو نیک مقاصد ہیں وہ اِسی سلسلے کی کڑیوں کی حیثیّت سے ہیں۔ یکے بعد دیگرے مقاصد جو ہیں ترتیب میں آتے ہیں اور اِن میں سے کوئی مقصد فوت نہیں ہوتا یعنی کہنا یہ ہے کہ اگرچہ انسان کے اِس دُنیا میں آنے کا عظیم مقصد خدا کی شناخت ہے لیکن اِس بلندترین مقصد کو پانے کے لئے اور بھی مقاصد تو چاہئیں یعنی اور بھی مقاصد ہیں۔ جس طرح دُنیا کی مثال میں کسی بڑے کام کو انجام دینا ہوتا ہے تو اُس بڑے کام کی انجام دہی کے سلسلے میں کتنے دُوسرے کام کرنے پڑتے ہیں، کتنے اور کاموں کو انجام دینا پڑتا ہے۔ کچھ تو تیاری کے طور پر، کچھ تو رستے کے مراحل کے طور پر بہت سارے کاموں کو انجام دینا ہوتا ہے۔

چنانچہ سچّے دین کے اندر جتنے کام کرنے کے لئے ہیں اور جتنی باتیں کہنے کے لئے ہیں وہ سب کی سب اِسی عظیم مقصد کے تحت آجاتے ہیں یا کہ وہ سب باتیں، وہ سب کام اِسی مقصد کے سلسلے کی کڑیوں کی حیثیّت سے ہیں اور کوئی بات، کوئی قول جس کو دین میں مقام ملا ہے، اِس معرفتِ خدا سے باہر نہیں ہے۔ یہ ایک اُصول ہے کہ جس طرح خدائے واحد نے یعنی ایک اکیلے خدا نے اِس عظیم کائنات کو بلکہ دونوں جہاں کو وُجود دیا، پیدا کیا تو ایک خدا کے امر و فرمان سے، ایک کلمۂ کُن سے، ایک حکم سے کتنی عظیم کائنات وُجود میں آئی اور اُس میں کتنی ساری چیزیں ہیں۔ لاتعداد اور بے شمار چیزیں ہیں اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ جس طرح یہ ساری چیزیں ایک ہی کلمے سے وُجود میں آئی تھیں یا کہ اتنی ساری عظیم

کائنات ایک کلمے سے وُجود میں آئی تھی، پھر جب خدا چاہے گا تو اُس وقت کُن کے فرمانے کے ساتھ ساتھ یہ تمام چیزیں، اُسی کُن کے لفظ میں، اُسی کُن کے حکم میں، اُسی ایک کلمے کے اندر سب چیزیں سمو جائیں گی۔ اِس صورتِ حال میں، اِس حقیقت میں، اِس عظیم واقعے میں یہ حکمت ہے کہ چیزیں ایک ہی مقام سے پیدا ہو جاتی ہیں، پھر ایک ہی مقام میں سمو جاتی ہیں۔ اِسی طرح انسان کے سامنے جو معرفتِ خدا کا عظیم مقصد ہے تو اُسی مقصد میں دین و دُنیا کے سارے مقاصد جمع ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اِس مثال سے پتا چلا کہ چیزیں ایک ہی مرکز سے، ایک ہی سرچشمے سے پیدا ہو جاتی ہیں اور آخر کار یہ ساری چیزیں اُسی اصل میں، اُسی مرکز میں جمع ہو جاتیں ہیں۔ میں اِس بیان میں معرفتِ خدا کے تحت سارے مقاصد کے آنے کا ذکر کرتا ہوں اور دُوسری بات یہ ہے کہ انسان کا جو ارادہ ہے وہ کس طرف مرکوز ہونا چاہئے؟ یہ کہ مومن جو دانشمند ہے وہ سب سے اعلیٰ چیز کو سوچے، اُسی کی نیت کرے یعنی خدا کی شناخت کی نیّت کرے اور اپنی نیّت کو سب سے عظیم چیز کی طرف متوجّہ کرے تو پھر اُس کے لئے رستے میں مختلف مراحل میں جو چیزیں ملنے کی ہیں وہ خود بخود آتی ہیں۔ جیسا کہ مولا علی صلوات اللہ علیہ کا ارشادِ گرامی ہے کہ: ''خدا کی عبادت نہ تو جہنم کے ڈر سے ہونی چاہئے، نہ بہشت کی طمع سے''۔

عبادت میں غلامی کا تصوّر ہو تو کوئی حرج تو نہیں ہے لیکن اِس سے بہتر یہ ہے کہ ہم دوستی کا تصوّر رکھیں اور خدا کی رضا کو پیشِ نظر رکھیں کیونکہ خدا کی رضا سب سے بڑی چیز ہے اور رضا کو قرآن کی زبان میں ''رِضْوَان'' کہا گیا ہے، اب رضوان کے چند مطالب ہیں یعنی چند معنی ہیں۔ ایک تو رضوان خدا کی خوشنودی کو، خدا کی رضا کو کہا جاتا ہے اور دوسرے اِس کے معنی ہیں کہ خداوندِ عالم نے اپنی قدرت سے جنّت کا کوئی مالک پیدا کیا ہے جو کہ وہی عظیم فرشتہ جنّت کی نگرانی کرتا ہے اور اُس کو جنّت کا اختیار حاصل ہے رضوان کے دوسرے معنی یہ ہیں، اور تیسرے معنی یہ ہیں کہ رضوان اللہ کی خوشنودی ہے کہ وہ اپنی خوشنودی سے جنّتیوں کو بہت کچھ عنایت کرے گا اور چوتھے معنی ہیں کہ رضوان ایک درجہ ہے جو جنّت سے بھی بالا ہے اور دُنیا کے اعتبار سے رضوان کے معنی ہیں کہ دُنیا کے اندر جو لوگ خداوند کی رضا کو چاہتے ہوئے نیکی کرتے ہیں، بندگی کرتے ہیں، دین کی ہدایتوں پر عمل کرتے ہیں تو وہ خدا کی رضا کو چاہتے ہیں، بہرصورت اور بہرحال خدا کی رضا سب سے اُونچی چیز ہے، تو خدا کی رضا کے لئے اور اُس کی معرفت کے لئے مومن جو کچھ کرے تو اُس کے لئے بہت کچھ ملے گا، بہت کچھ ملے گا۔ جہنم کے ڈر سے، بہشت کی طمع سے اور دُنیا کی کسی مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لئے جو عبادت کی جاتی ہے وہ ناجائز تو نہیں ہے مگر اُس کا مقام بہت زیادہ اُونچا نہیں ہے، بہت بلند نہیں ہے۔ خدا کا جو حقیقی دوست ہوتا ہے وہ بوقتِ مصیبت یہ خیال نہیں کرتا ہے کہ اُس پر ظلم و زیادتی ہو رہی ہے بلکہ وہ یہ سوچتا ہے کہ جو صورتِ حال ہے یا جو مشکل آن پڑی ہے اُس میں بھی ایک مصلحت ہے، اُس میں بھی ایک حکمت ہے، تو مومن کا تصوّر اور مومن کا نظریہ ہمیشہ یوں ہوتا ہے۔

بہرحال شناختِ خدا اور خدا کی رضا بہت ہی عظیم ہے، تو خدا کی شناخت عظیم ہے اور خدا کی شناخت کا آغاز اقرار سے

ہوتا ہے یعنی خدا کی خدائی کے لئے ایک مومن جب اقرار کرتا ہے، جب خدا کو مانتا ہے تو یہیں سے معرفت کی بنیاد پڑتی ہے اور پھر معرفت کے مختلف دَرجات مرتّب ہو جاتے ہیں یعنی معرفت کے بہت سے دَرجات ہیں، بہت سی سیڑھیاں ہیں یا زینے ہیں کہ خداوندِ عالم نے قرآنِ مقدّس جیسی آسمانی اور الہامی کتاب میں خود کو سیڑھیوں کا مالک قرار دیا ہے (۷۰:۳) یہ سیڑھیاں دُنیا کی سیڑھیاں نہیں ہیں، یہ رُوحانیت کے مراتب ہیں (stages) ہیں۔ اِس کے علاوہ آنحضرت ﷺ کو جو معراج ہوئی تھی اُس رُوحانیت کو، اُس عظیم واقعہ کو معراج اِس معنیٰ میں کہا جاتا ہے کہ معراج سیڑھی کا نام ہے عربی میں، تو آنحضرتؐ نے اپنے اِس رُوحانی اِرتقاء کو سیڑھی سے تشبیہہ دی اور سیڑھی کے متعلّق آپ تو یہ جانتے ہیں کہ اُس کے زینے ہوتے ہیں۔ اِس لحاظ سے جہاں معرفت ایک سیڑھی کی طرح ہے تو اُس میں مختلف مومنین مختلف سیڑھیوں پر کھڑے ہیں اور خدا کے حضور کی بلندی کی طرف چڑھ رہے ہیں، تو اِس میں مراتب کی بات آگئی، دَرجات کی بات آگئی اور اِس سے بڑھ کر جہاں رُوح اور رُوحانیت کا مشاہدہ ہوتا ہے، وہاں عملی طور پر معرفت شروع ہو جاتی ہے جیسا کہ آپ یقین کے تین درجے جانتے ہیں کہ پہلے علمُ الیقین ہے اور اُس کے بعد عینُ الیقین اور پھر آخر میں حقُ الیقین ہے۔ یاد رہے کہ علم کے جو بڑے بڑے الفاظ ہیں یا دین کی جو بڑی بڑی اصطلاحیں ہیں وہ ایک دُوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ کہنا یوں ہے کہ کبھی تو معرفت کہا ہے، کبھی یقین کہا گیا ہے، کبھی اس کو علم کہا گیا ہے، کبھی ہدایت کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور کبھی اس کو روشنی کہا گیا ہے، تو کبھی اِس کو سیڑھی سے تشبیہہ دی گئی ہے، کبھی اِس کو دَرجات کہا گیا ہے تو اِن تمام مطالب کی حقیقت ایک ہی ہے۔

چنانچہ اگر ہم یقین کے اِن تین بڑے دَرجوں کو پھیلائیں تو اِنہی دَرجات سے ایک بہت ہی بلند و بالا سیڑھی مرتّب ہو جائے گی اور اِس لحاظ سے جو مومنین علمُ الیقین کے درجے پر ہیں اُن کے بھی انفرادی یا ذیلی مراتب مقرّر ہوں گے مثلاً کچھ مومنین ایسے ہیں کہ اُنہوں نے دیدۂ دل سے حقیقتوں کا اور نور کا مشاہدہ نہیں کیا ہے لیکن وہ علمُ الیقین رکھتے ہیں، تو اگر وہ لاکھ ہیں یا کروڑ ہیں تب بھی اُن کے مختلف درجات مرتّب ہوں سکتے ہیں۔ اِسی حساب سے خداوندِ عالم نے فرمایا کہ: ”رُوحوں کو اُس کے حضور تک پہنچنے کے لئے پچاس ہزار (۵۰،۰۰۰) برس کا وقت چاہئے“ (۷۰:۴)۔ آپ کو اس قرآنی تصوّر سے تعجّب بھی ہوگا کہ خدا تک پہنچنے کے لئے اتنا لمبا عرصہ چاہئے جو پچاس ہزار (۵۰،۰۰۰) برس کا ہے، تعجّب اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن یاد رہے کہ خداوند کی حکمت بہت ہی عجیب ہے اور اُس کی حکمت رقدرت زبردست ہے۔ لہٰذا ہوسکتا ہے کہ یہ ایک لحاظ سے صحیح ہونے کے باوجود اِس کے اندر ایک اور کوئی چیز ہو۔ وہ یہ کہ آج دُنیا کے اندر کسی زمینی مسافت کا جو حساب ہے وہ مختلف معیاروں سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک آدمی [کو] ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے کے لئے، پیدل جانے کے لئے کتنا وقت لگتا ہے اور گھوڑے کی سواری کے لئے کتنا وقت چاہئے، موٹر سے جائیں تو، جہاز سے جائیں تو۔ چنانچہ اگرچہ ایک رُوح، عظیم رُوح کو، خدا کے حضور پہنچنے کے لئے پچاس ہزار (۵۰،۰۰۰) برس کی ضرورت ہے تو پھر بھی خداوندِ عالم کی

قدرت میں، اُس کی حکمت میں عجب نہیں ہے کہ ایک مومن بس ایک ہی زندگی میں اور اپنی عمر کے ایک حصّے میں خدا کے حضور تک پہنچے۔ پھر اس کے لئے مثال کے طور پر کچھ یوں ہوگا کہ آپ کی عبادت اور محنت اور مشقّت کتنی ہے، اُسی سے سال بنائے جائیں گے یعنی آپ عبادت کس شان سے کرتے ہیں، کس طرح عبادت میں ڈُوب کے خدا کو یاد کرتے ہیں، کس طرح آپ پر اِستغراق کا عالم گزرتا ہے یعنی ڈُوب جانے کا، کیسی آپ عجز و انکساری کرتے ہیں، کس طرح گریہ وزاری کرتے ہیں، کس طرح پگھل جاتے ہیں، اُس کے حساب سے سالوں کا تعیّن ہوگا اور پھر آپ کے گھنٹوں کو یا منٹوں کو، سالوں کا، مہینوں کا درجہ دیا جائے گا اور بہرحال آپ خدا کے حضور تک پہنچ جائیں گے اور معرفت کا ایک درجہ حاصل ہوگا لیکن یاد رہے خداوندتعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: ''وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ'' (۶۷:۳۹) خدا کی جو قدر ہونی چاہیئے وہ قدر بندوں سے نہ ہوسکی، اور یہی سبب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''مَا عَرَفْنَاكَ حَقِّ مَعْرِفَتِكَ'' خداوندا! تیری معرفت، تیری شناخت، تیری پہچان کا جو حق تھا وہ حق ہم سے ادا نہیں ہوسکا یعنی جیسا کہ اور جس طرح کہ تیری شناخت ہونی چاہیئے تھی وہ ہم سے نہیں ہوسکی۔

سرورِ انبیاء محمّد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جہاں یہ اقرار کرتے ہیں تو وہاں دُوسرا کون ہوسکتا ہے جو معرفت کا بہت بڑا دعویٰ کرے؟ تاہم یہ شاید ادب ہے اور بندگی ہے، عبادت ہے اور تعلیم ہے دُوسروں کو سکھانے کے لئے، سمجھانے کے لئے تو خدا کی معرفت سے کوئی نااُمیدی نہیں، کوئی مایوسی نہیں۔ جو خدا کے سچّے بندے ہیں وہ معرفت کے ایک اعلیٰ مقام کو ضرور حاصل کرسکتے ہیں اور ہاں! جو بندے دُنیا کے اندر علم الیقین کی غذاؤں میں اپنی رُوح کی پرورش کرتے رہیں گے تو اُن کے لئے پروردگارِ عالم یہ مہربانی کرے گا کہ جب ایسی رُوحیں دُنیا سے گزر جائیں گی تو اُن کو اپنے دین کو اپنے نظریے کو آگے بڑھانے اور اُس کو تقویت دینے کے سارے امکانات، وہ اُن کو ظاہر کرے گا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا کے اندر جو علم میں پلے ہوئے ہیں اور جن کو علم سے دلچسپی ہے تو جب یہ دُنیا سے گزر چکے ہوں گے تو اِن کی رُوحوں کو فرشتگی کی صفات سے متّصف کیا جائے گا اور پھر اِن کے سامنے لاتعداد رُوحیں ہوں گی اور جن کو دین کو سکھانا ہوگا، جن کو علم دینا ہوگا اور جن پر حقائق جو ہیں اُن کو ظاہر کرنا ہوگا جس طرح ہمارے ماضی کے پیروں نے، بزرگوں نے، داعیوں نے کام کیا اور اِس طرح مومنین کو عالمِ رُوحانیت میں یہ خدمت سونپی جائے گی کہ وہ بہت ساری رُوحوں کو تعلیم دیں۔ یہ اِس لئے کہ خدا نے سچّے دین کو دُوسرے مذاہب پر، دُوسرے ادیان پر غالب کرنے کا جو وعدہ فرمایا ہے (۹:۳۳، ۴۸:۲۸، ۶۱:۹) اُس کے لئے دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے وقت آنے پر دُنیا ہی میں جو سچّا دین ہے غالب ہوجائے گا، ایک یہ کہ جب مومنین عالمِ آخرت کا مشاہدہ کررہے ہوں گے اور جب اِس دُنیا سے وہ چل بسے ہوں گے تو اُس وقت وہ اپنی رُوح کی آنکھ سے مشاہدہ کریں گے کہ کس طرح دُنیا والے سب یعنی سب رُوحیں اِس دین میں داخل ہورہی ہیں۔

یہاں پر آپ ایک سوال کریں گے شاید وہ یہ ہے کہ آپ کا پوچھنا شاید یہ ہو کہ کبھی کبھار قرآن میں اور قرآن میں اکثر اور کبھی کبھار کسی محفل میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اہلِ نجات بہت تھوڑے ہیں اور بہت سی آیات سے اور بہت سی حدیثوں سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ اہلِ نجات کے علاوہ جو دُوسرے لوگ ہیں اُن کو بس جہنم میں جانا ہوگا وغیرہ، آپ کا شاید یہ سوال ہو۔ یہ سوال صحیح ہے لیکن اِس کے باوجود دُنیا میں جتنے لوگ ہیں اُن کی دو حیثیتیں ہیں یا کہ دو انائیں ہیں، اُن کے دو شعور ہیں، ایک دنیوی ہے اور ایک رُوحانی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنے اِس دنیوی شعور کو اُس شعور کے ساتھ ملا سکتے ہیں یا درمیان سے (link) یا جو ربط ہے یا جو سلسلہ ہے وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ میں نے کبھی مثال دی تھی کہ یہ کائنات بجائے خود ایک بولنے والی کتاب ہے، ایک زندہ کتاب ہے، اِس کے اوراق خود بخود کُھلتے ہیں، خود بخود کتاب ہمارے سامنے (read) کرتی ہے، یہ کائنات / (nature) جو ہمارے سامنے ہے، تو قرآن کی مقدس آیات میں بھی یہ حکم ہے کہ ہم اِس کائنات پر غور کریں کیونکہ اِس میں خدا کا قانون کام کر رہا ہے یا کہ خدا کا جو قانون ہے اُس کا ظہور ہے اِس کائنات کے اندر جو کچھ قرآن میں سے ہم اخذ نہیں کر سکتے ہیں وہ اِس کائنات کے اندر (open) ہے عمل میں ہے، (action) میں ہے۔ چنانچہ ایک چھوٹی سی مثال میں نے کبھی بیان کی تھی بلکہ شاید اکثر و بیشتر میں اِس کو بہت پسند کرتا ہوں، وہ یہ کہ دُنیا کے اندر چھوٹے موٹے کچھ جانور ہیں یا کیڑے مکوڑے ہیں جن کی زندگی کو ہم دیکھتے ہیں وہ دو طرح کی ہے کہ وہ پہلے کیڑے ہیں پھر اُس کے بعد پرندے بن جاتے ہیں، یہ بات بہت ہی عجیب ہے اور قابلِ غور ہے۔ گو کہ کیڑا ایک چھوٹا سا جانور ہوتا ہے لیکن اِس کے اندر جو حکمت ہے بڑی عظیم ہے، انسانوں کے لئے اِس میں اِشارہ ہے کہ انسانوں کی زندگی بھی دُہری ہے، ایک رُوحانی زندگی ہے، ایک جسمانی زندگی ہے۔ جسمانی زندگی کو ہم کیڑے سے تشبیہہ دے سکتے ہیں، کیڑے کی زندگی کی طرح ہے اور کیڑا جہاں پروانہ بن جاتا ہے تو اُس پروانے کی زندگی کو ہم رُوحانی زندگی سے تشبیہہ دے سکتے ہیں، رُوحانی زندگی کی تشبیہہ اُس پروانے سے دے سکتے ہیں۔ چنانچہ دُنیا میں جتنے لوگ ہیں جن کو معرفت نہیں ہے اُن کے شعور کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے یعنی وہ کیڑے کی زندگی کو تو سمجھتے ہیں لیکن پروانے کی زندگی تک وہ پہنچ نہیں سکتے ہیں لیکن پروانہ بجائے خود ہے، وہ اِس کو سمجھیں یا نہ سمجھیں تو پروانہ بجائے خود ہے، موجود ہے۔ چنانچہ مومنین کی بادشاہت ہوگی اُن تمام رُوحوں پر جو پروانوں کی طرح ہیں اور جو کیڑے ہیں وہ جہنم میں چلے جائیں گے، تو دونوں باتیں صحیح ہوگئیں، اُدھر اُس اعتبار سے، رُوحانیت کے اعتبار سے بہت سارے لوگوں کو نجات ملی اور خدا نے جیسا وعدہ فرمایا تھا کہ: تمہارا جو دین ہے دُنیا کے ادیان پر غالب آئے گا (۹:۳۳، ۴۸:۲۸، ۶۱:۹) یعنی اسلام، جو سچّا اسلام ہے، جو حقیقی اسلام ہے وہ دُنیا کے باطل اور غلط مذاہب پر غالب آئے گا، یہ فرمایا تھا۔ اِس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ لوگ نہیں ہوں گے اور صرف ایک ہی دین ہوگا اور اُسی دین کے قائم ہونے کو ہم سمجھیں گے کہ یہ دین دُنیا کے مذاہب پر غالب آیا، یہ بات نہیں ہے۔ اِس کا اشارہ لوگوں کی طرف

ہے،لوگوں کی موجوگی کی طرف اِس کااشارہ ہے،تو موجودگی کسی صورت میں ضروری ہوتی ہے اور یہ صورت رُوحانیت میں ہو گی۔ اُس وقت جومومنین ہیں اور خصوصاً جن کاواسطہ علم سے ہے، تعلیم سے ہے، دین شناسی سے ہے، خداشناسی سے ہے، رُوح شناسی سے ہےتو وہ مومنین عالمِ آخرت میں، عالمِ ارواح میں، عالمِ بالا میں یہی کام کاج کریں گے،کون سا کام؟ کہ رُوحوں کو سکھائیں تاکہ اُن کی بادشاہی اُس عالمِ رُوحانیت میں قائم ہوجائے۔

اِس میں اورمزید تشریح کی ضرورت ہے اور اِس سلسلے میں ہمارے دُوسرے (lectures) یا کتابیں آپ کے لئے ممّد ومعاون ثابت ہوسکتی ہیں۔ہماری رُوح کی کتاب میں یہ ہے کہ ہر شخص کے اندر لاتعداد رُوحیں ہیں یا یہ کہ ایک ہی رُوح کے بیشمار ذرّات ہیں تو اتنے سارے ذرّات کیوں ہیں؟ اتنے سارے ذرّات اِس لئے ہیں کہ کل کو یہی ذرّات لوگوں کی نمائندگی کریں گے۔ اِنہی ذرّات کو آپ سمجھیں کہ یہ پروانے ہیں،کون سے پروانے؟ دُنیا کے لوگ جو راہِ راست سے ہٹ کر ہیں، جن کے متعلّق ابھی ابھی ہم نے کہا تھا کہ اُن کی زندگی دُہری ہے، ایک زندگی یہاں ہے اور ایک زندگی اُن کی رُوحانیت میں ہے اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ اِن دونوں زندگیوں کے درمیان معرفت کے ذریعے سے جب (link) نہیں ہوتو اِن کو نقصان ہو جاتا ہے کیونکہ آخرت ایک شعور ہے، ایک شعور کی صورت میں ہے، ایک انا کی صورت میں ہے، ایک خودی ہے، ایک زندگی ہے۔ہم اگر اپنی رُوح کو پہچانتے ہیں تو ہم کو خودی ملے گی، ہم وہاں زندہ ہوجائیں گے اور اگر ہم معرفت کے مقام کو نہیں پہنچتے ہیں تو ہم جہالت ونادانی اور فراموشی کی موت مرجائیں گے اور وہی جہنم ہے۔لہٰذا لوگوں کی جو دُوسری زندگی ہے، اُس کی نمائندگی آپ کے اندر جو بیشمار ذرّات ہیں وہی کریں گے، وہ بیشمار ذرّات اِس لئے ہیں کہ وہ آپ کی سلطنت کو قائم کرنے اور چلانے کے لئے عوام النّاس کی حیثیّت سے ہیں اور دُنیا میں جو عوام النّاس ہیں اور آخرت میں جو لوگ ہیں اِن دونوں میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔دُنیا آخر دُنیا ہے اور آخرت امن کا عالم ہے اور جب سچّا دین دُوسرے ادیان پر غالب آجائے گا تو وہ تمام رُوحیں سچّے دین کو قبول کریں گی اور اِن کو سکھانے کے ساتھ ساتھ آپ کو چار حدود سے تائید ملے گی عقلِ کُل، نفسِ کُل، ناطق، اساس سے اُس وقت آپ کو رُوحانی مدد ملے گی اور آپ اُن کو علمی طور پر تیار کریں گے۔ اِن چار حدود سے جو آپ کو رُوحانی تائید ملے گی اُس کا ذکر قرآن میں موجود ہے اور وہ اِس طرح سے ہے کہ عقلِ کُل سے جو کچھ قوّت آپ پر نازل ہوتی ہے اُس کا نام پانی دیا گیا ہے اور نفسِ کُل کی قوّتوں کا نام دودھ ہے اور ناطق سے جو کچھ آپ کو عالمِ رُوحانیت میں حاصل ہوگا اُس کو شراب کہا گیا ہے اور اساس سے جو آپ کو وہاں نعمت ملے گی اُس کو شہد کہا گیا ہے، تو یہی بہشت کی چار نہریں ہیں (۴۷:۱۵)۔مگر دُنیا کا جو پانی ہے تو وہ دُنیا کا پانی ہے لیکن بہشت کا جو پانی ہے اُس کی تعریف خدانے کی ہے، دیکھیں! اِس بہشت کے پانی کے معیار کو سمجھیں کہ اُس کی تعریف خدانے کی ہے۔دُنیا میں اگر کوئی بادشاہ،،بہت بڑا بادشاہ، کوئی شاہنشاہ کسی چیز کی تعریف کرتا ہے تو اِس سے کیا آپ سمجھیں گے؟ اگر ایک غریب کسی چیز

کی تعریف کرتا ہے تو اُس چیز کا معیار بہت ہی پست ہوگا اور اگر ایک بادشاہ کسی چیز کی تعریف کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ اُس چیز کا معیار بہت ہی بلند ہوگا۔

چنانچہ اگر خداوندِ عالم بہشت کے پانی کی تعریف کرتا ہے تو وہ پانی دُنیا کا پانی نہیں ہوگا۔ پانی دُنیا کا ہو جو بہشت کی نہر میں چلتا ہے اور خدا اُس کی تعریف کرے تو یہ بات بہت ہی عجیب ہوگی کہ خدا نے اِس عام پانی کو اتنا درجہ دیا اور اِس کی اتنی تعریف کی تو اِس میں کوئی منطق نہیں بنے گی، لہٰذا یہ بات صحیح ہے کہ عقلِ کُل کی تائید کو پانی کہا گیا ہے، اِس لئے کہ جس طرح دُنیا کے پانی میں دُنیا کی مادّی زندگی ہے اور دُنیا کی آبادی پانی سے ہوتی ہے اور ہر طرح کی نعمت پانی سے پیدا ہو جاتی ہے اِسی طرح بہشت، تو سب سے پہلے پانی کا ذکر آتا ہے، پانی کی تعریف آتی ہے، اِس لئے کہ عقلِ کُل کا درجہ حدود میں سب سے بلند و بالا ہے اور بہشت کے اندر جتنی آبادی ہے وہ عقلِ کُل کی قوتوں سے ہے۔ پھر اُس کے بعد دودھ کا ذکر آتا ہے، دودھ اشارہ ہے تخلیق کی طرف کہ جس طرح دُنیا کے اندر دودھ سے اولاد کی پرورش ہوتی ہے اور دودھ تولید کی نسل کے بڑھنے اور اُن کی تربیت کی ایک علامت ہے اِسی طرح جنّت کے اندر جس قسم کا دودھ ہے وہ دُنیا کے دودھ سے بہت ہی مختلف ہے اور وہ تخلیق ہے جو نفسِ کُل کا مقام ہے، تو اِس کے بعد شراب کا ذکر آتا ہے، وہ شراب دُنیا کی شراب کی طرح نہیں ہے، وہ بہت پاک و پاکیزہ ہے، اُس کو شرابِ طہور بھی کہا گیا ہے اور وہ شراب ایسی نہیں ہے کہ جس طرح دُنیا کی شراب کے پینے سے جو عقل ہے وہ زائل ہو جاتی ہے اور جو دماغ ہے وہ معطل ہو جاتا ہے لیکن جنّت کی شراب ایسی نہیں ہے، یعنی کہ یہ اشارہ ہے کہ جس طرح ناطق کو وحی نازل ہوتی تھی اور رُوحانی قوّتوں کو آتے تھے اِسی طرح بہشت کے اندر مومنین کو وہ عالم ہوگا، وہ کیفیت گزرے گی، تو اِس کو شراب سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ اِس کے بعد اساس یعنی مولا علیؑ کے درجے کا نام ہے تو شہد کی نہریں یعنی آپ سے مومنین کے لئے تاویل حاصل ہوگی اور شہد کس قدر شیرین ہے، کتنا میٹھا ہے اور اُس میں دوا کا عُنصر بھی ہے کہ خود قرآن نے فرمایا ہے کہ: ”فِيۡهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ “اِس میں عوام کے لئے شفا ہے (۱۶:۶۹) تو جو رُوحیں بیمار ہیں اُن کا علاج اِس رُوحانی شہد سے ہوگا آخرت میں بھی اور دُنیا میں بھی کہ جو تاویل ہے وہ بہت صاف ہے اور بہت ہی شیرین ہے، تو کہنا یہ ہے کہ خداوندِ عالم نے قرآن کے اندر یہ وعدہ فرمایا ہے کہ جو دینِ اسلام ہے وہ دوسرے ادیان پر غالب آئے گا تو میں نے اِس کے بارے میں بتایا کہ اُس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اُس کے لئے دُنیا میں ایک مقرّر وقت ہے، ایک یہ کہ رُوحانیت میں وہ ہمیشہ غالب ہے۔ قرآن میں یہ بھی ارشاد ہے کہ: ”اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ ○ وَرَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا ○ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَاسۡتَغۡفِرۡهُ ۚؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا “(۱۱۰:۱۔۳) جب خدا کی مدد اور نصرت آئی تو آپ دیکھتے تھے کہ دُنیا بھر کے لوگ فوج فوج ہو کے دینِ خدا میں داخل ہو جاتے تھے، تو اِس آیت میں اگر ہم غور کریں تو اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آنحضرتؐ کو عرب کے ملک میں

فتوحات ہوئی تھیں اور آیت کی جو حکمت یا تاویل ہے اُن فتوحات تک محدود ہے، یہ بات نہیں ہے۔ آنحضرتؐ پر جو رُوحانیت کے واقعات گزرتے تھے اُس میں ہوا یہ تھا کہ حضورؐ نے دُنیا والوں کو رُوحانی مشاہدے سے دیکھا کہ سب لوگ ذرّات کی شکل میں دینِ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں، تو حضورؐ نے عالمِ آخرت کو دیکھا اور اُس واقعے کو دیکھا جس کو واقعۂ قیامت کہا جاتا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ رُوحانیت ایک ایسی کیفیت کا نام ہے کہ اُس میں ماضی، حال اور مستقبل ایک ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ہزار برس یا اِس سے بھی زیادہ عرصے میں جو کچھ پیش آنے والا تھا، اُس کو رسولؐ نے اپنے مشاہدے میں اُس وقت دیکھا یعنی جو رُوحانیت میں سب لوگ عالمِ آخرت میں جو سب لوگ دینِ خدا میں داخل ہو جاتے ہیں اُس کو دیکھا۔ ایسا نہیں ہے کہ حضورؐ کو اتنی فتح ہوئی تھی نبوّت کے زمانے میں کہ جس کو خدا کہے کہ سب لوگ آپ کے دین میں داخل ہو رہے تھے، یہ ایک رُوحانی واقعے کی طرف اشارہ ہے جو عام طور پر ہوتا رہتا ہے۔

لہٰذا آپ یہ بات بھی جان چکے کہ رُوحانیت ایک ایسی کیفیت کا نام ہے کہ اُس میں ماضی، حال اور مستقبل ایک ہو جاتا ہے۔ مولائے رومؒ نے اپنی مثنوی کے اندر کسی مقام پر یہ کہا ہے کہ خدا کے وہاں ماضی بھی نہیں ہے اور مستقبل بھی نہیں ہے یعنی (past) بھی نہیں ہے اور (future) بھی نہیں ہے، سب حال ہی حال ہے اور صوفی لوگ کچھ حقیقتوں کو پاتے ہیں تو اُن کو اچھی طرح سے بیان کرتے ہیں، یہ بات بالکل صحیح ہے۔ اِس لئے کہ دیکھیں ماضی کس کا ہوتا ہے؟ (past) کس کا ہوتا ہے؟ جس کی عمر کے لمحات یا عمر کے سال گزر چکے ہوتے ہیں اور (future) کس کا ہوتا ہے؟ اُس کا (future) ہوتا ہے جس کے وہ سال ابھی نہیں آئے ہیں اور نئے واقعات سر سے نہیں گزرے ہیں۔ ماضی کہتے ہیں کچھ واقعات ہم سے گزر کے غائب ہونے کو اور مستقبل اُس کو کہتے ہیں کہ ابھی تک وہ واقعات ہمارے مشاہدے میں نہیں آئے لیکن خدا جو بسیط اور محیط ہے، خدا ایک ایسی طاقت کا نام ہے جو تمام ممکنات پر محیط ہے، حاوی ہے تو اُس کے لئے کیسے ماضی ہو اور کیسے مستقبل ہو؟ تو یہ خدا کے بارے میں بات ہوئی۔ اب اگر کوئی مومن اِسی دُنیا میں رہتے ہوئے یا مر چکنے کے بعد عالمِ رُوحانیت میں جا چکا ہوتا ہے تو اُس کے سامنے وہ تو خدا کے عالم میں ہوتا ہے، وہ تو خدا کے حضور میں ہوتا ہے، وہ تو خدا کے نزدیک ہوتا ہے تو وہاں پر ماضی، مستقبل اور حال، سب چیزیں ایک ہو جاتی ہیں، ایک ہی ہو جاتی ہیں، اِسی کو ازل کہا گیا اور اِسی کو ابد کہا گیا۔ بعض دفعہ ہم ازل کو کچھ اِس طرح سے سوچتے ہیں کہ یہ ایک ایسا ماضی ہے کہ جس کا کوئی سرا نہیں ملتا ہے، ایسا نہیں ہے اور ابد کے متعلق ہم کچھ اِس طرح سوچتے ہیں کہ ابد لاانتہا وقت کا وہ سرا ہے جس تک ہم ابھی (approach) نہیں کر پائے ہیں، اِس طرح ہم سوچتے ہیں۔ یہ تو عام سوچ ہے، یہ خاص سوچ نہیں ہے تو کیا خدا کے حضور میں وقت، زمانہ کوئی ایسی چیز کی طرح ہے جو بہت ہی لمبی ہونے کی وجہ سے اُس کے سرے پر کوئی خدا کا (control) نہیں ہے؟ تو پھر کس (sense) میں خدا کو ہم محیط اور بسیط کہیں گے؟ حالانکہ خدا کے لئے محیط و بسیط بھی ایک بہت معمولی

صفت ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ خدا نے جو اعلیٰ مخلوق بنائی ہیں وہی مخلوق جیسے عقل ہے، نفس ہے یا حدود ہیں، وہ ہی محیط ہیں اور بعض دفعہ تو خداوند اپنے حدود کی صفات کو اپنا لیتا ہے حالانکہ وہ اُن حدود سے بالاتر ہے لیکن لوگوں کو کس طرح سمجھایا جائے تو لوگوں کے پاس کوئی مثال ہے نہیں۔ لوگ اِس طرح سے سمجھتے ہیں کہ اُن کو دُنیا کی کسی چیز سے مثال دیں، اور جو عالمِ آخرت کی حقیقتیں ہیں اُن کے لئے بہت کچھ کر کے اُن کی مثال پیش کی جاسکتی ہے، تو خدا کے حضور میں نہ تو ماضی ہے، نہ مستقبل ہے بلکہ حال ہی حال ہے اور اِسی طرح خدا کے حضور میں جو ازل ہے اور جو ابد ہے وہ یکجا ہے، ایک مقام پر ہے، ایسے میں مومنین اُس کیفیّت کا مشاہدہ کریں گے جس میں کہ اسلام دین باقی ادیان پر غالب آنے والا ہے اور جیسے ہی رُوحانیت میں جائیں گے تو اُس مقام پر یعنی اِن تمام واقعات کو اِن حالات کو وہ دیکھ پائیں گے۔

بات معرفت سے نکلی تھی اور چلتے چلتے ہم آگے آئے، ٹھیک ہے، اِس مضمون کے ربط سے اور موضوع سے یہ باتیں باہر نہیں ہیں چونکہ یہ بہت وسیع موضوع ہے اور بہت عظیم و اعلیٰ بھی ہے لہٰذا معرفت مشاہدات کا نام ہے اور معرفت جیسا کہ آپ کتابوں سے جانتے ہیں کہ اسلام کے اندر معرفت سے بڑھ کر کوئی لفظ نہیں ہے۔ اِس لئے کہ معرفت، حقیقت کو (cover) کرتی ہے، اور حقیقت، طریقت کو (cover) کرتی ہے اور طریقت، شریعت کو (cover) کرتی ہے۔ ایک (western) اسکالر تھا، کبھی یہاں وہ کسی محفل میں آیا، وہ اسلامیات کا ماہر تھا اُس یونیورسٹی کے مطابق جس میں وہ کام کرتا تھا، اُس نے کچھ شریعت پر لیکچر دیا یا اسلام پر لیکچر دیا اور اِس سلسلے میں اُس نے شریعت کو مکمّل قانون قرار دیا۔ کچھ حضرات کے نزدیک یہ بات صحیح ہو سکتی ہے لیکن جو دانشمند ہیں، جو اہلِ حقیقت ہیں اُن کے نزدیک شریعت کامل قانون نہیں ہو سکتی ہے۔ قرآن میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ ہر معیار سے صحیح ہے اور اگر ہم مانتے ہیں کہ قرآن میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے وہ ہر معیار سے اور ہر کسوٹی سے صحیح ہے تو لفظ شریعت کی (root) کو لیجیئے کہ اِس کی (root) کیا ہے؟ اِس کا مصدر کیا ہے؟ کہ دیکھیں یہ "ش۔ ر۔ ع" اِس کی (root) ہے۔ اِس کی (root) تین حرفوں پر مشتمل ہے لیکن اِسی (root) سے ایک شاخ ہے اور وہ "شروع" ہے، "ش۔ ر۔ و۔ ع" اور آپ یقین کریں گے کہ ایک (root) سے جتنے الفاظ بنتے ہیں تو اُن لفظوں کے آپس میں رشتہ ہوتا ہے، معنوی رشتہ ہوتا ہے۔ پس شریعت جو لفظ ہے اِس کا رشتہ ہے شروع کے ساتھ اور ویسے بھی صوفیوں نے جس طرح اِن چار منزلوں کی وضاحت کی ہے، اُس سے بھی یہ پتا چلتا ہے کہ شریعت شروع کا نام ہے اور طریقت رستے کو اختیار کرنے کا نام ہے۔ ابھی شریعت راستہ بھی نہیں ہے، وہ ابتدائی قسم کی تیاری ہے، وہ شروع کی نوعیت کی چیز ہے اور حقیقت اِس سے آگے ہے اور معرفت جو ہے وہ انجام کار ہے۔ اِس کے علاوہ حدیثوں کو چھوڑ کے قرآن ہی میں آپ کو ایک آیت ملے گی اور اُس میں "شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا" کہا گیا ہے، "جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا" (۴۸:۵) اور ہم نے ہر ایک کو ایک شریعت اور ایک طریقت بنایا ہے۔ یعنی مطلب اِس کا یہ ہوا کہ آج جس طریقت کا تذکرہ چلتا ہے وہ طریقت آج

سے نہیں ہے، یہ زمانہ آدم سے ہے یعنی پیش رفت اور ترقّی وارتقاء ہر دین میں رہا ہے، ہر پیغمبر کے زمانے میں یہ چیز رہی ہے کہ پہلے تو شریعت ہوتی ہے، پھر اُس کے بعد طریقت۔ اب اگر اتنا کچھ قرآن میں ہے کہ شریعت کے علاوہ بھی کوئی چیز ہے تو ہمارے لئے اور لوگوں کو سمجھانے کے لئے کافی ہے اور ہوسکتا ہے کہ کسی اور آیت میں تیسری منزل کا بھی ذکر ہو اور چوتھی منزل کا بھی ذکر ہو حالانکہ لوگ شریعت کو قانونِ کُل مانتے ہیں اور سب کچھ مانتے ہیں۔ آپ کو یہ جو میں نے کہا یہ ترجمے میں، میں آپ کو بتاؤں گا کہ ''شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا'' (۴۸:۵) میں ایک مترجم نے اِس طرح سے ترجمہ کیا ہے کہ شریعت اور طریقت اور اُس کا نام لیں گے یہ ایک سنّی عالم گزرے ہیں اشرف علی تھانوی، اُس کے ترجمے کو آپ لیں، انڈیکس سے نہج کو لیں، 'ن' 'ہ' اور 'ج'، تو انڈیکس آپ کو وہ آیت جو ہے بتائے گا اور دیکھیں نہج طریقے کو کہا جاتا ہے، رستے کو کہا جاتا ہے اور مولا علیؑ کی ایک عظیم کتاب کا نام 'نہج البلاغہ' ہے، یعنی رستے کے نام سے اور رستے کے نام پر اُس کا نام رکھا گیا ہے تو اِسی سے منہاج ہے۔

کہنا یوں ہے کہ معرفت انتہائی عظیم لفظ ہے اور معرفت کو آپ اچھی طرح سے ذہن نشین کرلیں کہ معرفت نہیں کہا جاتا ہے مگر مشاہدات کے نتیجے کو۔ اگر اِس معرفت کو دُنیاوی مثال میں لیں اور اِس کو پہچان، کیونکہ اِس کا (literal) ترجمہ جو ہوتا ہے پہچان ہوتا ہے تو آپ جن چیزوں کو نہیں پہچانتے ہیں اور جس شخص کو آپ نہیں پہچانتے ہیں اُس کے متعلّق آپ پہچان کا جو لفظ ہے اُس کو (use) نہیں کرسکتے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ میں اُس کو پہچانتا ہوں، تو اِس کے یہ معنی ہوں گے کہ آپ نے اُس کو اچھی طرح سے دیکھا بھالا ہے اور یہاں جو (sense) ہے یا جو اصطلاح ہے وہ کچھ اِس طرح سے ہے کہ دین کی اعلیٰ حقیقتوں کو کیا بلکہ خدا کے بھیدوں کو بلکہ خدا کو دیکھنے، خدا کے دیدار کرنے اور رُوحانیت میں اُس کو پہچاننے کے معنی میں معرفت ہے۔ یہ سوال الگ ہے کہ خدا کا دیدار کس طرح ہوتا ہے؟ یا تو وہ نمائندگی کی صورت میں ہوتا ہے یا خدا کا کوئی اپنا رُوپ ہے یا یہ کہ ہماری رُوح جو ہے اُس میں یہ صلاحیت ہے کہ رُوح جو ہے وہ خدا کا رُوپ دھارتی ہے۔ اگر خدا نے رُوح کو اِن صلاحیتوں کے ساتھ بنایا ہے تو اِس میں کوئی قباحت نہیں ہے، اِس کی تعریف خدا کو پہنچتی ہے کہ خدا نے ایک رُوح بنائی، ایسی رُوح بنائی اور اُس میں اِس قدر صلاحیتیں موجود ہیں، اُس میں اِس قدر امکانیتیں ہیں کہ وہ یعنی اپنے وقت پر خدا کا رُوپ دھار سکتی ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ خدا اُسی رُوح کے رُوپ میں ظہور فرما ہوتا ہے، جلوہ گر ہوتا ہے یا یہ کہ انسانِ کامل اور امامؑ ہے وہ خدا کا دیدار ہے۔ یہ بحث الگ ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم اِس مسئلے کو ٹالنا چاہتے ہیں، یہ بات نہیں ہے کیونکہ فی الوقت مشاہدے کی بات چل رہی ہے اور یہ میں بتلا رہا ہوں کہ معرفت نام ہے مشاہدات کے نتیجے کا یعنی شناخت۔ آپ اِس لفظ کو اچھی طرح سے یاد کریں کیونکہ بعض دفعہ ہماری باتیں جو ہیں وہ (lesson) کی طرح چلتی ہے اور بڑی ذمہ داری سے بات کی جاتی ہے اور میں اُمید رکھتا ہوں کہ آپ بھی ذمہ داری سے سُن لیتے ہیں تاکہ ہر

بات ذہن نشین ہو جائے تا کہ بات جو ہے پکّی ہو جائے اور وقت گزارنے، وقت ٹالنے اور شغل کو مکمّل کرنے کی مجلس ہوتی نہیں ہے۔ اِس لئے مشاہدات کی بات ہے اور کئی بار ہم کہہ چکے ہیں اور لکھ بھی چکے ہیں کہ معرفت سب سے بڑا لفظ ہے اور سب سے بڑی اصطلاح ہے کہ اِس میں سب باتیں آتی ہیں۔

اب اِس مقام پر اِس مطلب کو بھی میں دُہرانا چاہتا ہوں کہ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ چلو جی ازل کو، ابد کو کس نے پایا ہے اور لوح و کُرسی کو کس نے دیکھا ہے، لوح وقلم کو اور بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کو جاننے کے لئے کوئی راستہ نہیں ہے لیکن ایسے لوگ زبانی طور پر معرفِ خدا کا اقرار کرتے ہیں، تو اِس میں تعجّب ہوتا ہے۔ تعجّب اِس معنیٰ میں ہوتا ہے کہ خدا نے اپنی معرفت کو تو ممکن بنا دیا اور اِس کے علاوہ بہت سارے بھید ایسے رکھے ہیں کہ اِن کے جاننے کے لئے کوئی رستہ نہیں، اگر یہ بات ہو، اِس کو قبول کیا جائے تو بڑا تعجّب ہوگا یہ بات نہیں ہے۔ خدا سے بڑھ کر کوئی شئ عظیم نہیں اور ''اللہ اکبر'' ہر لحاظ سے خدا کی شان ہے کہ وہ ہر طرح سے عظیم ہے اور سب سے بڑا ہے۔ ہر بھید سے اُس کا بھید بڑا ہے، ہر ہستی سے اُس کی ہستی بڑی ہے، ہر شان سے اُس کی شان عظیم ہے اور ہر مرتبے سے اُس کا مرتبہ عظیم ہے۔ اِس لئے ''اللہ اکبر'' کہا گیا اور اُس کی تعلیم دی گئی تو پھر خدا کے بھید سے بڑھ کر اور کون سا بھید ہو سکتا ہے؟ تو میں یہ وضاحت اِس لئے کر رہا ہوں کہ معرفت میں سب کچھ سمو جاتا ہے اور جہاں معرفت ہے وہاں پر سب کچھ ہے اور سب کچھ ہے اور کوئی شئ باقی نہیں ہے۔ ایک چیز میں یہ بتانا چاہوں گا کہ پیر ناصرِ خسروؒ نے ''گشائش و رہائش'' کے نام سے ایک رسالے کے اندر جہاں اُس نے امر کا ذکر کیا ہے کہا ہے کہ: اگر خدا اپنی رحمت کو، قدرت کو ظاہر کرنے کے لئے بہت سی چیزیں بناتا تو پھر اُس کی توانائی میں، اُس کی قدرت میں کمزوری آتی۔ کیا ہم اِس کو باور نہیں کریں گے کہ خدا کے حضور میں جس طرح خدا ایک ہے، اُس طرح اُس کے سامنے اُس کی ایک قدرت ہے وہ امر ہے، کلمۂ کُن ہے اور اُسی کلمۂ کُن میں سب کچھ ہے، سب کچھ ہے، سب کچھ ہے اور کوئی شئ اِس کلمۂ کُن سے باہر نہیں۔ جب ہم باور کرتے ہیں کہ خدا نے جب چاہا تو کُن فرمایا اور کُن فرمانے کی تشریح الگ ہے، کبھی آپ سوال کریں تو کُن فرمانے کے ساتھ ساتھ یہ جو کائنات ہے وجود میں آئی، اتنی ساری کائنات یہ تو مادّیت کی بات ہو گئی، مادّیت میں تو یہ ہونا چاہئے لیکن رُوحانیت میں جہاں مکان نہیں ہے، جہاں مادّہ نہیں ہے، (matter) نہیں ہے تو اُس ایک چیز کو (expand) کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا خدا کی سب سے بڑی قدرت یہ نہ ہوتی کہ تمام چیزیں جو ہیں یکجا کرے اور ایک ہی چیز میں تمام مقاصد کو سموئے؟ تو یہ صحیح ہے اور پیر ناصرِ خسروؒ کی وضاحت ''گشائش و رہائش'' میں اِس طرح سے ہے۔ اِس کے مطابق میں آپ کو ایک آیت کی طرف لے جاتا ہوں وہ یہ کہ جنّت کی (definition) یہ کی گئی ہے کہ: ''اُس میں مومنین جو کچھ بھی چاہیں گے وہ مہیّا ہو جائے گا'' (۳۵:۵۰) وہ چاہیں گے کی (definition) کُن کے ساتھ اِس کی وابستگی ہو جاتی ہے کیونکہ جنّت میں مومنین کا جو منشاء ہے وہ منشائے الٰہی کے ساتھ

ایک ہو جائے گا یا مومنین کا جو ارادہ ہے اُن کے ارادے کے ساتھ ایک ہو جائے گا اور خدا کا ارادہ جو ہے یعنی کُن فرمانا ہے۔ خدا کے ارادے میں، خدا نے لفظی طور پر نہیں فرمایا کہ ہو جا، خدا نے ارادہ کیا تو وہ ہو گیا تو خدا کے ارادے میں سب کچھ ہے۔ مولا سلطان محمّد شاہ صلوات اللہ علیہ نے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے، خدا کے ارادے [کی طرف]۔ ترجمہ کرنے والوں نے شاید خیال کہا ہو لیکن میرے خیال میں، میری دانست میں وہاں ارادے کا ذکر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی ارادے کو اُنہوں نے خیال کہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اُس میں خیال کا ذکر ہو۔ بہر حال مقصود ارادہ ہے اور امامؑ نے فرمایا کہ: "خدا ارادے سے کام کرتا ہے" [اسلام میرے موروثوں کا مذہب ص: ۱۶] تو جہاں بہشت میں مومنین خدا میں فنا ہو جائیں گے اور فنا کا کیا مطلب؟ اپنے تصرُّفات سے دست بردار ہو جانا عملاً، یہ فنا ہے، کیا مطلب؟ ہمارے اندر جو خواہشات کام کرتی ہیں وہ غلط کام کرتی ہیں، اِن خواہشات پر خدا کا (control) ہو، تصرُّف معنی (control)۔ وہ اپنے قبضۂ قدرت میں یہ سب چیز لے لے اور ہم اس کے اہل ہو جائیں، اِس قابل ہو جائیں تو یہ فنا ہے جس طرح ایک حدیث کے اندر ہے کہ: زائد اور (extra) عبادت میں مومن اِس قدر کوشان رہتا ہے کہ ایک دن میں اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں تو وہ مجھ سے دیکھتا ہے۔ کان بن جاتا ہوں، وہ مجھ سے سنتا ہے۔ زبان بن جاتا ہوں، مجھ سے بولتا ہے اور ہاتھ بن جاتا ہوں، مجھ سے پکڑتا ہے۔ پاؤں بن جاتا ہوں تو مجھ سے چلتا ہے۔

اِس کے یہ معنی ہیں کہ خدا ہمارے اندر جو قوتیں ہیں اُن پر تصرُّف کرتا ہے، تصرُّف معنی استعمال کرتا ہے ایک مقام پر، اب نہیں۔ اُس وقت ہمارا ارادہ خدا کے ارادے میں فنا ہو چکا ہوتا ہے، تو اُس وقت خدا چاہتا ہے یا ہم چاہتے ہیں، ہمارا جو منشاء ہے، ہمیں جو چاہنا چاہئے وہ خدا چاہتا ہے۔ کیا یہ اچھا نہیں ہے کہ ہماری جگہ پر، ہماری خاطر خدا چاہے کیونکہ اگر ہماری چاہت باقی اور برقرار رہی تو ایک تو یہ اس میں نقص ہو گا کہ ہمارا چاہنا جو ہے محدود ہو جائے گا کہ خدا کی بادشاہی میں کیا کیا ممکن ہے اُس کو نہیں پائیں گے اور اگر ہماری انا الگ رہی، ہمارا ارادہ خدا کے ارادے میں فنا نہیں ہوا تو ہم غلط بھی سوچ سکتے ہیں۔ اِس لئے کیا ہی اچھا ہے کہ ہمارا ارادہ وہاں خدا کے ارادے میں فنا ہو چکا ہو گا اور نہ معلوم اُس وقت ہماری خودی کیسی ہو گی؟ اِس کے لئے الگ بات کریں گے۔ بہر حال خدا جب چاہے گا تو خدا کا چاہنا کُن فرمانا ہو گا اور کُن فرمانے میں اتنا (power) ہے کہ اُس سے ایک پوری کائنات جنم پاتی ہے، تو اُس وقت یعنی ہمارے سامنے ہر جلوہ ہو گا، ہر چیز ہو گی، ہر واقعہ ہو گا اور ہر نعمت ہو گی۔ اب یہاں ٹھہر کے ایک مفروضہ پیش کرتے ہیں۔ خیال میں نہیں پہلے کچھ اس طرح سے تھا کہ بہشت ایک (open) جگہ ہے اور ہر چیز تیار ہے تو بہت وسیع جہان ہے اور اُس میں ہر قسم کی نعمتیں سجی ہوئی ہیں، درخت ہیں، باغ ہیں، صحیح تو ہے! لیکن اِس میں ذرا فرق ہے یا اِس کو یوں سوال میں ڈھالیں کہ بہشت کیا ظہورات اور مختلف جلوؤں کی شکل میں سامنے آئے گی یا کہ (open) بالکل بے جان پڑی پڑی مَری ہوئی چیز کی طرح؟

بہشت تو جس طرح خدا کے جلوؤں کا تصوّر رہے یعنی ہر آن میں اور ہر لحظہ میں جو ہم چاہیں گے اُسی جلوے میں بہشت سامنے ہوگی۔ آپ نے سمجھا؟ بہشت کی یہ صورت ہے اور اگر بہشت پڑی پڑی اور بے حس وحرکت اور خاموش چیز ہوگی تو ہم اُس کو مُردہ خیال کریں گے جس طرح دُنیا کی چیز جو بنائی ہیں، جس طرح بنائی ہیں وہ اُس طرح پڑی ہیں۔ اُس کی رنگت میں، اُس کی شکل میں، اُس کی بُو میں اور اُس کی چیز میں فرق نہیں ہے اور آہستہ آہستہ کچھ وقت گزرنے کے بعد اُس میں تبدیلی آتی ہے، یہ تو ایک قسم کی مُردگی ہوگئی۔ بہشت ایسی نہیں ہے وہ مختلف جلوؤں کی صورت میں ہے یعنی ہم جیسے چاہیں گے وہی چیز ہمارے سامنے آئے گی اور آیات کا اشارہ اِس قسم کی بہشت کی طرف ہے، وہ مری پڑی بہشت کی طرف نہیں ہے۔ ہمارے مرتبے کے مطابق، ہماری چاہت کے مطابق یا خدا جو ہماری جگہ پر چاہے گا اُس کے مطابق ہمارے سامنے گونا گون جلوے ہوں گے۔ ہم جس جلوے کو چاہتے ہیں، ازل کے کسی جلوے کو چاہتے ہیں یا ابد کے کسی جلوے کو چاہتے ہیں، زمانۂ آدم کے واقعات کو چاہتے ہیں، موسیٰ کے واقعات کو چاہتے ہیں، ابراہیم کے زمانے کو چاہتے ہیں، عیسیٰ کے معجزات کو چاہتے ہیں، رُوحانیت کی کسی چیز کو چاہتے ہیں، تخلیق کے کسی بھید کو چاہتے ہیں اور جو چاہیں گے وہی واقعہ، وہی چیز، وہی صورت ہمارے سامنے، وہی روشنی، وہی رنگ ہمارے سامنے ہوگا۔ ایسا نہیں کہ وہ مادّی چیز کی طرح ہو اور یہ ظہورات جو ہیں ارادۂ الٰہی سے وابستہ ہیں اور اِس کا ذکر کلمۂ کُن میں ہے تو کلمۂ کُن میں یہ سب چیزیں ہیں اور اِس معنیٰ میں پیر ناصرِ خسرو ؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: خدا کی حکمت، سب سے بڑی قدرت یہ ہے کہ اُس نے ایک ہی چیز کے اندر ساری چیزیں سمودی ہیں اور مثال کے طور پر ہمیں سمجھنا چاہئے کہ خدا نے اگر اِس کائنات کو کُن سے پیدا کیا ہے تو اِس کُن کے اندر امکانی طور پر یہ جو کائنات ہے یہ سموئی ہوئی تھی۔ ماں باپ سے کوئی بچہ، کوئی اولاد پیدا ہوتی ہے تو امکانی طور پر یہ اولاد اُن میں موجود ہوتی ہے۔ درخت کے کسی بیج سے ایک عظیم درخت پیدا ہوتا ہے تو ایک طرح سے بحدِّ قوت اُس بیج کے اندر اتنا عظیم درخت سمویا ہوا ہوتا ہے، اِس طرح کلمۂ کُن میں تمام چیزیں سموئی ہوئی ہیں۔ جس طرح ہم نے کبھی بتایا تھا کہ اسمِ اعظم میں یہ سارا قرآن، اِن تمام آیات کے ساتھ سمویا ہوا تھا اور اِسی اسمِ اعظم سے قرآن کا ایک ظہور ہوا اور اُس ظہور کی ایک مادّی شکل اور مادّی صورت دی گئی، تو مادّی چیز جو ہوتی ہے وہ اِسی طرح خاموش ہوتی ہے اور پڑی رہتی ہے لیکن رُوحانی چیز جو ہے، اُس کے جلوے جو ہیں یعنی بار بار اُس کے جلوے بدلتے رہتے ہیں اور دل کی کیفیت کے مطابق اور چاہت کے مطابق اور مصلحت کے مطابق رُوح کے جو جلوے ہیں، رُوحانیت کے جو جلوے ہیں، بہشت کے جو جلوے ہیں وہ ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔ اب میں یہاں رُکوں گا اور اگر اِس سلسلے میں کوئی سوال ہو تو وہ کیا جاسکتا ہے۔ مہربانی، یا علی مدد۔

اِنہوں نے پوچھا کہ دین کے اندر، دین کی تعلیمات میں نیّت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، اِنہوں نے صحیح کہا اور پھر انہوں نے پوچھا کہ اگر یہ مانا جائے کہ دوزخیوں کو وہاں دوزخ کے اندر جو عذاب دیا جاتا ہے وہ بھی اُن کی مجبوری کی

عبادت ہے تو کیا اُس میں اُن کی نیت کچھ کام کر سکے گی؟ اِس میں یہ کہوں گا کہ وہ مجبوری کی جو چیز ہے، اِس کو اضطراری کیفیّت کہتے ہیں تو اُس میں نیّت شامل نہیں ہو سکتی ہے اور جب کوئی حکومت کسی مجرم کو سزا دیتی ہے اور وہ مجرم سزا کاٹتا ہے، سزا جھیلتا ہے، اُس کی نیّت حکومت کی خوشنودی نہیں ہوتی ہے، وہ مجبوری کی سزا پاتا ہے۔ اِسی سے حکومت کا جو مقصد ہے وہ ایک طرح کی اصلاح ہو جاتی ہے، تو آپ اپنے بچّے کو مارتے ہیں، پیٹتے ہیں، وہ تابعداری کرتا ہے تو نیّت سے تابعداری نہیں کرتا ہے، چوٹ سے ڈر کے تابعداری کرتا ہے، آپ اُس کو مجبور کرتے ہیں۔ اِس میں نیّت نہیں ہے اور اگر وہ اپنی نیّت سے، چاہت سے مانتا تو پھر نیّت جو ہے اُس کی صحیح ہوتی، یہ ہے اور باقی جہاں نیّت کی اہمیت ہے وہ ایسا ہے کہ اِس میں تین مراحل ہیں۔ سب سے پہلے نیّت ہے، اُس کے بعد قول ہے، اُس کے بعد عمل ہے، ہے نا؟ تو کیا کہنا چاہیئے؟ نیّت درخت کی جڑوں کی طرح ہے اور جو قول ہے وہ درخت کی برانچ سے ہے اور جو عمل ہے وہ پھل ہے اور پھل کا قیام برانچ پر ہے اور برانچ کا قیام جڑوں پر ہے اور درخت کی جڑیں کھوکھلی ہوں تو پھر وہ کیڑے کھا گئے ہوں یا اُس میں کوئی بیماری پیدا ہوئی ہو تو پھر وہ پھل نہیں دے گا اور درخت سوکھ جائے گا یا یہ ہے کہ وہ گر جائے گا۔ ہَوا کے آنے کے ساتھ ساتھ یا زمین کو پانی دینے کے ساتھ ساتھ یا اُس کو ہلانے کے ساتھ ساتھ یا سخت گرمی کے موسم کے آنے کے ساتھ ساتھ درخت گر جائے گا۔ پھل دینا تو کہاں؟ اچھا اُس میں پھل اوّل نہیں لگے گا اور اگر لگ بھی جائے تو پھل جو ہے وہ سوکھ جائے گا یا وہ بہت کمزور ہو جائے گا یا اُس میں مغز نہیں ہو گا تو یہ سب باتیں جو ہیں پھر یعنی کہ دہقان یا زمیندار جانتا ہے صحیح ہے اور عقل کے نزدیک بھی یہ بات روشن ہے، لہٰذا نیّت جو ہے بہت بڑی ہے۔

اب ذرا نیّت کے دُوسرے الفاظ کو لیں، نیّت سے مُراد چاہت، نیّت سے مُراد ارادہ، نیّت سے مُراد دل کی کیفیّت، نیّت سے مُراد خدا کی دوستی کو چاہنا، اُس کی خوشنودی کو چاہنا، نیّت کی مُراد دل کی صفائی۔ دیکھیں آپ اِس نیّت کے مترادفات کو لیں تو کتنی اچھی وضاحت ہو گی، نیّت کیا ہے؟ دل کی کیفیت اور دل کی کیفیت میں بہت سے معانی اور بہت سے مطالب آجاتے ہیں، تو اِس کا ایک قریبی جو ہم معنی لفظ ہے وہ ارادہ ہے، چاہنا ہے ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ'' پیغمبر نے اِسی حدیث کو [جو] کسی حدیث کی کتاب میں بنیادی طور پر، شروع ہی میں آتی ہے یہ ہے ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ''۔ اعمال کا انحصار، اعمال کا دارومدار جو ہے نیات رنیتوں پر ہے، نیات پر ہے، نیات جمع ہے اُردو ترجمے میں۔ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے یعنی نیّت صحیح ہے تو اعمال صحیح ہیں، نیّت غلط ہے تو اعمال غلط ہے اور اِسی کو ہم دُوسری حدیث میں منتقل کریں گے، (transfer) کریں گے۔ ''اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ'' دین ایک خیر خواہی کا نام ہے۔ [قُلْنَا لِمَنْ؟ قَالَ: لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهِ وَلِرَسُوْلِهِ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ] پوچھا گیا خیر خواہی کس کی؟ تو رسولؐ نے فرمایا: خیر خواہی خدا کی، خیر خواہی رسول کی اور خیر خواہی اماموں کی اور خیر خواہی مومنوں کی، بس یہاں پر ختم ہو گیا، تو خیر

خواہی یعنی نیکی چاہنا، بھلائی چاہنا۔ ہمارے دل کے اندر نیک اِرادے ہوں، حالانکہ نصیحت ہم عام لفظ میں دُوسروں کو سمجھانے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور یہاں خدا کے لئے نصیحت تو یہ (literal meaning) میں [کہا] گیا نا؟ خدا کے لئے خیر خواہی یعنی خدا کے معاملے میں اچھا چاہنا اور اچھا چاہنا یہ کہ خدا جو چاہتا ہے وہ ہو تو پھر یہ نیّت پر آ گیا۔ خدا کی جو رضا ہے، خدا کا جو منشاء ہے، خدا کا جو اِرادہ ہے وہ ہو ہم سے۔ ''اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ'' اِس کی تشریح جو ہے یہ نیّت سے مل گئی، تو رسولؐ کا بھی وہی ہوگا نا جو خدا چاہتا ہے، امامؑ کا بھی وہی ہوگا نا، مومنین کا بھی وہی ہوگا نا تو ایک ہی ارادہ ہے، الگ الگ ارادے ہوں تو اِس میں ٹکراؤ ہو جائے گا اور کوئی ایک ارادہ وہ پورا نہیں ہوگا، تو مطلب یہ ہے کہ یہ جو خدا کا چاہنا ہے یا جو خدا کا ارادہ ہے جس نے اِس کائنات کو پیدا کیا اور خدا سے جتنی طاقتیں منسوب ہیں اُن میں اِرادہ، اِرادۂ الٰہی کو سب سے اعلیٰ درجہ حاصل ہے انسان کے لئے اور مفید بھی یہی ہے کہ ہم اُسی کو چاہیں جو خدا چاہتا ہے، تو اِس اِرادے کو خدا نے کسی کتاب کے ساتھ وابستہ نہیں کیا۔ اِرادۂ الٰہی اگر کتاب سے وابستہ ہو جاتا تو یہود اور نصاریٰ (right) ہوتے، اُنہوں نے کہا تھا کہ یہ کتاب ہمارے پاس ہے۔ اگر اُس کتابِ الٰہی میں ایک ایسا (set) قانون ہوتا، (set) قانون کہ اُسی کے مطابق چلنے سے خدا کی خوشنودی ملے تو پھر رسولِ اکرمؐ کی آمد پر، اُس کی بعثت پر اُن کو دعوت دینے کا کیا مقصد؟ جتنے بھی بڑے بڑے پیغمبر دُنیا میں آئے ہیں وہ کتابوں کے ساتھ آئے ہیں لیکن خدا کی خوشنودی کتاب سے وابستہ نہیں ہے اور خدا کی خوشنودی جو ہے وہ زندہ ہادی سے وابستہ ہے۔ اب اسلام کی جو (definition) ہے وہ مختلف ہے، (literal meaning)، اسلام کی ایک (definition) یہ ہے کہ اسلام معنی جس بات کے لئے ہمارے آباؤ اجداد نے قبول کیا ہے اُنہی کی تقلید کریں، یہ اسلام نہیں ہے۔ ہمارے زمانے کے اندر جو بھی ہم سے منوانے اور اطاعت کروانے کے لئے جو کچھ فرمایا جائے گا اور اُس کو ہم قبول کرتے ہیں تو یہ اسلام ہے۔ اسلام معنی تسلیم کرنا، اسلام کے ایسے بہت معنی ہیں، اسلام معنی تسلیم کرنا۔ ''وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا'' (۶۵:۴) یعنی تسلیم، اپنی منشاء کو سونپنا، گردن جھکانا، تابعداری کرنا تو اِس دین کا نام اسلام کیوں ہے؟ کس (sense) میں ہے؟ اِس لئے کہ ہر بار ہمارے سامنے انفرادی طور پر کسی چیز کو قبول کریں۔ ہمارے آباؤ اجداد نے جو امتحان سے گزر کے جو ہمارے لئے روایت چھوڑی ہے اگر ہم اُس روایت کے مطابق چلتے ہیں تو یہ کُلّی طور پر اسلام نہیں ہے، یہ تو اُن سے امتحان ہو گیا نا، تو اُن کا اسلام ہو گیا نا۔ ٹھیک ہے، ہم اپنے آباؤ اجداد کے نقشِ قدم پر دین کے معاملے میں چلتے ہیں تو صحیح ہے لیکن آپ سوچیں کہ اگر اسلام کے معنی اطاعت کے ہیں اور فرمانبرداری کے ہیں تو اِس فرمانبرداری کو ہر فرد پر اپنی زندگی میں واقع ہونا چاہئے، کوئی فرمانبرداری کرتا ہے یا نہیں کرتا ہے، قبول کرتا ہے یا نہیں کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یعنی اسلام زمانہ آدم سے تھا تو ہر زمانے کے لوگوں کے سامنے ایک نئی چیز، نیا حکم اور نئی شریعت اور نئی طریقت، نئی حقیقت اور نئی باتیں آتی رہی ہیں تاکہ خدا یہ دیکھے کہ لوگ مانتے ہیں یا نہیں اور اُن پر ظاہر کرے، یہ ہے اسلام کے معنی،

ماننے کے ہیں اور ذاتی طور پر ماننے کے ہیں۔

سوال: سر! نہج البلاغہ میں یہ ذکر ہے کہ وہی غیب کا جاننے والا ہے اور اپنی غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا مگر جس پیغمبر کو وہ پسند کرے۔سر! اِس کا مطلب یہ ہوا نہ کہ کسی پیغمبر کو غیب کی بات کسی کو ملی اور کسی کو نہیں ملی اور دوسرا اِس میں پیغمبر کے درجات کی بات بھی ہے۔

جواب: پیغمبر کے درجات ثابت ہونے کے علاوہ اِس میں ایک اور بات تحقیق طلب ہے کہ جن پیغمبروں پر جو کچھ وحی نازل ہوتی ہے تو وہ وحی یا وہ ہدایات یا وہ تعلیمات جب تلک اُن کے پاس نہیں پہنچتی ہیں تو وہ پردۂ غیب میں ہوتی ہیں اور پھر جب وہ چیزیں ظہور پذیر ہو جاتی ہیں تو اُس وقت وہ چیزیں غائب نہیں کہلا سکتی ہیں، ظہور میں جب آتی ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ تو ایک کہنے کا طریقہ ہے، نہیں تو غائب کا رُخ جو ہے وہ ظاہر کی طرف ہے قرآن میں ایسی بہت سی آیات آپ کو ملیں گی جیسا کہ: ”وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ“ (۱۸۹:۳) اور اِس کائنات کی بادشاہی خدا کی ہے، اِس کا یہ مطلب نہیں ہوتا ہے کہ خدا اپنی بادشاہی کسی کے لئے دینا نہیں چاہتا ہے۔ ”بِيَدِكَ الْخَيْرُ“ (۲۶:۳) یعنی تیرے ہاتھ میں یعنی نیکی ہے، بلکہ یہ صرف ملکیت کی بات ہے، بادشاہی کی بات ہے۔ آیت ہے کہ: ”تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۖ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۖ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۖ“ (۲۶:۳)، تُو ہی بادشاہی دیتا ہے جس کو تُو چاہتا ہے اور تُو ہی عزت دیتا ہے کہ جس کو چاہتا ہے اور تُو ذِلّت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، تیرے ہاتھ میں خیر ہے، بھلائی ہے۔ اگر اِس بادشاہی سے فرعون اور نمرود کی بادشاہی مُراد لیں تو پھر خدا نے اُس کی تعریف کی اور گویا کہ خدا نے جو فرعون کو بادشاہی دی تھی تو اُس پر اُس نے احسان کیا تھا اور اُس کے سوا اور کوئی بادشاہی اگر نہیں ہے تو اور اِسی بادشاہی کی طرف ترغیب دینا چاہتا ہوگا اگر ہم مانیں کہ اِس بادشاہی سے دُنیا کی بادشاہی مراد ہے، تو یہ بادشاہی دُنیا کی بادشاہی نہیں ہے، رُوحانی سلطنت ہے، تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ خدا کے حضور میں، خدا کے ہاتھ میں جو کچھ ہے وہ صحیح ہے، خدا ہی کی ہے لیکن خدا دینے والا ہے۔ خدا کے جتنے نام ہیں اُن تمام میں نوازشات کے معنی ہیں، مہربانی کے معنی ہیں، دینے کے معنی ہیں اور نوازنے کے معنی ہیں۔ لہٰذا غیب کا جہاں ذکر ہے صحیح ہے، جب کوئی علم مومنین کے پاس نہیں آتا ہے تو وہ غیب میں ہے لیکن جب اُن تک وہ علم آتا ہے تو وہ غیب ہی سے آتا ہے، تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ غیب جو ہے غیب نہیں رہتا۔ اُس کا رُخ یا کہ اُس کا رُجحان جو ہے وہ ظہور کی طرف اور ظاہر کی طرف ہے اور خدا یعنی اِس میں، اِس آیت میں صاف صاف فرمایا گیا کہ خدا اپنے غیب پر مطلع کرتا ہے پیغمبر کو اور جو مومنین پیغمبروں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوں تو، اور آنحضرتؐ کی ذاتِ اقدس کو اُسوۂ حسنہ قرار دیا گیا، بہترین نمونہ اور بہترین نمونۂ اعمال اور بہترین نمونۂ ارتقا اور بہترین نمونۂ نوازشاتِ ربی اور آپ انسانیت کے لئے اور خصوصاً مومنین کے لئے نمونہ ہیں، تو پھر اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ حضور کے نقشِ قدم پر وہاں

تک جانا ہوگا جہاں تک کہ آپ گئے تھے۔

سوال: صاحب! یہ رُوح جسم میں کیسے داخل ہوتی ہے اور کیسے نکلتی ہے؟

جواب: اِس کے لئے آپ رُوح کی کتاب پڑھیں، اُس میں اِس سلسلے کے بہت سے سوالات کا جواب دیا گیا ہے۔آپ نے رُوح کی کتاب کا مطالعہ کیا ہے؟ ابھی نہیں کیا ہے، نہیں کیا ہے نا! ۔اُس میں آپ کے اِس سوال کا جواب ہے اور بہت تفصیل سے ہے۔ابھی ہی لینا اور اُس کو پڑھنا شروع کرنا۔

سوال: خداوند تعالیٰ نے کلمہَ کُن پیدا کیا جس میں اُس نے پوری کائنات کو سمویا ہوا ہے۔اگر ہم کہیں کہ کلمہَ کُن خدا کا ارادہ ہے تو اِس کی [کچھ وضاحت فرما دیجئے]؟

جواب: ابھی میں نے کہا تھا مجھے یاد ہے کہ، مجھے یاد ہے کہ کلمہَ کُن کی تشریح الگ ہے۔میں نے کہا تھا اور آپ نے ’’میزان الحقائق‘‘ کو پڑھا ہوگا، اُس کے اندر کلمہَ کُن کا کچھ ذکر آتا ہے اور وہ ذکر اِس طرح سے ہے کہ وہ لفظ میں نہیں ہے۔ اِس کے علاوہ مجھے یاد آتا ہے کہ کسی چھوٹے سے مقالے میں ارادہَ الٰہی پر کچھ کہا گیا ہے۔وہ مقالہ یہاں ہے یا نہیں ہے مجھے یاد نہیں پڑتا ہے لیکن میں نے لکھا ہے۔آپ وہ چھوٹا سا مقالہ جو ہے ابھی یاد آتا ہے جس میں۔۔۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپ: سیما عظیم علی نظرِ ثانی: اکبر علی پُروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیرالدّین نصیرؔ ہونزائی (ق س) کا پُرحکمت بیان

عنوان: دین کی تمام خوبیوں کا فائدہ مومنین کے لئے ہے، قسمت و اختیار

کیسٹ نمبر: ۵۸ تاریخ: اکتوبر ۱۹۸۱، کراچی

Click here for Audio

جتنی خوبیاں ہیں اُن سب کا فائدہ مومنین ہی کو ملتا ہے۔ خدا کے دین میں جس قدر خوبیاں ہیں وہ مومنین کے لئے ہیں اور اُن کا فائدہ اِنہی کو حاصل ہے۔ چنانچہ محنت و مشقّت کی بات کرتے ہیں کہ اسلام میں محنت و مشقّت اُصول کے ساتھ بہت ہی ضروری ہے اور اِس ریاضت و محنت کا پھل مومنین کو مل سکتا ہے یعنی اگر ایسے لوگ محنت کریں جو مومن نہیں ہیں تو اُن کو محنت کچھ فائدہ نہیں دے گی، اِس سے اُن کو کچھ نہیں ملے گا۔ اِسی طرح اسلام کی جتنی خوبیاں ہیں اُن پر ایک ایک کرکے بحث کریں اور یہ فرض کرلیں کہ اسلام کی کوئی خوبی کافروں کے سامنے رکھیں تو کیا وہ اُس سے کوئی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں؟ نہیں! نہیں!! اسلام کی تمام تر خوبیاں جو ہیں وہ مومنین ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ اِس لئے میں کہتا ہوں کہ محنت ایک خوبی ہے دین کے معاملے میں، مذہبی طور پر، عبادت کے طور پر، ریاضت کے طور پر، خدا کی غلامی کے طور پر جو بھی محنت کی جاتی ہے اُس کا فائدہ صرف اور صرف مومن ہی کو حاصل ہے کیونکہ قرآنِ مقدّس میں خداوندِ عالم کے ایسے ارشادات بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں کی محنت رائیگاں جائے گی یعنی کہ اُس سے کچھ اُن کو فائدہ نہیں ملے گا، کیوں؟ اِس لئے کہ دین کے معاملے میں سب سے پہلی شرط صحیح ایمان ہے یعنی جو بھی صحیح ایمان لائے گا اور ایمان کے جو بھی معنی ہیں یا ایمان کی جتنی بھی شرطیں ہیں بنیادی طور پر اُن کو جب تک پوری نہ کی جائے تو وہ ایمان نہیں کہلائے گا اور پھر ایسے ایمان کے بغیر کسی کی کوئی محنت کام نہیں آئے گی۔

میں عرض کررہا تھا کہ قرآن کے اندر ایسے ارشادات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں کی مشقّتیں جو ہیں ضائع ہوجائیں گی یا یوں کہنا چاہئے کہ بہت سے اعمال ایسے ہیں کہ دیکھنے کو تو اعمال ہیں مگر اُن کے اندر جو رُوح ہونی چاہئے وہ نہیں ہے، اِس لئے وہ سب اعمال ضائع ہوجائیں گے۔ صرف مومنین ہی کے اعمال مقبولِ خدا ہوں گے اور اُن کو اِن اعمال کی بدولت نوازا جائے گا۔ اِس لئے میں محنت کی بات کرتا تھا کہ محنت دین میں ایک خوبی ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ بہت بڑی خوبی ہے۔ محنت ہی میں مومن کی رُوحانی تخلیق ہوجاتی ہے یعنی مومن رُوحانی طور پر مکمّل ہوجاتا ہے محنت سے۔ اِسی مطلب کو میں دُہرانا چاہتا ہوں، وہ اِس طرح کہ مومن میں اگر کسی چیز کی کمی ہے تو اُس کی کیا وجہ ہے؟ یہ ایک سوال ہے،

یعنی ایک ایسا مومن جو راہِ راست پر تو ہے خدا کے سچّے دین میں ہے اور نورِ خدا کے لئے وہ قائل ہے، امام کو مانتا ہے، جان سے، دل سے مانتا ہے، پر اُس کی کوئی خاص رُوحانی ترقّی نہیں ہے، تو اِس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ کیا ہم اِس کو قسمت اور تقدیر کہیں گے؟ کیا اِس کے متعلّق ہم یہ خیال کریں گے کہ امام نہیں چاہتے ہیں؟ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اِس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مومن محنت نہیں کرتا ہے، ریاضت نہیں کرتا ہے اور کثرت سے عبادت نہیں کرتا ہے یہی ایک وجہ ہے اور دوسری کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہمیں اپنی اس بات کو اچھی طرح سے واضح کرنے کے لئے اُن آیات کو لینا چاہئے جو قرآنِ مقدّس میں محنت و ریاضت سے متعلّق ہیں، ایسی بہت سی آیات ہیں۔ اُن آیتوں میں کبھی تو محنت کو جہاد کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے کیونکہ جہاد جدو جہد ہے، وہ کوشش کا نام ہے، وہ ریاضت کا نام ہے، وہ مشقت کا نام ہے، کبھی کَدّ (۹:۹۱) کہا ہے، کبھی کسی اور ہم معنی لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ بہر حال محنت کی قرآن میں بڑی تعریف کی گئی ہے اور اِسی طرح امام عالی مقام نے اپنے ایک پاک فرمان میں محنت کی بڑی تعریف کی ہے اور محنت کے لئے بڑی تاکید کی ہے اور نامور امام نے لفظِ محنت کو تین دفعہ دہرایا ہے، محنت، محنت، محنت۔ یہ کامیابی کی کلید ہے، اُس فرمان کا مفہوم کچھ ایسا ہے۔ اِس لئے بڑی نیک بختی ہے اُن مومنین کی جو محنت کرتے ہیں۔

اب محنت کی شکل کیا ہونی چاہئے؟ کیا ساری محنت کو یا سارے زور کو کسی ایک چیز پر لگانا چاہئے یا کیسا؟ تو اِس کے لئے یہ ہے کہ ہمارے سامنے دین کی یا رُوحانیت کی جتنی اہم باتیں ہیں اُن میں محنت کرنی چاہئے۔ ایک تو ذکر و عبادت میں، ایک علم میں، تو یہ دو چیزیں سب سے پہلے آتی ہیں کیونکہ علم سے رُوح کو قوت ملتی ہے، رُوح کی پاکیزگی ہوتی ہے۔ جب رُوح کی پاکیزگی ہوتی ہے تو تب عبادت سے مزہ آتا ہے، لذّت ملتی ہے، اگر رُوح میں پاکیزگی نہیں ہے، آلودگی ہے تو ذکر و عبادت کا کوئی مزہ نہیں آتا۔ اب علم سے پاکیزگی کس طرح ہوتی ہے؟ اِس کو بھی ذرا سمجھنا چاہئے، دیکھیں کہ جس طرح جسمانی طور پر بعض بیماریاں انسان کے بدن کے اندر چھپی ہوئی رہتی ہیں اور آدمی اُن بیماریوں سے واقف نہیں، اُس کو اِن بیماریوں کا علم نہیں کیونکہ وہ بہت ہی چھپی ہوئی بیماریاں ہیں۔ اِسی طرح ہو سکتا ہے کہ دین کے معاملے میں امامؑ کے بارے میں کسی بندۂ مومن کے دل میں چھوٹے چھوٹے شکوک پوشیدہ ہوں دین کے بارے میں، آئین کے بارے میں، امامؑ کے بارے میں، رسم و رواج کے بارے میں، کسی بھی بات کے بارے میں، تو اگر شکوک وشبہات کے ذرّات پائے جاتے ہیں یا ذرّہ ذرّہ شک وشبہہ پایا جاتا ہے تو یہ شک بڑا خطرناک ہے، یہ بیماری ہے۔ اِس کے ہوتے ہوئے ہم کو کسی عبادت میں کوئی مزہ نہیں آتا ہے بلکہ عبادت ہی کہاں، آہستہ آہستہ کسی شخص کا عبادت سے دل سرد ہو سکتا ہے۔ اِس لئے علم ہی ہے جو دَوا ہے، جو شفا ہے، یہ شکوک کو ایک ایک کر کے علم دُور کرتا ہے۔ کیا آپ نے خیال نہیں فرمایا کبھی کسی محفل میں، کسی لیکچر میں کہ بار بار اِس کا ذکر آتا ہے قرآن کے حوالے سے کہ رسولِ پاکؐ اپنے مومنین کو علم و

حکمت سے پاک کرتے تھے (۲:۶۲) یعنی جب سرورِ انبیاء رسولِ خدا مومنین کو علم بیان کرتے تھے، حکمت کی باتیں بتاتے تھے تو اُس وقت مومنین کے دلوں سے شکوک وشبہات دور ہو جاتے تھے اور وہ پاکیزہ ہو جاتے تھے۔ اِسی طرح امام جو جانشین رسول ہیں اُس کا علم اسمٰعیلی مذہب میں ہمیشہ کے لئے موجود ہے اور بکھرا ہوا ہے، تو امام کے علم سے مومنین کے دلوں سے شکوک وشبہات کی آلودگی دور ہو جاتی ہے اور جس کے نتیجے میں مومنین کو عبادت سے، بندگی سے، گریہ وزاری سے لطف ولذّت محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ اُن کے دلوں کی پاکیزگی کی علامت ہے تو اُن کو شکرگزار ہونا چاہئے۔

جب مومنین کو علم ملتا ہے، جب مومنین کو عبادت کے لئے وقت ملتا ہے، توفیق ملتی ہے تو اُن کو شکرگزار ہونا چاہئے۔ خداوند خود ہی وسیلہ مہیّا کر دیتا ہے، نہیں تو کسی انسان کی کیا حد ہے؟ اُسی نے ہم کو اِس دین میں پیدا کیا، اُس نے ہم کو اِس دین میں پیدا کیا تو اِس کا ایک مقصد ہے، دین کے معاملے میں یا رُوح کے بارے میں جو کچھ کرنا چاہئے اُس کے دو مقام ہیں، ایک مقامِ خداوندی ہے اور ایک مقامِ بندگی ہے یعنی کچھ کام خدا کے ہیں اور کچھ کام بندے کے ہیں۔ اگرچہ خدا کے کاموں اور بندوں کے کاموں کے آپس میں (relation) ہے، رشتہ ہے، نسبت ہے، تاہم دونوں کے کام الگ الگ ہیں۔ خدا کا کام یہ تھا کہ اُس نے احسان کیا کہ ہم کو ایک مومن کے گھر میں پیدا کیا۔ ہم اپنے آپ جہاں چاہیں وہاں پیدا نہیں ہو سکتے تھے، یہ ہمارے بس کی بات نہیں تھی کہ اِس دین میں پیدا ہو جائیں اور یہ ایک بنیادی مہربانی تھی، ایک ایسی مہربانی کہ اِس سے بہت ساری مہربانیاں حاصل آتی ہیں ایک سرچشمے کی طرح، جس سے ایک بہت بڑا شہر آباد ہو سکتا ہے۔ آج مومنین کو جتنی دین کی نعمتیں حاصل ہیں تو وہ سب نعمتیں اِس بنیاد پر ہیں کہ خدا نے اِن کو ایک مومن کے گھرانے میں پیدا کیا ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو یہ سب نعمتیں ہاتھ نہیں آتیں تو اِس کے لئے مومن کو شکرگزار ہونا چاہئے۔ اب رہا مومن کے حصّے میں جو کام ہے یا جو کچھ مومن کو کرنا چاہئے تو وہ بڑی خوشی سے اور خوش دلی سے کرنا چاہئے۔ ایسا بھی تو نہیں کہ خدا جو ہے بندے کے رُوپ میں آکے بندگی کرے، یہ تو بندے کا کام ہے اور اگر اِس دُوئی میں حکمت نہ ہوتی تو بس خدا ہی رہتا اور بندے کے وجود کے لئے کوئی موقع نہیں ہوتا یعنی بندے کیوں پیدا کئے گئے؟ دُنیا میں ہم کیوں آئے؟ کیا یہ حکمت سے خالی ہو سکتا ہے؟ نہیں! نہیں!! انسانوں کا دُنیا میں آنا حکمت سے خالی نہیں ہے اور اِس میں بہت بڑی حکمت ہے اور وہ یہ کہ خدا کو پہچانے، عبادت کرے، بندگی کرے اور بندگی کے دائرے میں جو کچھ ممکن ہے وہ سب کرے اور جو بات بندگی کے دائرے سے باہر ہے یا بالاتر ہے وہ تو ہم نہیں کر سکتے ہیں، وہ بالا ہے، وہ خدا کا کام ہے۔

ماننا ہوگا کہ کچھ کام انسان کر سکتا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا ہے اور وہ نہیں کر سکتا ہے جو خدا کا کام ہے، اور وہ کر سکتا ہے جو بندے کا کام ہے اور ضرور کر سکتا ہے اور یہ بھی از خود نہیں کر سکتا ہے، یہ اُسی کی مہربانی ہے، اُسی نے صلاحیتیں عطا کر رکھی ہیں تب ہی تو یہ کر سکتا ہے۔ پھر ساری نیکی کو بعد میں خدا سے منسوب کرنا چاہئے، یہ ادب ہے، ایسا نہیں کہنا چاہئے کہ ہم نے

کیا۔ اِس معنی میں خدا نے کیا کہ اُس نے یعنی ہم کو یہ ذرائع دیئے، وسائل دیئے، ہم کو ہستی دی ہم کو وجود دیا، ہمارے یہ سب اعضاء اور ظاہر و باطن کی یہ ساری قوتیں اُسی نے ہمیں عنایت دیں۔ اِس وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں ادب کے طور پر کہ خدا نے کیا، تو پہلے کام کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور خود تقسیم ہے کہ ایک کام خدا کا ہے اور دوسرا کام بندے کا اور جو کام بندے کا ہے وہ بھی خدا کی رحمت و مہربانی کے تحت انجام پاتا ہے، اِس کو جاننا چاہئے۔ اِس لئے عظیم پیغمبروں نے اور خدا کے دوستوں نے یعنی اولیاء نے ہر نیکی کو بعد میں خدا سے منسوب کیا اور یہاں پر یہ بات بھی ضروری ہے کہ بتائیں کہ بہت سے لوگ دُنیا کے اندر نا سمجھی سے اور کوشش کے نہ کرنے سے اور خود کو ہدایت ِحقّہ سے محروم رکھنے کی وجہ سے پیچھے رہتے ہیں۔ میرے کہنے کا مقصد یوں ہے کہ کبھی یہ نہیں کہنا چاہئے کہ ہماری قسمت میں نہیں ہے خصوصاً دین کے معاملے میں یوں نہیں کہنا چاہئے اور یہ بھی نہیں کہنا چاہئے کہ امامؑ کی خواہش نہیں ہے اور یہ بھی نہیں کہنا چاہئے کہ ہم نہیں کر سکتے ہیں۔ اِس سے خدا ناراض ہو جائے گا، اِس لئے کہ اُس نے ہم کو سب کچھ دیا تھا، ہم نے جھوٹ بولا، امام کسی بھی نیک کام کو کیسے نہیں چاہتے ہیں، وہ تو نیک کاموں کو ہمیشہ چاہتے ہیں اور اُس نے چاہا اِس لئے اُس نے ہم کو اِس دین میں پیدا کیا، وہ اگر نہیں چاہتے تو ہم اِس دین میں نہ ہوتے۔ کیا خدا کا چاہنا یہ نہیں ہے اور ہم پر بنیادی رحمت نہیں ہے کہ ہم سچّے دین میں پیدا ہوئے؟ جب ہم سچّے دین میں پیدا ہوئے اور ایک مومن کے گھر میں آئے اور ہم کو ایمان کا ایک اچھا سا ماحول ملا، خدا کے گھر تک ہم کو رستہ ملا اور ایک حد تک ہم کو ابتدائی نوعیت کی معرفت ملی، شناخت ملی، ہم کو سچّی باتیں ملیں تو خدا کے چاہنے سے یہ سب کچھ ہوا تو ہم کیسے کہہ سکتے ہیں ہماری قسمت نہیں ہے، تو خدا نے قسمت یہ بنائی کہ اُس نے ہم کو نیکی کے راستے پر لگایا۔ ہم اپنی سستی کا نام قسمت رکھتے ہیں یا اِس چیز کا نام امام کی ناخوشنودی رکھتے ہیں تو یہ بات اچھی نہیں ہے۔

اِس لئے مومن پر فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنی رُوحانی ترقّی کا خیال رکھے، دائم الذّکر ہو جائے اور مایوسیاں جو ہیں وہ شیطان ہی پیدا کرتا ہے، نا اُمیدی اور بے جا خوف شیطان سے ہے، بے جا خوف معنی خدا سے نہ ڈرنا، لوگوں سے ڈرنا اور بے موقع ڈرنا، یہ شیطان کا کام ہے اور نا اُمیدی کسی بھی اچھے کام سے، یہ بھی شیطان کی طرف سے ہے۔ کسی بھی نیک کام کے لئے ہم کوشش کریں، عبادت کریں، بندگی کریں اور اگر اُس کے انجام پانے میں تاخیر بھی ہو جائے تو کیا ہوا؟ عبادت تو ہم نے کی، مومن کی عبادت تو ضائع نہیں ہوگی، وہ تو جمع ہوگی۔ اُس کا پھل آج نہیں تو کل کو ضرور ملے گا اور اِس بہانے سے ہم عبادت بندگی کرتے رہیں گے۔ مثال کے طور پر بہت سے مومنین ہیں دُنیا کے اندر وہ عبادت و بندگی کرتے ہیں اور فی الحال اُن کی کوئی رُوحانی ترقّی نہیں ہے، پھر بھی وہ مایوس نہیں ہیں اِس لئے کہ اُن کی عبادت و بندگی ضرور خدا کے حضور میں جمع ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُن کی اپنی کوئی کمزوری ہو لیکن کمزوری کو تو ہر وقت تسلیم کرنا چاہئے، یہ ایک ادب ہے، یہ ایک بندگی ہے، یہ ایک عاجزی ہے لیکن مایوس کبھی نہیں ہونا چاہئے۔ مطلب یہ ہے کہ سلسلے کو قائم رکھا جائے، سلسلے کو

کبھی منقطع نہیں کرنا چاہئے۔ اِس لئے مومن کا یہ فرض ہے کہ زندگی کی اِس مہلت سے یعنی زندگی ایک مہلت ہے، ایک ڈھیل ہے، ایک مقرّرہ وقت ہے اور محدود وقت ہے اِس سے فائدہ اُٹھائیں اور دانا مومن وہی ہے جو اِس زندگی سے دین کا فائدہ اُٹھاتا ہے کیونکہ کل کو آخرت کی جو زندگی ہے وہ بے پناہ ہے اور بہت لمبی زندگی ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ وہ کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ اِس لئے جب انسان اپنی دُنیا کی زندگی بسر کرنے کے لئے، گزارا کرنے کے لئے اپنے لئے اور اپنے اولاد کے لئے بہت کچھ محنت کرتا ہے، پھر بھی بعض مثالوں میں یہ محنت کافی نہیں ہوتی ہے، پھر بھی دُنیاوی آسائش کی کمی رہتی ہے، تو پھر آخرت جس کی زندگی بہت لمبی ہے، بجائے خود ایک مسئلہ ہے تو اِس مسئلے کو بھی سوچنا چاہئے یعنی اُس کے لئے بھی خوب تیاری ہونی چاہئے۔ عبادت و بندگی سے، خدا کی شناخت سے اور دین میں ایک اعلیٰ مقام کو حاصل کرتے ہوئے کیونکہ مومن کو ایک ادنیٰ مقام پر بہت سے خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔ مومن کو چاہئے کہ خود کو ایک (safe) اور محفوظ مقام میں رکھے جہاں پر کہ مذہبی طور پر دُنیا کی کوئی چیز اُن کو نقصان نہیں پہنچا سکتی ہے یعنی کہ ہم وہاں پر اپنے سچے دین پر قائم رہ سکتے ہیں اور محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اِس کے لئے ایک تو عبادت ہے اور ایک علم ہے۔ علم کی جتنی بھی تعریف کریں وہ کم ہے کیونکہ ساری رُوح کی پاکیزگی اُسی میں ہے اور اُس کے بغیر رُوح کی پاکیزگی ہے نہیں، اُس کے بغیر عبادت و بندگی کا کوئی مزہ ہے نہیں۔ اِس لئے علم، سچے علم کی تلاش ہو، امام کا علم، مذہب کا علم، رُوحانیت کا علم یعنی علمُ الیقین، وہ خاص علم جو اپنے زمانوں میں پیروں نے پیش کیا، جو ہمیشہ امام کے حضور سے وہ علم جاری وساری ہے، تو روشنی کی شکل میں، رُوحانی روشنی کی شکل میں علم کا سرچشمہ ہمیشہ کے لئے رواں دواں ہے۔ اِس لئے مومن کو چاہئے کہ خود کو علم کے ہتھیاروں سے خوب لیس کریں کیونکہ دُنیا زمانہ جو ہے بڑا خطرناک ہے اور مذہبی طور پر بڑا انتشار ہے۔ ایسے میں مومن کو چاہئے کہ وہ اپنے کو اور اپنے دینی بھائیوں کو سمجھانے کے لئے، بتانے کے لئے علم سے خوب استفادہ کرے، علم سے خوب فائدہ اُٹھائے، تو یہی ایک چیز ہے جس سے بندۂ مومن کو سکون ملتا ہے اور آپ یقین کریں گے کہ علم ایک عظیم عبادت ہے، ایک عظیم عبادت ہے۔ عبادت (literal sense) میں یعنی لُغوی طور پر خدا کی غلامی کا نام ہے کیونکہ عربی میں عبدٗ غلام کو کہتے ہیں اور عبادت غلام کی صفت ہے تو اِس لئے علم سے بڑھ کر اور کیا غلامی ہو سکتی ہے۔ علمی طور پر خدا کی غلامی بہت بڑی غلامی ہے اور بہت پاکیزہ غلامی ہے، بہت صاف ستھری غلامی ہے۔

اِن شاء اللہ خانۂ حکمت کے عزیزان علمی طور پر اپنے برحق امام کی غلامی کریں گے اور اِن کی اِس غلامی سے مذہب کو، جماعت کو بڑا فائدہ ملے گا لیکن اِس میں خوب جاننا چاہئے کہ اپنا کوئی (target) بنانا چاہئے کہ کس حد تک اور کس مقام تک خود کو پہنچانا چاہئے، اِس کے لئے سوچنے کی ضرورت ہے۔ اِس زمانے میں جیسا کہ آپ جانتے ہیں قرآنی علم کی سخت ضرورت ہے اور آپ سب کو اِسی مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اُس کو معلوم نہیں ہوتا ہے کہ کس

مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ تو ایک جنرل بات ہے کہ انسان دُنیا میں آیا ہے خدا کی معرفت کے لئے لیکن (particular) خدا کی معرفت کے لئے آیا ہے تو ہم میں سے ہر ایک کو کون سی خدمت سونپی گئی ہے؟ یہ سوال بھی ہے۔ اب معلوم ہوتا ہے، اب جو آپ کام کر رہے ہیں اُس کی نوعیت سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو خدا نے اِسی مقصد کے لئے پیدا کیا ہے، آپ ہم پہلے نہیں جانتے تھے کہ ہم دُنیا میں آئے ہیں تو خدا کی معرفت کے سلسلے میں کہاں کام کرنا ہے، کس نوعیت کی غلامی کرنی ہے، اس کا تو علم نہیں تھا۔ ابھی معلوم ہوا کہ آپ ہم اِسی مقصد کے لئے آئے ہیں اور اِسی کام کے لئے آئے ہیں جو ہمارے سامنے ہے، تو دیکھیں کتنا اچھا کام ہے۔ خدا پروردگار نے ہمارے ساتھ جو خاص انعام کیا ہے یا ہم پر، ہم سب پر جو احسان کیا ہے اُس کا ثبوت ملتا ہے، اُس کا اب پتہ چلتا ہے، اُس کو اب ہم جانتے ہیں کہ ہم کو آپ کو، سب کو علم کی خدمت سونپی گئی ہے، تو کتنی اچھی بات ہے، بہت اعلیٰ بات ہے، بہت شاندار ہے۔ پس بڑی شکر گزاری کے ساتھ، بڑی خوش دلی کے ساتھ اِس مقدّس خدمت کو انجام دینا چاہئے۔ کیا آپ تصوّر نہیں کرتے ہیں کہ آپ کی ایک بنائی ہوئی ایک کتاب کسی مومن کے ہاتھ میں آتی ہے، بہت سے مومنین ہیں جو کہ اُن کو پڑھتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اُس کو اِس کتاب سے بہت کچھ فائدہ ہو اور رہوا ہے، تو دین میں علم کے سوا اور کیا ہے؟ امام کی شان کو ظاہر کرنے کے لئے صرف مادّی دولت سے کام لینا یہ کافی نہیں ہے۔ دُنیا کے اندر کتنے بڑے مما لک ہیں اور کتنے اغنیاء یعنی تو انگر اور دولت مند لوگ بھی ہیں۔ کیا ہم مادّی دولت سے یہ ثبوت پیش کر سکتے ہیں کہ ہمارا جو امامؑ ہے وہ برحق ہے یا علم سے ثبوت پیش کر سکتے ہیں؟ اگر ہمارے پاس ایسا کوئی علم ہو جو کہ دُنیا کے کسی گروہ کے پاس نہیں ہے تو اِس سے ثبوت ملے گا کہ ہمارا امام برحق ہے۔ یہی علم ہے جس سے پتہ چلتا ہے، جس سے ثبوت ملتا ہے اور ایسا ہو رہا ہے، آج نہیں تو کل آپ دیکھیں گے، اب نہیں تو بعد میں پتہ چلے گا کہ امام کا علم کیسا علم ہے۔ ہمارے پیروں کو، بزرگوں کو امام نے ہمیشہ یہی علم دیا تھا اور اِسی علم کی بدولت اُنہوں نے لوگوں کی رہنمائی کی، لوگوں کو راہِ راست پر لایا، اُن کو ہلاکت سے بچایا، ابدی موت سے بچایا، دائمی زندگی بخشی۔ کیا حدیث میں یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ جو بھی اپنے امامؑ کی شناخت کے بغیر مرتا ہے تو وہ اُن لوگوں کی طرح مرتا ہے جو رسولؐ کے دُنیا میں آنے سے پیشتر بغیر کسی پیغمبر کی شناخت کے مرے [مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَعْرِفْ اِمَامَ زَمَانِہٖ مَاتَ مِیْتَۃً جَاھِلِیَّۃً وَ الْجَاھِلُ فِیْ النَّارِ] یہ کیوں ایسا ہے؟ جو امامؑ کی شناخت کے بغیر مرے تو اُس کو کیوں ایسا ہونا چاہئے؟ اِس سے معلوم ہوا کہ ساری سعادت جو ہے وہ امامؑ کی شناخت سے وابستہ ہے اور سارا علم جو ہے وہ امامؑ کے وسیلے سے ہے۔ کیا اِس سے یہ ثبوت نہیں ملتا ہے کہ علیؑ پیغمبرؐ کے علم کے دروازے ہیں، حکمت کے دروازے ہیں، کیا اِس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ جس کسی کو پیغمبرؐ کے علم تک پہنچنا ہو تو اُسے امامؑ کے (through) سے جانا چاہئے کیونکہ گیٹ امامؑ ہی ہیں علم کے لئے بھی، حکمت کے لئے بھی۔ کیا یہ بات صرف زمانۂ رسولؐ کے لئے خاص تھی یا اِس علیؑ سے آئمّہ مراد ہیں؟ زمانے کا امام ہی علیؑ ہے، تو بات یہاں آ کر ٹھہری کہ دُنیا

میں امامؑ کے بغیر کوئی علم نہیں ملتا ہے۔ اگر کوئی شخص علم کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ وہی علم ہے اُس کے پاس جو پُرانا علم ہے، کسی زمانے میں امام کے وسیلے سے رسول کا علم دُنیا میں پھیلا ہوا تھا، اُسی کو جمع کیا لیکن تازہ ترین علم جو ہوتا ہے وہ ہمیشہ اور ہر وقت امامؑ کے دَر سے ملتا ہے۔ ہم باور کرتے ہیں کہ ہمارے پیروں کو، بزرگوں کو امامؑ کے دَر سے علم ملا، تو اُن کی فضیلت کس بات میں تھی؟ ہمارے پیروں، بزرگوں کی فضیلت یا اُن کی نمایاں خصوصیت کیا تھی؟ ہوسکتا ہے کہ اُن کے پاس یعنی تھوڑی بہت دولت بھی ہوتی لیکن اِس سے کوئی امتیاز نہیں ہوتا ہے، کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ ایک چیز ہے جس سے فرق و امتیاز پایا جاتا ہے، وہ علم ہے، یہ ہمارے پیروں کو، بزرگوں کو علم ہی ملا تھا امامؑ کے وسیلے سے، وہی علم جو پیغمبر کا علم ہے، خدا کا علم ہے جو امامؑ کے (through) سے ملا تھا، امامؑ کے وسیلے سے ملا تھا جس کی بدولت اُنہوں نے بہت سی جانوں کو ہلاکت سے بچایا، جاہلیت کی موت سے بچایا۔ جب سے برِّ صغیر پاک و ہند میں تبلیغ کا کام شروع ہوا تب سے آپ کوئی گنتی کر سکتے ہیں کہ کتنے نفوس کو اُنہوں نے رُوح القدس کی زندگی سے فیضیاب کیا؟ یعنی کیا آپ اُن مومنین کی کچھ گنتی کر سکتے ہیں جب سے کہ اِس برِّ صغیر میں دعوت کا کام شروع ہوا ہے کہ کتنے لوگ اِس دُنیا سے گزر گئے؟ بہت ہیں، بہت ہیں اور بہت سے ہیں تو اتنے سارے نفوس کو اُنہوں نے حقیقی زندگی عنایت کی اُسی علم کی بدولت اور یہ زندگی اُسی علم میں تھی جو امام سے ملتا ہے۔ لہٰذا ہمیں علم کی طرف متوجہ ہونا چاہئے جو حقیقی علم ہے، جس میں حقیقی زندگی ہے، روشنی ہے اور وہ علم ہم کو جاہلیت کی موت سے بچا سکتا ہے، اُسی علم کو اپنانا چاہئے، اُسی علم کو قبول کرنا چاہئے اور اُسی علم کے لئے محنت کرنی چاہئے، تو یہ محنت کی بات ہے اور علمی عبادت کی بات ہے اور اُسی کے ساتھ اب ہم کسی سوال کے لئے انتظار کرتے ہیں اور بات یہیں پر ختم کر دیتے ہیں، مہربانی۔

قطرہ قطرہ دریا! جو عزیزان اِس طرح مجالس میں حاضر ہوتے رہیں گے، کتابوں کو پڑھتے رہیں گے، کیسٹوں کو سنتے رہیں گے اور سوالات بھی کریں گے، آپس میں (discussion) بھی کریں گے تو اُن کے علم میں اِن شاء اللہ اضافہ ہو جائے گا، یقین میں اضافہ ہو جائے گا اور پھر ایک دن اُن کے پاس نامعلوم طور پر توقع سے زیادہ ایک علم کا ذخیرہ موجود پایا جائے گا۔ کیونکہ یہ علم کا جو کام ہے رُوحانی کام ہے اور اِس کا ذخیرہ جو ہے وہ نمایاں نہیں ہے، دُنیا کی کوئی مادّی دولت ہو تو ہم اُس کو دیکھیں، اندازہ ہوگا کہ کتنی دولت جمع ہوئی ہے یا کتنے پیسے حاصل آئے ہیں۔ اِس کے برعکس رُوحانی دولت جو ہے وہ نمایاں نہیں ہے، وہ پوشیدہ شئے ہے، وہ اپنی جگہ پر جمع ہوتی جاتی ہے۔ بڑی خوش نصیبی ہے میری بھی اور آپ کی بھی کہ ہم آپس میں بیٹھ کے علم کی باتیں کر سکتے ہیں ایسے وقت میں جو بڑا مشکل وقت ہے، یہ مادّیت کی ترقّی کا ایک طوفان اُٹھا ہے اور اِس میں بہت سے لوگ بہہ گئے ہیں۔ اُن کے اندر جو ذوق تھا وہ مرگیا ہے، جو تلاش کی صلاحیت تھی وہ ختم ہوگئی ہے اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے ہیں، جس طرح کہ قرآن کا ایک ارشاد ہے کہ: ”خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ وَعَلٰی سَمۡعِهِمۡ ؕ وَعَلٰۤی

اَبۡصَارِهِمۡ غِشَاوَةٌ ؕ (۲:۷) تو خداوندِ عالم نے اُن کے دلوں پر مہر لگائی ہے، اُن کے کانوں پر بھی اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے، تو خدا ایک اپنے دستِ قدرت سے یہ کام نہیں کرتا ہے، اِس میں سوچنے کی بات ہے۔ اگر خدا کسی بندے کے دل پر مہر لگائے کہ اُس کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ ہو اور کان پر ایسی مہر لگائے کہ وہ سُن نہ سکے اور آنکھوں پر ایسا پردہ لگائے کہ وہ دیکھ نہ سکے، یہ تو دُنیا ہی میں اُس کے لئے قیامت ہوگئی تو ظلم ہوگیا۔ یہ بات اِس طرح سے نہیں ہے بلکہ انسان کو جو مہلت دی گئی ہے اُس مہلت سے فائدہ اُٹھا کر وہ کام نہیں کرتا ہے تو آہستہ آہستہ خود از خود اُس شخص کی وجہ سے ساری صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں تو کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے خدا نے اِس پر مہر لگائی ہے، تو آخر فعل جو ہے وہ خدا سے منسوب ہوسکتا ہے جس طرح ابھی ہم نے بات کی تھی کہ کام خدا کرتا ہے اپنا کام اور انسان کا جو کام ہے وہ خود کرتا ہے اور انسان کا جو کام ہے بعض دفعہ خدا سے منسوب ہو جاتا ہے۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ دُنیا میں بہت سے لوگ ہیں جن کے اندر جو اچھی صلاحیتیں تھیں وہ ختم ہوگئیں لیکن ہمیں خود کو بھی اِس میں احتیاط کرنا چاہئے، ہمیں بھی ڈرنا چاہئے، کہیں اپنے معمول سے ہم سُست اور غافل نہ ہو جائیں۔ اگر ہم مانتے ہیں کہ اب ہماری حالت اچھی ہے تو اِس کو قائم رکھنا چاہئے اور اگر ہم مانتے ہیں کہ اب ہماری ترقّی نہیں ہے تو کوشش کرنی چاہئے۔ بہر حال ہمیں انسانی فطرت کو سمجھنا چاہئے کہ کس طرح یہ اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ پانی کی فطرت کو آپ نے دیکھا ہے، سوچا ہے اور اُس دُنیا کے اندر صرف ایک ملک میں ایک شہر کی بات نہیں ہے کہ پانی کی عادت یہ ہے، اِس کی طبیعت ایسی ہے کہ جہاں موسم گرم ہوتا ہے تو پانی گرم ہو جاتا ہے۔ جہاں زیادہ گرمی ہوتی ہے تو اِس کے بخارات اُڑتے ہیں، جہاں تھوڑی سی ٹھنڈک ہوتی ہے تو اُن بخارات پر کچھ موسم کی وجہ سے پھر بادلوں میں تبدیل ہونے کے بعد بارش کی شکل میں وہ پانی برستا ہے، پھر برف بن جاتا ہے اور کہیں کہیں پانی جو ہے وہ یخ بستہ ہے۔ اِسی طرح انسان خیال نہ رکھے کوشش نہ کرے تو پھر اِس میں بھی تبدیلی آتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو ہوشمند ہیں وہ ہر وقت خدا کے نام کو جانپتے ہیں۔ ذکر میں لگے رہتے ہیں اور غافل نہیں ہوتے ہیں، دائم الذکر ہوتے ہیں، تو یہ بہت ضروری ہے کہ ہمیشہ خدا کو یاد کیا جائے اور اپنی عادت بنائی جائے اور وہ عادت بھی ایسی ہو کہ مضبوط عادت ہو، عبادت کی، بندگی کی اور علم سے دلچسپی رکھنے کی عادت ہو اور بہت اُستوار ہو، بہت ہی مضبوط ہو تب اُس کو، مومن کو آرام ہے اور کسی عزیز کا کوئی سوال ہو تو۔

اِنہوں نے میری گفتگو کے حوالے سے ایک سوال اُٹھایا اور حوالہ یہ تھا کہ میں نے قسمت اور تقدیر کو بہت زیادہ اہمیت نہ دینے کے لئے کہا تھا تو اِنہوں نے اِسی کو (quote) کیا اور (quote) کرتے ہوئے کہا کہ اگر دُنیا میں قسمت کوئی شئ نہیں ہے تو کچھ لوگ پیدائشی طور پر ناقص پیدا ہوتے ہیں، معذور ہوتے ہیں اور لوگ اُن کے متعلّق یہ کہتے بھی ہیں کہ اِس کی قسمت اچھی نہیں ہے، تو اِس کے لئے کیا کیا جائے، یہ ان کا سوال ہے۔ جواب یوں عرض ہے کہ ہم کسی فیصلے کو بحیثیتِ مجموعی کرتے ہیں اگر کسی بھی شہر سے سَو آدمی کو لیں تو سَو میں سے بیس فیصد معذور نہیں ہوتے ہیں، دس بھی نہیں

ہوتے ہیں، پانچ بھی مشکل ہیں، ایک کوئی ہوسکتا ہے یا دو۔ اب اِس صورت میں وہ بات مستثنیات میں سے ہے اور عام قانون اِسی کو لیں گے یا اِسی حالت جس حالت میں کہ یہ ننانوے لوگ جو ہیں جس طرح ہیں اُسی کو ہم سامنے رکھیں گے اور اُسی کو قانون خیال کریں گے، تو پھر ہماری بات صحیح ہے جو کچھ کہا گیا ہے، اب انفرادی طور پر کسی معذور شخص کے بارے میں بھی بحث کرتے ہیں۔ یہ ہے کہ کوئی ایسا معذور شخص ہوسکتا ہے دُنیا کے اندر اُس کی بحث الگ ہے، اِس لئے کہ وہ مستثنیات میں سے ہے، وہ جنرل قانون کے تحت نہیں ہے اور جنرل قانون کے تحت سامنے رکھنے کے لئے وہ لوگ ہیں جو زیادہ ہیں، جو ننانوے ہیں اور جس کی گنتی ایک ہے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے اپنے قدرت، توانائی کا ثبوت دینے کے لئے ایک شخص کو معذور پیدا کیا اور ہم سے امتحان لینے کے لئے کہ ہم اُس کو کیا سمجھتے ہیں، ڈرتے ہیں یا کہ ہنسی اُڑاتے ہیں یا کہ فخر کرتے ہیں اور اگر ہم سالمُ الاعضاء ہیں تو اِس کی کیا وجہ خیال کرتے ہیں اور اگر ہم تندرست ہیں تو اِس کے لئے ہم شکر کرتے ہیں یا ناشکری کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ، ایسی بہت سی چیزیں ہیں، یہ سب کچھ ہونے کے بعد۔ اب اُس شخص کی قسمت کے بارے میں ٹھیک ہے اگر خدا نے اُس کو چاہتے ہوئے اِس طرح سے پیدا کیا ہے تو اُس کے پس منظر میں کوئی ایسی وجہ ہوگی جس کو وہ جانتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ ننانوے فیصد جو لوگ تندرست تھے وہ صحیح تھے تو اُن کے مطابق ننانوے فیصد جو ہیں وہ یعنی قسمت نہ ہو اور ایک شخص جو معذور ہے وہ ایک فیصد قسمت ہو اور اگر ایک فیصد قسمت ہے تو ہمیں اُس کو زیادہ اہمیّت نہیں دینی چاہئے، زیادہ اُسی کو اہمیت دینی چاہئے جو کثرت سے ہے۔ اب اُس کے انصاف کے لئے خدا کی خدائی میں ایک ایسا شخص کیوں پیدا کیا گیا؟ اُس کی بات کرتے ہیں، اُس کی دو باتیں ہیں، ایک یہ کہ ہوسکتا ہے کہ ایسے انسان کے ماضی میں کوئی بات ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ماضی میں ایسی کوئی بات نہ ہو لیکن خدا نے خود ہی اپنی مرضی سے اُس کو ایسا کیا ہے۔ دونوں صورتوں میں رحمت ہے اُس کے لئے، کیا رحمت ہے؟ اُس میں کیا رحمت ہے، اِس میں کیا رحمت ہے؟ اگر ہم مانتے ہیں کہ ماضی میں کوئی بات تھی جس کی وجہ سے یہ ایسا ہوا تو ٹھیک ہے اُس کی سزا ختم ہوگئی، اب وہ پاک ہو جائے گا اور اُس کو خدا کے حضور میں سے کچھ ملنا چاہئے۔ اِس صورت میں جو ہوا اچھا ہوا کہ اُس کی بندگی اِس شکل میں ہوئی اور وہ نہیں اور کوئی وجہ نہیں لیکن خدا نے خود از خود اِس کو یوں کیا تو یہ ایک پیشگی عبادت ہوگی، ایک پیشگی عبادت ہوگی کہ بلاوجہ اُس نے ایک قسم کی عبادت اُس کو کرائی، اُس سے کرائی تو پھر آگے چل کر اُس کی رُوح کے لئے کوئی مصلحتِ خداوندی ہوسکتی ہے۔ اِس میں ذرا ہوسکتا ہے کہ یہ بات ذرا مُبہم ہو، میں دوبارہ اِس کو واضح کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ یہ تو ماننا چاہئے کہ اِس جہاں میں گوناگونی ہے اور خدا کی مصلحت یہ تھی کہ اُس دُنیا میں مختلف نمونے ہوں، مختلف مثالیں ہوں تاکہ لوگوں کو عبرت ہو، نصیحت ہو کہ خدا کی قدرت کیسی ہے اور کیا کیا ممکن ہے، مصیبت کیا ہے، تکلیف کیا ہے، بیماری کیا ہے، معذوری کیا ہے، تو اِس کے نمونے اِس دُنیا کے اندر لازمی تھے، یہ بات ہم مانتے ہیں۔ اب کسی بندے کو خدا یہ کہتا ہے یا قانون کہتا

ہے کہ دیکھو میں ایک ایسی دُنیا کو بناتا ہوں، اِس دُنیا کے کارخانے کو، اِس دنیا کی رنگارنگی کو قائم رکھنے کے لئے کون ایسا بندہ ہے جو خود کو پیش کرتا ہے، جو (voluntarily) یہ کام کرتا ہے؟ اگر خدا ایسا کہتا یا اِس کا تقاضا ہوتا تو بہت سی رُوحیں خود کو پیش کرتیں، اے خدا! میں تیرے لئے یہ کام کروں گا دنیا میں، میں ایک اندھا بن کے دنیا میں، میں ایک معذور انسان بن کے تیرے لئے ایک نمونہ اس دُنیا میں قائم رکھوں گا تاکہ لوگ، تیری بادشاہی کو، تیری زبردستی کو، تیرے زور کو، تیری قدرت کو، تیرے قہر کو تیری قدرتوں کو سمجھیں اور تجھ سے ڈریں کیونکہ اگر یہ نمونے نہیں ہوتے اور دُنیا میں اگر بہشت ہوتی تو کوئی انسان بیماری کو نہیں سمجھتا، خدا کی غالبیت کو، خدا کی قدرت کو نہیں سمجھتا، خدا کے قہر کو نہیں سمجھتا تو خدا کی طرف سے جو ہدایت لوگوں کے سامنے رکھنی چاہیئے وہ مکمّل نہیں ہوتی، ایک نامکمّل دنیا ہوتی، تو اِس لئے خدا کے اندر یعنی کہ بہت ساری (varieties) رکھی گئیں کہ صحت کیا ہے، بیماری کیا ہے اور آنکھ کیا ہے، اندھا پن کیا ہے، پاؤں کا ہونا کیا ہے، لنگڑا کیا ہے، ہاتھ کا ہونا کیا اور نہ ہونا کیا ہے، غریبی کیا ہے، امیری کیا ہے، سب چیز، اِس کو ایک کتاب کی شکل دی مطلب کی بات وہاں ہے کہ یعنی (advance) میں بھی ہم کوئی خدا کے لئے بغیر کسی گناہ کی سزا کے ہم کوئی غلامی اور کوئی تکلیف کی چیز برداشت کر سکتے ہیں اور آگے سے آگے چل کر شاید ایسے لوگوں کو موقع مل جائے گا، تو میں نے اِس کی دو وجہیں بتائیں اور قسمت تقدیر کے بارے میں بھی میں نے بتایا کہ قسمت اور تقدیر کسی بھی واقعے کو جو سَو فیصد نہیں ہے اور دس فیصد بھی نہیں ہے، پانچ فیصد بھی نہیں ہے تو ہم اُس کو (base) نہیں بنا سکتے ہیں، (base) اُسی کو بنائیں گے جو پچانوے فیصد ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میری بات واضح ہے۔ لہٰذا قسمت اور تقدیر کو اتنی یعنی اہمیّت نہیں ہے، اگر سب دُنیا والے ایسے پابند ہوتے اور کچھ بھی نہیں کر سکتے تو ہم ضرور یہ کہتے کہ بس مجبوری ہے، (on the whole) یہ نہیں ہے اور میں بارہا اِس بات پر زور دیتا ہوں کہ قانون دین کا ہو یا دُنیا کا، ہر ہر قانون کے اندر مستثنیات ہوتے ہیں، کچھ تو (general cases) ہوتے ہیں جو وہی عام قاعدے کی حیثیّت سے ہیں، جو عام قانون ہیں، کچھ تو اُس میں (exceptional cases) ہوتے ہیں۔ وہ (exceptional cases) جو ہیں اُن کا ہونا ضروری ہے مگر وہ (exceptional cases) جتنے ہیں وہ قانون نہیں ہے بلکہ وہ قانون کی ایک شق، قانون کا ایک جُز ہیں اور جو (total) ہے وہی قانون ہے اور (total) میں تو اُن کا جو ہے وہ یعنی کچھ مقدار نہیں بنتی ہے۔ اِس طرح یعنی دُنیا کے اندر قسمت اور تقدیر جس طرح دوسرے لوگ سمجھتے ہیں اسماعیلیت میں اِس طرح سے نہیں سمجھا جاتا ہے اور دوسروں کو جتنا نقصان ہوا وہ سب نقصان اِسی قسمت کی طرف جانے اور اِس (concept) کو ماننے سے ہوا۔ آپ کو دُنیا کے اندر بہت سے لوگ ملیں گے اور بہت سے مولوی ملیں گے، بہت سے مُلّا ملیں گے جو کہ قسمت کو ناجائز طور پر مانتے ہیں اور اُن کا تصوّر جو ہے اِن کی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتا ہے، اِن کے اندر جو قوتیں ہیں، جو صلاحیتیں ہیں اُن کو مفلوج کر دیتا ہے یعنی اُن کی نشوونمائی نہیں ہوتی ہے۔ اِس وقت اِس دُنیا کے

اندر صرف ایک اسمٰعیلی مذہب ہے جس کے اندر انسانی صلاحیتوں کو نشو ونما پانے کے لئے کھلا موقع ہے یعنی ہمارے اندر جو تصوّر ہے، جو (thinking) ہے وہ بہت عالیشان ہے کہ اِس کے اندر خداوندِ عالم نے جتنی قوتیں پیدا کیں ہیں اُن سب کو نمو پانے کے لئے، نشو ونما پانے کے لئے اور اُجاگر ہونے کے لئے بڑا اچھا موقع ہے۔ قسمت اور تقدیر پر ہمارے جانِ عزیز نے بھی ایک مقالہ کہیں لکھا ہوا ہے، اور دوسرے لوگ بھی لکھتے ہیں اور اِس سلسلے میں ہم سے بہت سے مقامات پر اِس بارے میں سوالات بھی ہوئے ہیں، تو ہم نے قرآن (quote) کر کے بتایا ہے۔ آپ سوچیں کہ اگر قسمت کی بادشاہی ہے، تقدیر کی بادشاہی ہے تو کل کو خدا کیوں یعنی لوگوں سے پوچھ گچھ شروع کرتا ہے؟ تو کوئی اُس سے یہ کہے کہ ہمیں تو دُنیا کے اندر پابندِ قسمت کر دیا تھا تو ہماری تقدیر میں جو کچھ تھا وہی بات ہوگئی تو پوچھ گچھ کی کیا وجہ ہے؟ تو پھر اگر یہ بات ہے تو خدا کیا کرتا؟ یہ بات نہیں ہے یعنی خداوند کتنا سارا زور لگا تا ہے ہدایتوں کی بھرمار ہے، مثلاً قرآن ہے، کتابیں ہیں، بہت ساری چیزیں ہیں تو یہ نہ ہوتا۔ اُس نے قسمت کو انسان سے وابستہ کیا یا انسان کو قسمت سے وابستہ کیا تو یہ ایک (automatic) بات ہوگئی، پھر مزید اِس میں کچھ کہنے کی کیا ضرورت تھی اور پھر کل کو لوگوں سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر لوگوں کی اپنی کوئی ذاتی غلطی نہیں ہے یا اُن کی طرف سے کچھ اُن کی خواہش کے مطابق، اُن کی رضا کے مطابق کچھ کارنامہ نہیں بنا ہے تو کل کو اُن کو گرفتار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، یعنی میرا مقصد ہے کہ اگر لوگوں کے پاس اختیار نہیں ہے اور وہ مجبور ہیں پھر خدا ہی نے اُن کو مجبور کیا، قسمت اور تقدیر کے نام سے ایک (force) اُن پر مسلّط کر کے پھر کل کو جو کچھ ہوگا وہ انصاف کے مطابق نہیں ہوگا، تو اِس سے معلوم ہوا کہ لوگ قسمت کے بارے میں جو کچھ سمجھتے ہیں وہ درست نہیں ہے۔

میں نے شروع میں جیسا کہ عرض کیا نا کہ خدا کا اپنا کام ہے، بندے کا اپنا کام ہے اور خدا نے بندے کو ایک دائرہ دیا ہے، (circle) دیا ہے۔ اُس (circle) کے اندر اُس کو اختیار دیا ہے اور (circle) سے باہر اختیار نہیں ہے۔ انسان کا اختیار یہ نہیں ہے کہ آسمانوں پر بادشاہی کرے اور خدائی کا سارا کام کرے، اِس کو جو اختیار ہے وہ محدود ہے، قرآن کہتا ہے کہ: ''لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا ؕ'' (۲:۲۸۶) خدا کسی کی جان پر تکلیف نہیں رکھتا ہے مگر اُس کی وسعت، اُس کی قوت کے مطابق۔ اِس میں ذرا باریکی سے دیکھنے سے ایک تو وسعت کی (categories) بنتی ہیں، درجات بنتے ہیں۔ خدا ہر شخص کو اُس کی وسعت کے مطابق تکلیف دیتا ہے تو مطلب اِس کا یہ ہوا کہ ہر شخص کی وسعت الگ الگ الگ ہے تو نتیجہ اِس کا یہ نکلا کہ یہ وسعت جو ہے بڑھنے والی چیز ہے، جیسی جیسی ہماری صلاحیت بڑھتی جاتی ہے تو ہم کو زیادہ خدا کام کی تکلیف بھی دیتا ہے۔ تکلیف معنی فرمائش، حکم، تکلیفِ شرعی، تکلیفِ دینی، تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ جو (circle) ہے آہستہ آہستہ آہستہ بڑھتا چلا جاتا ہے اور جیسے جیسے یہ (circle) بڑھتا چلا جاتا ہے تو انسان کا اختیار بھی بڑھتا چلا جاتا ہے مگر ایک بچّہ ہے اُس کا اختیار اتنا نہیں ہے۔ سات برس کا بچّہ ہے تو اُس کا اختیار ہے لیکن محدود اور جیسے جیسے عقل بڑھتی جاتی

ہے تو عقل کی وجہ سے اختیار ہے اور اختیار کی وجہ سے حکم کا دائرہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ دیکھئے کہ ہم جانور کو پالتے ہیں اور فرشتے کو مانتے ہیں تو اِن سے کوئی پوچھ گچھ نہیں ہے، حیوان سے پوچھ گچھ نہیں ہے، فرشتے سے پوچھ گچھ نہیں ہے، وجہ اِس کی یہ ہے کہ حیوان جو ہے وہ شرّ کی طرف مائل ہے، اُس میں (single power) ہے، نفس ہے اور فرشتہ جو ہے خیر کی طرف چلا جاتا ہے، وہ (automatic) ہے یعنی یہ دونوں چیزیں جو ہیں نا قسمت میں زیادہ مضبوط ہیں یعنی ہماری نسبت اِن پر قسمت مضبوطی کے ساتھ مسلّط ہے، تقدیر کہ جانور کچھ بھی نہیں کرسکتا ہے۔ اُس کو جو (nature) ملی ہے اُسی کے مطابق اور فرشتہ کچھ بھی نہیں کرسکتا ہے سوائے نیکی کے، وہ بدی نہیں کرسکتا ہے، اُس میں بدی کے لئے کوئی چیز نہیں ہے، نفس ہے نہیں اور بدی کو کرنے کے لئے اور بدی کے پیچھے جانے کے لئے اُس کے پاس کوئی نفس نہیں ہے اور حیوان میں نفس ہے تو وہ بدی کے پیچھے ہے۔

انسان میں دونوں چیزیں ہیں، وہ ایک طرح سے حیوان بھی ہے اور ایک طرح سے فرشتہ بھی ہے۔ عقل جو ہے وہ فرشتے کی طرح ہے اور جو نفس ہے وہ حیوان کی طرح ہے۔ اب دو چیزوں کے درمیان سے ایک تیسری چیز، ایک اعتدال یا کہ اختیار پیدا ہوگیا۔ اختیار عربی کا ایک لفظ ہے جس کی (root) خیر ہے، خیر 'خ' 'ی' 'ر'، خیر اِس کی (root) ہے اور اختیار یعنی کہ اِس کی (word branch) ہے۔ اختیار معنی دو چیزوں کی فرمائشوں میں سے کسی چیز کو پسند کرنا، یہ اختیار ہے۔ ایک تو نفس کی فرمائش ہے، ایک عقل کی فرمائش ہے اور چونکہ ہمارے اندر ہم مجبور کیسے ہیں؟ جتنا (power) نفس کا ہے اتنا (power) عقل کا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ ہم نے شروع ہی سے نفس کو زیادہ قوی بنایا تو اب نفس ہی غالب آئے گا اور یہ بات بھی الگ ہے کہ ہم نے عقل کی زیادہ پیروی کی تو وہ غالب آئے گی، وہ (powerful) ہو جائے گی۔ نہیں تو خدا نے اور اُس کے انصاف نے دونوں کو برابر برابر دیا ہے یا یہ ہے کہ کبھی اگر اُس کا پلّہ بھاری آتا ہے تو کبھی اِس کا پلّہ بھاری آتا ہے، تو ہم دونوں کو سامنے رکھے ہوئے ہیں، یہ عقل کی فرمائش کو اور نفس کی فرمائش کو، کس کو ہم اختیار کرتے ہیں؟ عقل کی چاہتوں کو یا نفس کی چاہتوں کو؟ کس کو چاہتے ہیں؟ یہ ہم دونوں کرسکتے ہیں تو پھر مجبور ہونے کا یہ سوال ختم ہوگیا تو مجبور نہیں ہے۔ نفس کُلّی طور پر غالب آتا تو ہم مجبور نفس کی طرف سے، اور عقل پوری طرح سے غالب آتی تو ہم مجبور نفس کی طرف سے اور عقل کے ماتحت ہوگئے، عقل کے پیرو ہوگئے، ایسا نہیں ہے۔ شروع سے لے کر آخر تک دونوں چیزیں ساتھ ہیں اور یہ ہماری کوشش پر (depend) کرتا ہے کہ ہم نفس کو کس قدر کمزور بناتے ہیں اور عقل کو کس طرح قوی بناتے ہیں اور نفس کو آیا ہم غلام بنا سکتے ہیں یا نہیں بنا سکتے ہیں تو یہ تو بعد کی چیز ہے، بعد کی پیداوار ہے لیکن شروع میں ابتداءً یہ ہے کہ نفس ہے اور عقل ہے، دونوں ہیں تو انسان اِن دونوں چیزوں کے اُوپر بادشاہ ہے، اِس لئے وہ مختار ہے۔ پھر بھی میں کہتا ہوں کہ اپنے دائرے کے اندر اِس چھوٹی سی عقل سے اور اِس نفس سے ہم کائنات کی بادشاہی تو

نہیں کر سکتے ہیں۔اپنا ایک (circle) ہے اپنا ایک دائرہ ہے، اِسی کے اندر نفس اور عقل کی اِس کشمکش میں یا اِس رسا کشی میں ہم کس کی حمایت کرتے ہیں، کس کی حمایت نہیں کرتے ہیں تو یہ ہمارے اُوپر ہے۔ بڑی دلچسپ بحث ہے، عقل اور نفس کی بحث اور اِس کو سمجھنا چاہئے اور بار بار اِس پر سوالات بھی ہوں تو اچھا ہے، (discuss) بھی ہو تو اچھا ہے۔

اِنہوں نے میری گفتگو کا حوالہ دیا اور کہا کہ آپ نے اسماعیلی مذہب میں پیدا ہونے کو جو ہے سعادت سمجھا اور خدا کا احسان تو اگر یہاں پیدا ہونا سعادت ہے تو پھر دوسرے مذاہب میں پیدا ہونے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا اُن کی بدقسمتی ہے یا اُن کے لئے کیا ہوگا؟ یہ اِنہوں نے بہت بڑا سوال اُٹھایا، اب اِس میں کُریدنے سے بہت دُور کی اور گہرائی کی باتیں، بھید جو ہیں وہ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ کہ کوئی بات نہیں ہے، بھید ظاہر بھی ہو جائے تو کوئی ڈر نہیں ہے، دُور دُور کے لئے اُن کے لئے بھی ایک مصلحت ہے، دُور دُور کے لئے۔ یہ اُس بے پناہ وقت کے پیشِ نظر اِس کو ہم وقتی بات کہہ سکتے ہیں لیکن یہ وقتی بات بھی کوئی آسان بات نہیں ہے۔ تاہم دُور دُور نگاہیں، حقیقت کی وسعتوں میں نگاہیں دوڑائیں اور خداوندِ عالم کی جو بے پناہ رحمت ہے اُس کا تصوّر کریں اور اسمٰعیلی مذہب کی روشنی میں اچھی طرح سے دیکھیں، بھالیں تو پتہ چلتا ہے کہ دُور دُور جانے سے اُن کے لئے بھی ایک مصلحت ہے، اور ہمیں اِس طرح سوچنا چاہئے۔ کیونکہ اب فی الحال نہیں ہے، فی الحال بہت سے لوگوں کو جہنم میں جانا ہوگا، پھر جہنم سے آہستہ آہستہ آہستہ آہستہ آہستہ آہستہ اُن کو نکالنا ہوگا اور خود خدا کی بے پناہ رحمت کا تقاضا ہے کہ ہم آگے اور آگے بہت دُور چل کر سب ایک مقام پر سب مل جائیں، یہ امامؑ کا قول ہے۔ اِسی طرح چلتا ہے اور اُن لوگوں کو دیکھتے ہوئے اور اُن کی حالت کو دیکھتے ہوئے یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ اسمٰعیلی مذہب ست پنتھ نہیں ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں، اسمٰعیلی مذہب ست پنتھ ہے، ست پنتھ کا مطلب صراطِ مستقیم ہے اور وہ راستہ جس کا آخری سرا خدا کا نور ہے اور خدا کا نور جو ہے ساتھ میں ہے اور آگے بھی ہے اور دوسرے لوگ ہیں، ظاہری بات ہے کہ بہت سے لوگ گمراہ ہیں جہاں قرآن کہتا ہے، حدیث کہتا ہے تو اِس میں کیا شک ہے؟ دوسرے لوگ اِس کی توجیہہ نہیں کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ بس یہ قرآن نے کہا ہے اور پھر اِس کے بعد یعنی کسی کو بحث کرنے کے لئے موقع بھی نہیں دیا جاتا ہے، سوال کرنے کے لئے مہلت بھی نہیں دی جاتی ہے، قرآن کے ارشاد اور حدیث کے ارشاد کے بعد کسی کو کچھ کہنے کے لئے، سوچنے کے لئے موقع نہیں دیا جاتا ہے لیکن اِس کے برعکس ہمارے یہاں تو سوچنے کے لئے بڑا موقع ہے، سوال کے لئے جواب ہے، قرآن میں جو کچھ ارشاد ہوا اُس کے باوجود بھی یہاں ایک توجیہہ ہے، سوال کا جواب ہے اور وہ سوال کا جواب یہ ہے کہ آگے چل کر اور بہت، بہت دُور چل کر سب خدا کی رحمت میں سمو جائیں گے۔

سوال: سر! کوئی معذور انسان ہوتا ہے تو اِن کے پیچھے کسی نہ کسی شخص کو قربانی دینی ہوتی ہے، اُس کی پرورش کے لئے، تو جو پرورش کرتا ہے اُس کو پوری زندگی بھی دینی پڑتی ہے، تو کیا مذہبی طور پر اُس کا کوئی ثواب ہوتا ہے؟

جواب: ہاں! اُس کے طور پر ہو جائے گا جو اُس کے مذہب کا جو مقام ہے اُس کے مطابق لیکن اِس میں کوئی ایسی بڑی چیز نہیں ہے جس طرح مومن کو جو کچھ ملتا ہے وہ ملے گا۔

فیصلے کے مطابق ہم یہ دیکھیں گے کہ اِس کے لئے قرآن میں لفظ یا اصطلاح ملتی ہے یا نہیں، تو اِس سوال کا جواب اِس طرح سے ملتا ہے کہ قرآن میں یہ فرمایا گیا ہے کہ: کچھ لوگوں کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں اور کچھ کے اعمال میں سے کچھ بھی ضائع نہیں ہوتا (۹:۱۲۰)۔ اب دوبارہ ہم سوال کرتے ہیں وہ کون سے لوگ ہیں جن کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں؟ تو جواب ملتا ہے کہ جو ایمان لاتے ہیں اُن کے اعمال ضائع نہیں ہوتے ہیں۔ جو ایمان نہیں لاتے ہیں اور اپنی طرف سے نیک کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اپنے معیار کے مطابق، اپنی کسوٹی کے مطابق تو خدا اُن کے کسی بھی عمل کو قبول نہیں فرماتا۔ یہ تو قرآن کا فیصلہ ہوا، اِس قرآن کے فیصلے کی روشنی میں دیکھا جائے تو پہلے مرحلے کی بات ہم یوں کریں گے کہ سوائے اُن کے جنہوں نے خدا اور رسولؐ پر ایمان لایا ہے باقی جتنے بھی لوگ ہیں اُن کے اعمال ضائع ہو گئے، تو قرآن کا فیصلہ ہو گیا۔ اب اِس کے باوجود جو ہم سوال کو پیدا کرتے ہیں وہ عیب نہیں ہے، مزید کچھ جاننے کے لئے اور گہرائی میں جانے کے لئے اچھا ہے۔ ورنہ اگر قرآن کے فیصلے کو دیکھا جائے تو بغیر (reasoning) کے اور بغیر کسی (logic) کے قرآن نے کہہ دیا کہ بس جو رسولِ عربی پر ایمان نہیں لاتا ہے اُس کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں، بات ہو گئی۔ اب اِس کے بارے میں دو باتیں اور رہ گئیں، ایک یہ کہ رسولِ عربی پر ایمان لانا کس طرح اِس کی وضاحت اور دوسرا سوال اِس کے باہر، دائرۂ اسلام کے باہر جس طرح آپ نے کہا کہ خدا کا یہ کہاں کا انصاف ہوا کہ ابھی ابھی ہم نے اِس کیسٹ میں کہا تھا کہ کسی کا کہیں پیدا ہو جانا خدا کی مرضی کے مطابق ہے۔ ہم نے یہ کہا اور مان لیا کہ خدا نے ہم کو اسمٰعیلی مذہب میں پیدا کیا، اِس کی (logic) اب یہ بنے گی کہ کسی (budhist) کو خدا نے (budhist) کے گھر میں پیدا کیا یا کسی ہندو کو اُس نے ہندو گھرانے میں پیدا کیا۔ اب جس کو خدا نے بنیادی طور پر مہربانی نہیں کی ہے اب وہ کیا کرے گا؟ یہ ایک بڑا سوال پیدا ہو گیا، تو اِس کے لئے خدا کے وہاں کیا انصاف ہے، کیا مہربانی ہے؟ ہم اِس کی تھوڑی سی وضاحت کریں گے، اِس فیصلے کو ماننے کے بعد یہ قرآن نے جو کچھ فیصلہ کیا وہ صحیح ہے، تو یہ ہے کہ ہم ہدایت کے موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں اور جب قرآن سے پوچھتے ہیں کہ ہدایت کا معاملہ کیا ہے تو قرآن ہم کو بتاتا ہے کہ ہر چیز میں اُس کی ضرورت کے مطابق ہدایت ہے۔ پتھر ہے تو اُس میں ایک فطری ہدایت ہے، مٹّی ہے اُس میں ہدایت ہے اور اُس کی ضرورت کے مطابق، نباتات ہیں اُن کی ضرورت کے مطابق ہدایت ہے یعنی اِس ضرورت سے زیادہ نہیں ہے اور نباتات کو کس درجے کی ہدایت ضروری ہے؟ بس اپنی غذا کو (absorb) کرنے کی ضرورت ہے اور اپنی جڑوں کو، شاخوں کو پھیلانے کی ضرورت ہے اتنی ہدایت اُس میں ہے۔

اب جانور میں بھی ہدایت ہے، جانور میں ایسی ہدایت نہیں ہے جس سے کہ خدا کی شناخت ہوتی ہے ۔جانور میں دشمن سے خود کو بچانے کی ہدایت ہے، اولاد کی پرورش کی ہدایت ہے اور غذا طلب کرنے کی ہدایت ہے اور اِس نوعیت کی ضروری ہدایت جانور میں بھی ہے ۔اب ہم آتے ہیں انسانوں کی طرف، انسانوں کے مختلف طبقات ہیں، ہر طبقے میں، ہر مذہب میں اُس کی حیثیت، اہمیت، ضرورت کے مطابق ہدایت ہے ۔مثال کے طور پر ہندو کو لیجئے، ہندو میں ہدایت ہے یعنی (link) ہے جو بڑی ہدایت اُس کی طرف اِس طرح سے ذیلی اور ضمنی راہیں جاتی ہیں، تو اگر کوئی ہندو، ہندو ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے فرائض کو انجام دیتا رہے تو کرتے کرتے وہ بالاتر ہو جائے گا اور ایک دن اُس کو یہ شعور ملے گا کہ خالق کون ہے، مخلوق کون ہے اور اِس دُنیا میں سچا مذہب کون سا ہے ۔جس دن اُس کو یہ فکر ہوگی تو یہ خدا کی توفیق سے ہوگی اور اُس ہدایت کے نتیجے میں یہ بات ہوگی جو ہر مذہب میں اُس مذہب کی حیثیت، اُس کے درجے کے مطابق، اُس کی (category) کے مطابق ہے، تو پھر کرتے کرتے وہ سوچ سکتا ہے کہ پیغمبروں کے بارے میں سوچ سکتا ہے اور خدا کے قانون کے بارے میں سوچ سکتا ہے کہ خدا نے دُنیا میں ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی ہادی بھیجا ہے، کوئی رِشی بھیجا ہے، کوئی گُرو بھیجا ہے ۔ہوسکتا ہے کہ اِس طرح کرتے کرتے وہ محمدّ عربی کو، رسولِ عربی کو پہچان لے اور کچھ لوگ ایسے ہوئے ہیں ۔پھر جب اسلام میں داخل ہوگا تو پھر مزید اُس کی جو ریسرچ ہے یا جو تلاش ہے اُس کو آگے بڑھائے گی ۔وہ کہنے لگے گا کہ اب اسلام میں کتنے فرقے ہیں، بہت سارے فرقے ہیں اُن کے بارے میں تھوڑا سا سوچنا چاہیئے کہ رسولِ عربی کے زمانے میں اصل، بنیادی بات کیا تھی، ایک یہ کہ اللہ کی کتاب تھی اور معلّمِ کتاب، تو اِس زمانے میں بھی معلّمِ کتاب کوئی ہونا چاہیئے ۔

اگر یہ بات اُس کی سمجھ میں آتی ہے تو اُس کو اسلام کے اندر جو اسلام کا (escence) ہے، جو حقیقی معنوں میں اسلام ہے اُس کی طرف اُس کو راستہ مل جائے گا، تو دیکھئے کہ ہم کہتے ہیں کہ گمراہ، ٹھیک؟ گمراہ اُس کو کہتے ہیں جو کوئی شخص راہِ راست سے ہٹ کر چلتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص چلتے چلتے، پھرتے پھرتے، تلاش کرتے کرتے اُس کو احساس ہو کہ وہ گمراہ ہوگیا ہے ۔بہت ممکن ہے جس طرح راستے سے ہٹنا ممکن ہے اِس طرح راستے پر آنا بھی ممکن ہے، تو خدا نے بیشک لوگوں کو اپنی ایک مصلحت کے تحت یعنی اسلام سے باہر پیدا کیا یا اسماعیلیت سے باہر لیکن اُس کی رحمت سے بعید نہیں ہے، قطعی مایوسی نہیں ہے کہ کوئی شخص راہِ راست پر آجائے، ممکن ہے اور اگر ایسی بات ممکن نہیں ہوتی تو ہم کو اعتراض ہوتا خدا کے اِس پروگرام پر اور خدا کے بارے میں ہم کہتے کہ خدا نے بس یعنی لوگوں کو جہاں پیدا کیا ہے وہ اپنی جگہ سے سرک نہیں سکتے ہیں، ہٹ نہیں سکتے ہیں اور دوسری بہت بڑی دلیل یہ ہے کہ ہر زمانے میں پیغمبر نے بلایا کس کو بلایا؟ سب لوگوں کو بلایا، دُنیا میں جتنے لوگ اُن سب کو بلایا اور اسلام کا جب ظہورِ کامل ہوا تو اُس وقت سب لوگ اسلام میں پیدا نہیں ہوئے تھے لیکن اسلام کی طرف اُن کو بلایا گیا اور وہ داخلِ اسلام ہوگئے، یہود سے، نصاریٰ سے اور مشرکین سے، مختلف

مذاہب سے، آتش پرستوں میں سے تو یہ ایک دلیل ہے کہ ہدایت مختلف درجات کی ہوا کرتی ہے،تو دوسرا سوال جو تھا وہ تقریباً حل ہو چکا ہے وہ اِس تحقیق کے لئے سوال تھا کہ رسولِ عربی پر ایمان لانے کی صحیح صورت کیا ہے؟ تو قرآن کی ایک آیت میں ہے کہ باقی آیتوں میں صرف خدا اور رسولؐ پر ایمان لانے کا ذکر ہے اور امام کا ذکر اِس سے الگ ہے۔ یہ ایک آیت ایسی ہے کہ اُس میں خدا پر ایمان لانا، رسولؐ پر ایمان لانا اور نور پر ایمان لانا تو اِس میں امام کا تذکرہ ہے (۷:۱۵۷)۔خدا پر ایمان لانا تو یہ خدا سے متعلق ایمان کی بات ہوگئی، رسولؐ پر ایمان لانا تو اِس میں قرآن کی بات ہوئی کیونکہ قرآن کو رسولؐ سے الگ کریں تو پھر رسالت نہیں رہتی ہے، یہ آسمانی کتاب کے ساتھ رسالت اور نبوّت ہوتی ہے یعنی میں یہ وضاحت اِس لئے کرتا ہوں کہ کوئی یہ گمان نہ کرے کہ نور پر ایمان لانے سے مراد قرآن پر ایمان لانا ہے۔قرآن پر ایمان لانا اُسی رسالت کے ضمن میں اُس کا ذکر آ گیا اور نور پر، نور پر ایمان لانے میں امام کا ذکر ہے، یہ امامؑ ہی نور ہے۔ اِس سے پتہ چلا ہے کہ یعنی اِس سے پتہ چلتا ہے کہ ایمان کسے کہتے ہیں، تو میرے خیال میں آپ کا جو اچھا سوال تھا علمی سوال تھا وہ اِن ہی الفاظ میں، اتنے الفاظ میں حل ہو جاتا ہے اور اِس میں ایک عمدہ بات یہ آ گئی کہ ہدایت جو ہوتی ہے وہ درجات پر ہے۔

کوئی چیز ہدایت سے خالی نہیں ہے لیکن ہدایت کے درجات ہیں اور سب سے اُونچی ہدایت پیغمبروں کے لئے ہے یعنی خدا سے ہم کلام ہونا، خدا سے گفتگو کرنا، خدا کے کلام کو سننا، یہ بھی ہدایت ہے مگر سب سے بلند ترین ہدایت ہے اور اسلام میں جتنے فرقے ہیں وہ ہدایت کے ایک ایک درجے پر ٹھہرے ہوئے ہیں، ایک سے ایک آگے ہے اور جو اسمٰعیلی ہے وہ یعنی خدا کی خصوصی ہدایت پر ہیں، اِن کی ہدایت بہت آگے ہے، تو پھر اِس سے وہ سوال حل ہو گیا اور یہ طے پایا گیا کہ بیشک اسمٰعیلی مذہب میں (direct) پیدا ہونا خدا کی ایک خصوصی مہربانی ہے، تاہم اِس سے باہر جو لوگ پیدا ہوئے ہیں وہ بھی امکاناً اِس طرف آ سکتے ہیں لیکن اُن کے سامنے بہت ساری دیواریں کھڑی ہیں ممکن ہے، ناممکن نہیں ہے۔ پھر اِس سے ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے، جو میں آپ کی طرف سے پیش کروں گا، یہ کہ پھر ایسا کیوں ہے کہ کچھ کو دشواری ہے اور کچھ کو آسانی ہے، یہ سوال ہے۔ اِس کا جواب یوں ہوگا کہ اُس میں خدا کی کوئی بہت بڑی حکمت ہے کیونکہ خدا کی بادشاہی بے پایان ہے کہ خدا کی بادشاہی کا کوئی سرا نہیں اور کوئی خاتمہ نہیں، اِس لئے خدا اپنی بے پایان خداوندی میں کسی نہ کسی طرح سب لوگوں پر رحم فرمائے گا اور یہ بھی اِس کے ہاتھ میں ہے۔ پھر اِن دو باتوں سے ہم قانونِ خداوندی میں، اِن دونوں باتوں کے جاننے کے بعد قانونِ خداوندی میں ہم کوئی اعتراض نہیں اُٹھا سکتے ہیں اور اِس دوسرے سوال کے جواب میں جو عرض کیا گیا اُس کا ایک حوالہ امامؑ کے قول سے، امامؑ کے فرمان سے یہ دوں گا کہ آپ عزیزوں کو یاد ہوگا کہ حضرت مولانا امام سلطان محمدّ شاہ صلوات اللہ علیہ نے اپنے ارشاداتِ گرامی میں کہیں سب لوگوں کے یکجا ہونے کا ذکر کیا ہے کسی فرمان میں تو اِس کے باوجود خداوندِ عالم مختلف وسائل سے کام لے کر مختلف سفارشات سے کام لے کر مختلف شفاعتوں سے کام لے کر سب

لوگوں کو یکجا کرے گا وہ اِس طرح سے ہے کہ دیکھئے کہ اگر ہم ویسے تو خدا کی خدائی کا کوئی آغاز نہیں، کوئی انجام نہیں (begining) نہیں،(ending) نہیں، پھر بھی یہ تصوّر سب کے نزدیک مسلّمہ ہے کہ سارے انسان ازل میں یکجا تھے اور منطق یہ بتاتی ہے کہ ازل میں جیسی حالت تھی لوگوں کی ابد میں بھی وہی حالت ہوگی۔ یعنی مطلب یہ کہ اگر یہ مانا جائے کہ ازل میں سب لوگ ایک ہی کان میں تھے، ایک ہی سمندر میں تھے، ایک ہی (source) میں تھے، ایک سرچشمے میں تھے، ایک ہی رُوح میں تھے تو پھر ابد میں یہی بات ہوگی اور درمیان میں یہ جو کچھ احوال ہیں، یہ صحیح ہیں، یہ درمیان میں ہے یعنی آج لوگوں میں جو تفرقہ ہے، آج لوگوں کے درمیان جو مختلف مذاہب ہیں، آج جو درجات ہیں، آج جو اختلافات ہیں وہ ازل میں نہیں تھے۔ ازل میں سب کی ایک ہی کیفیت تھی، وہ ایک ہی شخص کی طرح تھے: ”کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ وَاَنْزَلَ مَعَھُمُ الْکِتَابَ“ (۲:۲۱۳) یعنی ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کے دُنیا میں آنے سے اِس کے سلسلے کے آغاز سے قبل لوگ ایک ہی تھے، تو یہ کون سی جگہ تھی یا کون سا موقع تھا یا کون سا مقام تھا؟ اِس کو ہم ازل کہیں گے، عالمِ ذر کہیں گے، عالمِ شخصی کہیں گے۔ ”کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً“ دیکھیں اِس میں ایمان کا ذکر نہیں ہے، کُفر کا ذکر نہیں ہے، بس لوگوں کا ذکر ہے، اُن کی ایک جیسی حالت تھی، وہ ایک ہی تھے اور یہ بہت بڑی دلیل ہے، قرآن کی آیت ہے اور جہاں قرآن کی آیت سے کسی چیز کی وضاحت ہو جاتی ہے تو یہ بہت بڑی بات ہے۔ پھر اُس کو کوئی شخص رد نہیں کر سکتا ہے، اُس کی تردید نہیں ہے، اُس پر اعتراض نہیں اُٹھایا جا سکتا: ”کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ ص“ (۲:۲۱۳) تو یہ مقام کون سا تھا اِس کے لئے اختلاف ہو سکتا ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ مقامِ ازل تھا، کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ عالمِ ذر تھا، کوئی کہہ سکتا ہے کہ سب انسان کسی سیّارے پر ایسے تھے کہ یعنی سب ایک ہو گئے تھے چاہے وہ کافر تھے یا مومن تھے تو ایک تھے، ایک ہی حالت میں تھے، تو اِس پر اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اُن کے ایک ہونے میں ذرا بھی شبہہ نہیں ہے، تو دیکھا آپ نے کہ علم کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور اپنی جگہ پر ہم نے اِس کو تسلیم کیا کہ خدا نے یعنی جن کو اسمٰعیلی مذہب میں پیدا کیا اُن پر اُس نے ایک خصوصی احسان کیا، یہ بالکل اپنی جگہ پر ہے، اِس میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اِس کے باوجود (side) سے جتنے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں اُن سب کے لئے ایک ایک جواب موجود ہے۔ شکریہ کہ آپ نے ایک اچھا سوال کیا۔

ٹرانسکرائب: شمع گیلانی ٹائپنگ: ثناوزیر علی نظرِ ثانی: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: بہانۂ رحمت

کیسٹ نمبر: ۵۹ تاریخ: ۱اکتوبر ۱۹۸۱، کراچی

Click here for Audio

عزیزانِ من! ہماری آج یہ خواہش ہے کہ ہم بہانۂ رحمت کے بارے میں کچھ عرض کریں، یہ لفظ "بہانۂ رحمت" یعنی اُس کی رحمت کے لئے بہانے بنانا، بہانۂ رحمت ایک نیا سا موضوع ہے، یہ بہانۂ رحمت کیا ہے؟ اُس کی بے پناہ رحمت کو حاصل کرنے کیلئے کوئی بہانہ بنانا کیونکہ وہ مسبب الاسباب ہے۔ اب ہم پر یہ فرض بھی عائد ہو جاتا ہے کہ ہم مسبب الاسباب کے معنی بتائیں، کچھ احباب اِس کو جانتے ہیں سمجھتے ہیں لیکن امکان ہے کہ کچھ کیلئے یہ بات قابلِ فہم نہ ہو تو مسبب الاسباب خداوندِ عالم کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور یہ اُس کی ایک صفت ہے۔ مسبب الاسباب کے معنی ہیں: ذرائع کو پیدا کرنے والا، اسباب بنانے والا، وسائل پیدا کرنے والا یہ ہے مسبب الاسباب۔ مسبب الاسباب خالص عربی کا ایک نام ہے، مسبب الاسباب، اسباب جمع ہے سبب کی یعنی سببوں کو پیدا کرنے والا۔

آپ دیکھتے ہیں ظاہر میں کہ خداوندِ عالم نے براہِ راست کچھ نہیں کیا جو کچھ بھی کیا اُس نے ایک سبب سے کیا، ایک وسیلے سے کیا، دُنیا کو جگمگانے کے لئے اُس نے ایک سبب پیدا کیا جس کا نام سورج ہے۔ جب رات کے وقت سیارۂ زمین کی گردش سے سورج زمین کی پشت پر رہتا ہے تو اُس وقت کے لئے اُس نے ایک سبب، ایک وسیلہ بنایا جو چاند ہے پھر اُس کے بعد بہت سے ستارے۔ زمین کو سرسبز و شاداب بنانے کیلئے وسیلہ پانی بنایا، پانی کا وسیلہ نہر بنایا یا بارش بنایا، بارش کا وسیلہ بادلوں کو بنایا، بادلوں کیلئے سرچشمہ سمندر کو بنایا، سمندر سے لطیف پانی کو بخارات کی شکل میں اُٹھانے کیلئے اور اُڑانے کیلئے ہَوا کو بنایا، مختصر یہ کہ اِس وسیع و عریض کائنات کے جس گوشے میں دیکھیں گے وہاں پر ایک نہیں بہت سے وسائل، بہت سے اسباب خدا کے بنائے ہوئے آپ کو ملیں گے، تو اِسی طرح ہم یہ چاہتے ہیں کہ آج بہانۂ رحمت کے سلسلے میں تھوڑی سی گفتگو کریں۔ خدا جہاں خدا ہونے کے باوجود وسائل سے ذرائع سے اسباب سے کام لیتا ہے تو وہاں انسان کیا چیز ہوتا ہے کہ وہ کسی وسیلہ کے بغیر کسی بہانے کہ بغیر اپنے کام میں کامیاب ہو جائے اور اپنے کسی عظیم مقصد کو حاصل کر سکے۔

انسان کیا چیز ہوتا ہے وہ تو بہت ہی حقیر ہے اور بہت ہی عاجز و ناتوان ہے، ہر وقت محتاج اور بہت دفعہ نامُراد، یہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے اِس کے لئے ہزاروں رحمت کے بہانے تراشنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ بہانۂ رحمت

کیسا ہے؟ یعنی حصولِ رحمت کیلئے مومن کو بہت سے بہانے چاہئیں، بہت سے بہانے۔ آپ جب انبیائے کرام علیہم السّلام کی زندگی پرنظر ڈالیں گے تو اُن کی زندگی سے آپ کو بہت کچھ روشنی ملے گی، بہت کچھ روشنی ملے گی، لہٰذا جس قدر بھی ہوسکے آپ قرآن مقدّس کے وسیلے سے حضراتِ انبیا کی زندگی کا مطالعہ کریں اور اُن کی مقدّس زندگیوں سے آپ اعلیٰ درجے کی حکمتیں حاصل کریں۔ قرآن مقدّس کے علاوہ آپ (Bible) کا بھی مطالعہ کرسکتے ہیں آپ کے لئے اِس میں کوئی حرج نہیں ہے، جو بندگانِ باایمان اپنے دین پر مستحکم ہیں وہ دُوسری آسمانی کتابوں کو بھی پڑھ سکتے ہیں اور جو کمزور ہیں وہ دُوسری کتابوں کو نہ پڑھیں تو اچھا ہے لیکن جو صراطِ مستقیم پر مستحکم ہیں اُن کیلئے کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ دُوسری الہامی کتابوں کو پڑھیں، اِس کے لئے تجویز ہے کہ آپ کبھی حضرت داوٗدؑ کی زبور کو پڑھیں اُس میں آپ کو بہانۂ رحمت کا ایک طریقہ ملے گا۔ یہ داوٗد علیہ السّلام گریہ وزاری کے معاملے میں بہت ہی مشہور ہیں، تو آپ کو علم کا ایک نیا دروازہ کھل جائے گا کہ وہ کن مختلف بہانوں سے اپنے لیے رحمتِ ایزدی کو طلب کرتے رہتے تھے چنانچہ کبھی وہ اُن مظالم کی داستان دہراتے تھے جو دُنیا کی طرف سے اُن پر گزری تھی لیکن اُن کی ایسی شکایت بہت شاندار ہوتی تھی کہ وہ ایک بہانے کے طور پر دُنیا کے دُکھوں کا تذکرہ کرتے تھے اِس طرح سے نہیں کہ وہ کسی سے دُشمنی رکھتے تھے بلکہ نفس کو مغلوب کرنے کے لئے اور نفس کی خوشیوں کو چھیننے کے لئے ایک ایسا بہانہ تراشتے تھے۔

لہٰذا مومن کو چاہئے کہ وہ دانشمندی سے کام لے اور کبھی تو وہ دُنیا کے دُکھوں کو یاد کرے، دنیا کی تلخیوں کو یاد کرے اور وہ کچھ اِس حکمت سے یاد کریں کہے کہ خداوند مجھ پر دُنیا کی طرف سے کیسی کیسی تکالیف گزری ہیں اور لوگوں نے دین کے معاملے میں مجھے کتنا ستایا ہے یا بحیثیتِ مجموعی لوگ ہم کو کیا نہیں کہتے ہیں سامنے بھی اور پیچھے بھی اور جو بھی زندگی میں مومن پر تلخی گزری ہو یا جو بھی دُکھ آیا ہو اُس کو سامنے رکھے مومن تا کہ اُس کے دل میں ایک قسم کی رقّت، ایک قسم کی نرمی پیدا ہو جائے گی یا ایک میٹھا سا شکوہ یا ایک پُرحکمت شکایت پیدا ہوگی، کیونکہ باپ کے پاس اپنے دُکھوں کی شکایت کرنا بڑا اچھا لگتا ہے اور دوست کے پاس غم داستان بیان کرنا بہت صحیح ہے، اور ایسے میں اگر اُس کی رحمت دستگیری کرے تو دل بڑا نرم ہو جاتا ہے اور جسے ہی بندۂ مومن کا دل نرم ہو جاتا ہے ویسے ہی اُسی کے ساتھ ساتھ ہی رحمتِ خداوندی کا ایک دروازہ کھل جاتا ہے یہی نہیں اور بھی بہت سے بہانے ہو سکتے ہیں۔ کبھی تو خداوندِ عالم کے احسانات کو، اُس کی نعمتوں کو سامنے لایا جائے اور ہر نعمت پر نظر ڈالی جائے جو اُس کی طرف سے میسّر آئی ہے اور پھر اپنی طرف سے جس طرح شکر گزاری میں کمی ہوئی ہے، جس طرح اُس کے شکر سے زبان قاصر رہی ہے جس طرح بندۂ مومن سے حقِ شکر گزاری ادا نہیں ہوا ہے اُس کی طرف توجّہ کی جائے اور اگر خداوندِ عالم کی رحمت شاملِ حال رہی تو ایسے میں دل کے اندر نرمی کی کیفیت پیدا ہو جائے گی، دل کے اندر نرمی کی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور نفس جو ہے وہ مغلوب ہو جائے گا اور پھر رُوحانیت کا جو راستہ ہے رحمت کا جو

راستہ ہے وہ کشادہ ہو جائے گا۔

ایک یہ اور اگر مومن میں بصیرت ہے، اگر مومن میں دانشمندی اور عقل کی آنکھ ہے تو بلا شبہ وہ اپنے ظاہر و باطن میں خدا کی بہت ساری نعمتوں کو پائے گا بلکہ کہنا چاہئے کہ وہ خود کو احسانات ِخداوندی کے بوجھ کے تلے دبا ہوا پائے گا یا یوں کہنا چاہئے کہ وہ [خود کو] رحمت ِخداوندی کے سمندر میں ڈوبا ہوا پائے گا۔ اگر مومن کی وہ آنکھ پیدا نہیں ہوئی ہے تو وہ سوال الگ ہے نہیں تو مومن اُس کا مقام، اُس کا رُتبہ اور یہ صراطِ مستقیم یہ دینِ مبین اور یہ امام برحق، یہ روشنی، یہ ہدایت یہ صداقت ، یہ امامؑ کی شفقت و مہربانی، یہ اُس کا دیدار، یہ اُس کی شناخت اور یہ ست پنتھ اور یہ مومن کی صحبت اور یہ علمُ الیقین اور کل کی اچھی اچھی اُمیدیں تو یہ نعمتیں ایسی ہیں کہ ہم اگر اندھے ہیں اور ہماری آنکھیں شروع سے تاریک ہیں یا بعد میں تاریک ہو چکی ہیں تو پھر اُس صورت میں ہم اِن نعمتوں کو نہیں دیکھ پائیں گے اور اگر ہم میں تھوڑی سی بصیرت ہے اور دیدۂ دل بینا ہے تو ہم اِس راہِ مستقیم پر چلتے ہوئے اپنے چوگرد میں بہت سی نعمتوں کو دیکھیں گے، بہت سی نعمتوں کو دیکھیں گے اور بہت سے احسانات کا ہم کو احساس ہوگا، ایسی نعمتیں اور ایسے احسانات کہ اگر ہم کو ہفت اِقلیم شہنشاہ بنایا جاتا اور ہم سے دین کی یہ ساری نعمتیں چھین لی جاتیں تو ہمارے لئے اُس میں کچھ بھی بھلائی نہیں ہوتی اور ہم گھاٹے میں ہوتے خسارے میں ہوتے اور سر تا سر نقصان میں ہوتے۔ کتنا ہی اچھا ہوا کہ ہم دُنیا کی کسی بڑی عزت میں پیدا نہیں ہوئے لیکن ہم درویش اور مفلس ہونے کی باوجود اِس راہِ مستقیم پر لگا دئے گئے اور دامنِ مولا سے ہم کو وابستہ کیا گیا اور اِس مقدّس گھر کی غلامی ہم کو نصیب ہوئی، اِس پاک و پاکیزہ چشمے سے پانی کا پینا نصیب ہوا تو کتنی عظیم سعادت ہے مومنین! جو آپ کو، ہم کو نصیب ہوئی لہٰذا رحمت کا ایک بڑا بہانہ یہ ہے کہ ہم اپنے دل سے کدورتوں کو، آلائیشوں کو دُور کر کے اِس نعمت کا تذکرہ کریں اِس کو یاد کریں تا کہ اسی طرح سے ہمیں ایک مزید رحمت کے حاصل کرنے میں یہ طریقِ کار جو ہے ممد و معاون ثابت ہو جائے۔

بہانۂ رحمت مومن کیلئے بہت ہی ضروری ہے اور اِس طریقِ کار سے انبیا علیہم السّلام نے فائدہ اُٹھایا ہے، لفظوں کی کوئی بات نہیں ہے لیکن یہ چیز انبیا علیہم السّلام کی زندگی میں آپ کو ملے گی جب آپ اُن کی زندگی کا مطالعہ کریں گے تو ہر مقام پر یہ چیز ملے گی اور رحمت کا ایک تیسرا بہانہ یہ ہے کہ اپنی کوتاہیوں کو سامنے رکھیں۔ ایسا نہیں سوچنا کہ ہم قصوروار نہیں ہیں، دیکھئے! یہ ادب ہے، یہ تمیز ہے کہ ہم اپنے آپ کو خداوند کے سامنے قصوروار ٹھہرائیں یہ حضرت آدمؑ سے سنّت رہی ہے کہ انہوں نے چھوٹی سی بات کو بہت بڑی نافرمانی تصوّر کیا ہے اور ہمیشہ اُن کی توبہ بہت دیر تک جاری رہی ہے اور انہوں نے خدا کی ہدایت کی روشنی میں کافی آنسو بہائے ہیں، اور یہی سنّت تمام پیغمبروں میں قائم رہی ہے کہ چھوٹی سی غلطی کو بڑا گناہ تصوّر کیا جائے یہ ادب ہے یہ تواضع ہے، یہ انسانیت ہے اور یہ ایمان کا تقاضا ہے اور یہ عاشقی اور معشوقی کا اُصول ہے کہ جو عاشق ہے اور جو حقیقی عاشق ہے وہ اپنے محبوب کی خاطر محبوب کے خلاف، اُس کی منشاء کے خلاف کوئی حرکت نہیں کرتا

اور اگر قضاعاًاتفاق سے کوئی ایسی غلط حرکت سرزد ہوئی تو اُس کیلئے وہ آنسو بہاتا ہے، معافی چاہتا ہے۔ لِہٰذا رحمت کا ایک بہانہ جو ہے وہ ندامت کے آنسو ہیں، توبہ ہے اور اپنی کوتاہیوں پر نظر ڈالنا ہے۔ ایسا نہیں سوچا جائے کہ میں پاک اور مقدّس ہوں، میں بے عیب ہوں، پاک و بے عیب ایک ہی ذات ہے جو برتر ہے جو خداوند ہے جو مالک حقیقی ہے اور وہی ایک پاکیزگیوں کا سرچشمہ ہے، تقدّس کا مرکز ہے۔ باقی جتنے ہم ہیں انسان ہیں وہ قصوروار ہیں یہ عادت ایسی ہے کہ اِس کے وسیلے سے مومن کافر سے اور منافق سے ممتاز ہو جاتا ہے منافق کبھی ایسا نہیں کرتا ہے، کافر کبھی ایسا نہیں سوچتا ہے کہ اُس کی کوئی غلطی ہے شیطان نے ایسا نہیں سوچا، اُس نے تو قصور کی نفی کرنے کیلئے اپنی ذات سے قصور اور گناہ کی نفی کرنے کے لئے کوشش کی اور اِس سلسلے میں اُس نے خدا سے مناظرہ کیا، خدا سے بحث کی۔ کسی نے ذات خداوند سے بحث نہیں کی، کسی نے مناظرہ نہیں کیا، کسی نے اپنے گناہ کی نفی کرنے کے سلسلے میں خدا کی حضور میں دلائل پیش نہیں کئے مگر ایک ابلیس تھا یعنی شیطان تھا، اُس نے کہا کہ کیوں کروں اور اِس لفظ پر بھی اُس نے بس نہیں کیا، کہا کہ تو نے جس کو مٹّی سے پیدا کیا ہے، کیا میں جو روشنی سے پیدا کیا گیا ہوں ایسی خاکی مخلوق کے سامنے سربسجود ہو جاؤں یہ کہاں کا انصاف ہے؟ تو اِس مقام پر ابلیس نے خدا کے ساتھ مناظرہ کرنے کی جرأت کی، خدا کہ ساتھ بحث کرنے کی گستاخی کی تو پھر ایک گناہ پر دُوسرا گناہ ہوا، ایک گناہ پر دوسرے گناہ کا خول چڑھ گیا۔

کہنا یوں ہے کہ مومن اپنے لئے رحمت خداوندی کا ایک بہانہ بنائے اور یہ بہانہ اپنی کوتاہیوں سے بنائے، تو اِس کے علاوہ مومن ایک اور بہانہ بنا سکتا ہے رحمتِ خداوندی کے لئے، اور وہ یہ ہے ماضی میں جو ہمارے پیر ہوئے، جو بزرگ ہوئے ہیں، جو سلمانؓ تھے، جو ابو ذرؓ تھے، جو ہمارے عظیم پیر تھے حجّت، داعی اور دیگر بزرگ تھے اُن کا تصوّر کیا جائے اُن کی خدمات کا تصوّر کیا جائے، اُن کی رُوحانی بلندی کا تصوّر کیا جائے اور اپنے اندر ایک رشک، ایک شوق، ایک جذبہ ایسا پیدا کیا جائے کہ جس سے دل پگھل جائے۔ اُن کی ترقّی کو اُن کی عظمت و بزرگی کو سامنے رکھ کر بندۂ مومن آنسو بہائے اور گڑ گڑائے اور کہے کہ خداوند! ایک وہ بزرگ تھے جن کو اتنی سعادت اور ایسی خدمات انجام دینے کی فضیلت نصیب ہوئی، ایک ہم ہیں جو ایک ایسے کیڑے کی طرح رینگتے ہیں جو انسانوں اور جانوروں کے پیروں کے نیچے پامال ہو جاتا ہے رحمتِ خداوندی کیلئے بہانہ یہ بھی ہے۔ اسی طرح مومن اپنی مناجات کو جو خدا کے ساتھ ہوتی ہے اُس کو بڑھا سکتا ہے، قرآنِ مقدّس کی ایک آیت میں یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ جب بندۂ مومن دُعا کو طول دیتا ہے تو لامحالہ خداوندِ عالم کو وہ دُعا قبول کرنی ہوتی ہے اور گڑ گڑا کر جو دُعا مانگی جاتی ہے وہ تو ہمیشہ اور ہر وقت قبول ہو جاتی ہے (۲:۱۸۶)۔ مگر یاد رہے کہ جو چیز ہم مانگتے ہیں اگر اُس کے انجام میں ہمارے ایمان کو ضرر پہنچنے والا ہے ہمارے دین کو، تو وہ مہربان اپنے علم کی روشنی میں اُس کو دیکھتا ہے اور ایک ایسی چیز کے عنایت کرنے کی جگہ پر وہ کوئی اور مہربانی کرتا ہے۔ اِس صورت میں ہماری کوئی عاجزانہ

دُعا رائیگان نہیں جاتی مگر ہر حال میں اُس کا ایک عوض ملتا ہے اُس کے نتیجے میں ایک رحمت حاصل ہوتی ہے۔ناممکن ہے کہ مومن کی عاجزانہ دُعا ضائع جائے ۔ ہاں! میں نے کہا اور عرض کیا کہ اگر ہم اپنی نادانی سے اور ناعاقبت اندیشی سے ایک ایسی چیز کو چاہتے ہیں کہ وہ چیز انجامِ کار میں ہمارے لئے مضر ،نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے تو خداوند جو ہمارا وکیل ہے وہ اپنی رحمت سے ہماری دُعا کے رُخ کو دُوسری طرف پھیر دیتا ہے اور کسی اور نیکی کو ہماری لئے ٹارگٹ بنا کے اُسی نیکی کو عنایت کرتا ہے یا یہ کہ ہماری کوئی مشکل آسان ہو جاتی ہے یا یہ ہے کہ ہمارے کوئی بلا رد ہو جاتی ہے یا یہ ہے کہ آنے والی کوئی بیماری جو ہے وہ ٹل جاتی ہے یا یہ ہے کہ کوئی اور آفت جو ہم پر آنے والی تھی وہ ہٹ جاتی ہے لیکن دُعا کبھی ضائع نہیں جاتی۔

ہاں! یہ بات بھی یاد رہے کہ ضروری نہیں ہے کہ اِن عاجزیوں اور دُعاوؤں کی بدولت مومن جو ہے ہر چیز سے محفوظ رہے یہ ضروری نہیں ہے کیونکہ مصلحت اِسی میں ہے کہ دُنیا کے اندر تکالیف کا ایک حصّہ مومن جی لے، برداشت کرے، یہ خدا کی دوستی کا ثبوت ہے عاشقی کا ثبوت ہے کہ عاشق وہ نہیں ہے جو راہِ عشق میں تکلیف سے بھاگے پھر تو ایسا عاشق کیا عاشق ہو سکتا ہے؟ وہ تو نامراد ہے ،لہٰذا جیسا کہ امامؑ کے فرمان مقدّس میں بھی یہ ارشاد ہوا ہے کہ امام کی عمدہ دعاوؤں کے باوجود تکالیف کا ایک حصّہ مومن کو جھیلنا ہے۔اُس میں مصلحت ہے، اُس میں حکمت ہے ہاں! تو اُس صورت میں عبادت کا ایک فائدہ ہے یہ کہ مومن کو ایسی تکالیف کے جھیلنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے، ذکر، عبادت، بندگی۔اُس میں برداشت کا مادّہ پیدا ہوتا ہے، صبر کی قوت آتی ہے اور تکلیف کی وہ تلخی شیرینی میں تبدیل ہو سکتی ہے یہ تو لازمی بات ہے۔مثال کے طور پر حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: خدا کی حضور سے آزمائش آنے کے چار درجے ہیں، سب سے بھاری آزمائشیں جو ہیں وہ انبیاء علیھم السّلام کی ہیں، دُوسرے درجے کے امتحانات اساسوں پر، تیسرے درجے کی آزمائشیں اماموں پر اور چوتھے درجے کی تکالیف یا بلائیں مومنین پر۔مگر آپ سوچ سکتے ہیں اور اچھی طرح سے سوچ سکتے ہیں کیا جب انبیاء علیھم السّلام پر یا اماموں پر تکالیف آتی ہیں تو اُن کو وہ تکالیف بہت تلخ لگتی ہیں یا اُن پر بہت تلخی گزرتی ہے جیسا کہ ایک عام انسان سوچتا ہے۔حضرت امام حسین صلوات اللہ علیہ پر شہادت کا جو امتحان آیا اِس کے متعلّق ایک عام انسان کا کیا تصوّر رہے اِس کی کیفیت کیسی تھی؟ کیا ہم سوچ سکتے ہیں اور ہمیں سوچنے کے لئے کیا اجازت ہے؟ یقیناً اجازت ہے۔جہاں امام شناسی کے دروازے ہم پر کشادہ ہیں، کھلے ہوئے ہیں اور ہمیں انسانِ کامل کی شناخت کے لئے فرمایا گیا ہے تو ہم اِس کیفیت کے بارے میں کیوں نہ سوچیں، ضرور سوچیں اور سوچنا چاہئے۔جیسے ہی سوچیں گے اور صحیح طور سے سوچیں گے اور صحیح نتیجے کو پائیں گے تو ہمارا ایمان امامؑ کے متعلّق، نور کے متعلّق مضبوط ہو جائے گا۔لہٰذا ایسا نہیں سوچنا کہ حضرت امام حسینؑ پر جو امتحان آیا تھا تو اُس امتحان سے اُن کا جو موڈ ہے یا اُن کے دل کی جو کیفیت تھی وہ ایک ایسے شخص کی کیفیت سے ملتی جلتی تھی جو بہت عام شخص ہوتا ہے اور اُس پر کسی بلائے ناگہان کے آنے سے اُس پر بہت ہی تلخی گزرتی ہے، بہت ہی تلخی گزرتی ہے، بہت ہی تلخی گزرتی

ہے ۔کیا حضرت امام حسین صلوات اللہ علیہ پر ایسی تلخی گزرتی تھی؟ اگر اِس کو مان لیا جائے اور اِس طرح سے سوچا جائے تو پھر انسانِ کامل اور انسانِ ناقص میں کیا فرق رہا؟ ایک امام اور ایک مُرید میں کیا فرق ہوا؟ اور کسی میں نور کے ہونے میں اور نہ ہونے میں کیا فرق رہا؟ یہ بات نہیں ہے، یہ بات نہیں ہے، دوستو! یہ بات نہیں ہے ۔آپ اچھی طرح سے سوچیں ''اَلْمَوْتُ رَیْحَانَۃُ الْمُؤْمِنِ'' انسان کا ایمان جس قدر بلند ہوتا جاتا ہے اُس قدر انسان کی موت سے محبّت ہوجاتی ہے اور وہ موت مومن کے لئے ایک گلدستے کی طرح نظر آتی ہے ۔ ''اَلْمَوْتُ رَیْحَانَۃُ الْمُؤْمِنِ: موت مومن کا گلدستہ ہے'' تو گلدستے سے کسی کو خوشی ہوتی ہے، اُس کے رنگوں سے، اُس کی خوشبوؤں سے، اُس کی رونق سے، اُس کی نزاکت سے، تو موت جو ہے وہ مومن کی دوسری شادی ہے ۔

موت کی بدولت مومن عالمِ بالا کی طرف پرواز کر جاتا ہے تو پھر موت سے مومن کیوں گھبرائے؟ اور قرآن کے اندر ہے کچھ کافروں کے متعلّق ارشاد ہوا ہے، یہود و نصاریٰ کے بارے میں فرمایا گیا ہے تم یہ خیال کرتے ہو کہ جنّت صرف تمہارے نام پر ہے، اگر تم اپنے اِس گمان میں، اِس خیال میں صحیح ہو اور حق بجانب ہو تو تم موت کو دوست رکھو اور مرنے کی آرزو کرو (٦:٦٢) مرنے کی خواہش کرو تو تب پتا چلے گا کیونکہ مرنے سے گھبراتا وہ ہے جس کی رُوح صحیح نہیں ہے، تو میں اُس نکتہ کی وضاحت کر رہا تھا کہ شہادت عظمیٰ جو ہے وہ حضرت حسینؑ کی نظر میں کیسی تھی؟ پہلے ہی سے پتا چلا تھا کہ اُن کو شہادت ہے، تو پھر امامؑ نے اُس شہادت سے گریز کیوں نہیں کیا؟ وہ چاہتے گریز کرتے وہ چاہتے کوئی بہانہ بناتے، وہ چاہتے مصلحت کرتے لیکن نہیں! نہیں!!! امامؑ جو ایک نور ہے اُس کے لئے ایک جامے کی تبدیلی سے کیا ہوتا ہے؟ کچھ بھی نہیں ہوتا ہے، تو بات کیا تھی، بات یہ تھی کہ آزمائشیں جو ہیں وہ آتی رہتی ہیں اور مومن عبادت و بندگی میں قائم رہے تو اِس کی بدولت اور اِس کے نتیجے میں آنے والی مصیبتیں یا تو ٹل جاتی ہیں یا اگر اُن کے آنے میں مصلحت ہے تو وہ مصیبتیں اور آزمائشیں جو ہیں بھاری نہیں لگتی ہیں، کڑوی نہیں لگتی ہیں، اُن سے تلخی کی کیفیت نہیں ہوتی بلکہ اُن کا ایک ایسا نتیجہ سامنے آتا ہے کہ پھر مومن کی رُوحانی ترقّی ہوتی ہے ۔آپ اُس آیت کو آیتِ استرجاء کو پڑھیں: ''وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ ○ اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ'' (٢:١٥٥۔١٥٧) تو مصیبتیں جب آتی ہیں تو اُن کے نتیجے میں مومنین کو رُجوع ہوتا ہے خدا سے، وہ دو طرح سے، تین طرح سے ۔ایک یہ کہ دُعا کے لئے رُجوع کرنے کا موقع ملتا ہے، ایک یہ کہ عملاً اُن کو رُوحانی ترقّی ملتی ہے، ایک یہ کہ قیامت کے دن کُلّی طور پر اور (totally) اُن کو ایک علیٰ مقام ملتا ہے اور یہ مصیبتیں جو دُنیا میں آتی ہیں اُن میں ہی حکمت ہے، مگر جو ایمان سے خالی ہیں اور جو مومن نہیں ہیں اُن پر جو مصیبتیں آتی ہیں وہ عذاب کی صورت میں ہیں، اِن مصیبتوں سے اُن کو

کچھ فائدہ نہیں ہے، تو مومن کی آسائش بھی رحمت ہے اور تکلیف بھی رحمت ہے، آسائش اِس معنیٰ میں رحمت ہے کہ وہ خداوندِ عالم کی نعمت ہے، اِس میں شکر گزاری کرنی چاہئے اور تکلیف بھی رحمت ہے، اِس لئے کہ اُس تکلیف کے نتیجے میں ایک رُوحانی ترقّی ہونے والی ہے۔ گناہ معاف ہونے والا ہے، اِس تکلیف کی بدولت مومن رُجوع کرتا ہے، خداوند کو یاد کرتا ہے اور گریہ وزاری کرتا ہے، گڑگڑاتا ہے۔ یہ اِس مومن کی تعمیر کے لئے ہے، اِس کے اندر تعمیری پہلو ہے، مصیبت کے اندر، تکلیف کے اندر، موت کے اندر یہ چیزیں ہیں۔ اِن کو اِسی طرح سے لینا ہے، اِن کو اسی طرح سے سمجھنا ہے اور اِن کے متعلّق یہ تصوّر رکھنا ہے۔

عزیزانِ من! ہماری اصل بات کیا تھی؟ اصل بات یہ تھی کہ مومن اپنے لئے مختلف اندازوں سے رحمت کا ایک بہانہ بنائے اور تمام بہانوں کا مقصد کیا ہے؟ رُجوع ہے اور کیا مقصد ہے؟ عاجزی ہے، انکساری ہے اور کیا مقصد ہے؟ خدا سے جو ہماری مناجات ہے اُس کو طول دینا ہے، اُس دُعا کو لمبی بنانا ہے۔ جس قدر زیادہ ہم خدا سے گفتگو کریں، خدا کے حضور میں گڑگڑائیں اُس قدر فائدہ ہے تاکہ ہم خداوندِ عالم سے رُجوع کرسکیں، اُس کی مقدّس بارگاہ کی طرف متوجّہ ہوجائیں اور ہر وقت اُس کو یاد کریں، اُس کو پکاریں۔ اِس کے لئے سب سے پہلے علم کی ضرورت ہے اور علم ہی یہ دولت عطا کرتا ہے، ہم کو روشنی بخشتا ہے، ہم کو طریقہ بتلاتا ہے ایمان کا، درویشی کا، عاشقی کا، سچائی کا، خلوص کا، محبّت کا اور جتنے بھی انسانیت کے اعلیٰ اوصاف ہیں وہ اوصاف ہم کو علمُ الیقین عطا کرتا ہے اور علم ایک آسان شیٔ ہے مومن کے لئے اور رُوحانی ترقّی اِس کے بعد کی چیز ہے، رُوحانی ترقّی آسان نہیں ہے۔ لہٰذا علم کا سہارا لیا جائے، علم کی سواری سے فائدہ اُٹھایا جائے، علم کے ہتھیار سے لیس ہوکر شیطان کے خلاف اور نفس کے خلاف جنگ کی جائے تب ہی تو مومن کامیاب ہوجائے گا۔ اِس لئے عزیزانِ من! وسیلۂ رحمت اور بہانۂ رحمت کے متعلّق نہ بھولئے گا، مختلف بہانوں سے مختلف طریقوں سے لیکن جائز طریقوں سے، مناسب طریقوں سے، سُلجھے ہوئے طریقوں سے مومنین کو رحمتِ خداوندی حاصل کرنی ہے اور ایک اور وسیلہ یا کہ بہانہ میں آپ کو بتلاتا ہوں کہ دُنیا کے اندر مومنین میں سے جو مصیبت زدہ ہیں، جو دُکھی ہیں مگر ایمان سے اچھے ہیں، دل سے اچھے ہیں تو اُن کی ہمدردی میں آپ اپنے دل کو جلائیں تھوڑی دیر کے لئے، ہوسکے تو اُن کے ساتھ بیٹھیں، اُن کے ساتھ مل کر دُعا کریں جس کو کوئی درد ہو، کوئی دُکھ ہو یہ بھی ایک بہانہ ہے اور دیکھئے کہ اسلام میں جو خدا کا دین ہے ایک چیز عیادت ہے، بیمار پُرسی۔

اِس بیمار پُرسی میں دو پہلو ہیں، ایک پہلو کا براہِ راست تعلّق اُس بیمار سے ہے کہ اُس کو حوصلہ ملتا ہے، وہ خوش ہوتا ہے جب آپ ملتے ہیں اور اُس کو حوصلہ دلاتے ہیں اور دوسرا جو پہلو ہے اُس کا تعلّق آپ کی ذات سے ہے اور وہ یہ کہ ایک حقیقی مومن جب کسی بیمار کے پاس جاکے اُس کی حالت پوچھتا ہے اور ملاقات کرتا ہے تو اُس وقت اِس مومن کے دل میں جلن یعنی پگھل جانے کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے جسے ہمدردی کہا جاتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ ہمدردی میں اِس کا دل جو ہے بہت نرم ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اِس ہمدردی میں آہستہ آہستہ اِس کی آنکھیں پُرنم ہوجائیں تو اِس ہمدردی سے اِس کو

ثواب ملتا ہے اور عبادت کا جو راستہ ہے وہ کشادہ ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح ایک دوسرا لفظ ماتم پُرسی ہے، ماتم پُرسی کا مطلب کسی موت کے مقام پہ جا کے اُن کی خاطر داری کرنا یا اُن کی دُعا میں شرکت کرنی ہے اور ہماری مقدّس جماعت کی جو رُسومات ہیں اُن کے مطابق یہ سب کچھ ممکن ہے اور اگر آج کے ترقّی کے زمانے میں یہ چیزیں اگر ممکن نہیں ہیں یا معاشرے میں یہ چیزیں کم ہوگئی ہیں تو کوئی بات نہیں ہے اور اگر یہ چیزیں جاری ہیں تو جو چیز جاری ہے میں اُس کی حکمت بتانا چاہتا ہوں اور اُس کی حکمت یہ ہے جو میں نے بتایا کہ اسلام کے اندر ہمدردی سے متعلّق جتنی رُسومات ہیں اُن سب میں حکمت ہے کہ اُس موقع پر خدا سے رُجوع کرنا ہوتا ہے اور پھر دل جو ہے ہمدردی میں پگھل جاتا ہے، تو یہ بھی رحمتِ خداوندی کے لئے ایک بہانہ ہے اور ایسے بہت سے بہانے ہیں اور ایک بہانہ یہ ہے کہ آپ اعلیٰ سے اعلیٰ دینی کتابوں کا مطالعہ جاری رکھیں، ایسی کتابیں کہ جن کے پڑھنے سے آپ کے دل کے اندر دین کا جو تصوّر رہے وہ اُجاگر ہو جائے، وہ روشن ہو جائے اور دینی احساسات کا زور ہو اور جو انسان کی کمزوریاں ہیں وہ رفتہ رفتہ دُور ہو جائیں، تو یہ ایک رحمت کا بہانہ یعنی فرامین، گنان اور دوسری دینی کتابوں کا مطالعہ ہے۔ اِس کے علاوہ اور رحمت کا ایک بہانہ مومنین کی صحبت ہے کیونکہ صحبت بہت بڑی چیز ہے یعنی ہم نشینی اور مولائے رومؒ نے اِس موضوع پر بہت سی تفصیلات بتائی ہیں کہ نیک انسان کی صحبت انسان کو نیک بنا دیتی ہے اور بد انسان کی صحبت بدی کی طرف رستہ بتلاتی ہے۔ اِس لئے مومنین کی محفل، مومنین کی ہم نشینی جہاں عبادت ہوتی ہے، جہاں نیکی کی ترغیب و تشویق ہوتی ہے اُس کی طرف رجحان ہونا چاہیئے۔ اِس کے علاوہ آپ کے جتنے ساتھی ہیں وہ نیک ہوں یعنی بُری صحبت سے اعتراض کیا جائے اور مومنین کے ساتھ دوستی مستحکم ہو اور اُن کے ساتھ بیٹھ کر دین کی باتیں کی جائیں، تو یہ بھی رحمت کا ایک بہانا ہے اور جب خداوندِ عالم مومن کی انفرادی ہدایت کرتا ہے، اُس کو توفیق عنایت کرتا ہے تو مومن کے دل میں اِس سلسلے کی بہت سی چیزیں آتی ہیں یعنی اُس کو پتا چلتا ہے کہ رحمت کے کیا کیا بہانے ہیں اور حصولِ رحمت کے لئے کیا کیا وسیلے ہیں۔ بہرصورت انبیا علیہم السّلام کی جو زندگی ہے اُس کا مطالعہ بہت ضروری ہے، قرآنی قصّے کو یاد کرنا بہت ہی ضروری ہے کیونکہ قصّے کی شکل میں قرآن کے ایک حصّے کو ذہن میں رکھنا بہت سودمند کام ہے، بہت مفید کام ہے۔

عزیزانِ من! درمیان میں اگرچہ ہم نے بارہا قرآن کا تذکرہ کیا ہے تاہم اِس دفعہ بھی اِس ضمن میں بات کرتے ہیں، دیکھئے! آج کے زمانے میں قرآن ایک ایسا خزانہ ہے کہ جس سے لوگ فائدہ نہیں اُٹھا رہے ہے۔ ایسے میں جو ہوشمند مومنین ہیں اُن پر فرض ہے کہ اِس خدائی خزانے کی طرف رُجوع ہو جائیں اور اِس سے لازوال دولت کو پائیں۔ مومنین کے لئے کیا ڈر ہے کہ قرآن کی حکمتوں کو پائیں۔ جب وہ امام کو پہچانتے ہیں اور مانتے ہیں اِسی کے ساتھ ساتھ قرآنی دولت بھی ہو تو پھر کس چیز کی کمی رہتی ہے؟ رسولِ اکرمؐ نے اپنے آخری وقت میں جو اُمّت کے لئے وصیّت فرمائی تھی اُس اہم

ترین وصیت میں یہی دو بھاری چیزیں تھیں۔ایک تو قرآن تھا جو خدا کی کتاب کے عنوان سے یاد کیا گیا تھا اور ایک امامؑ تھا جو عترت اور اہلِ بیت کے عنوان سے یاد کیا گیا تھا۔آج الحمدللہ! اسماعیلیوں کے پاس امام بھی ہے اور قرآن کا خلاصہ بھی ہے یعنی قرآن کا (essence) بھی ہے، قرآن کی رُوح بھی ہے اور اگر ہم قرآن کی حکمتوں میں جائیں، اُن میں غور کریں، اپنوں کو اِس سے فائدہ دلائیں، بوقتِ ضرورت دوسروں کو اِس سلسلے میں قرآن سے بات کریں تو کتنی ہی مضبوط بات ہوگی اور کتنی ہی اچھی بات ہوگی۔لہٰذا خانۂ حکمت نے یہ ایک پروگرام بنایا ہے کہ اسمٰعیلی نکتۂ نگاہ سے اور اپنے بزرگانِ دین نے جو کچھ قرآنی حکمت کے اُصولات بتائے ہیں اُن کی روشنی میں قرآن سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں۔کیا آپ کو یقین نہیں آتا ہے کہ امام کے پاس قرآن ہے اور اگر آپ اور ہم مانتے ہیں قرآن کے پاس امامؑ ہے تو اِس کا کیا مقصد ہوگا؟ اِس کے کیا معنی ہوں گے؟ امام کے پاس ایک دولت ہے تو وہ دولت سب سے پہلے کن کے لئے ہے؟ آپ بتائیں گے یقیناً اسماعیلیوں کے لئے ہے، تو پھر؟ امام ہاتھ بڑھا رہے ہیں رحمت کے حصّے کو دینے کے لئے۔ہم ہیں کہ بس ہاتھ باندھے ہوئے ہیں اور پیچھے کو چلتے ہیں یعنی کتنی ہی سہل بات ہے کہ اسمٰعیلی جو ہیں امامؑ کے نور کی روشنی میں قرآن کے بھیدوں کو پائیں، قرآن کی حکمتوں کو پائیں۔یہ بہت اہم کام ہے اور اگر امام قرآن کا نور ہے تو اِس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ امام قرآن کی روشنی بہت دُور والوں کو پہلے پھیلائیں گے، اُن کو دے دیں گے پہلے جو اُس کے قرب میں ہیں، جو اُس کے نزدیک ہیں، جو امام کو نور مانتے ہیں تو قرآن کا علم اُن کو ملنا چاہئے۔کیا امام شناسی کے سلسلے میں آپ اگلی قطار میں بیٹھے نہیں ہیں؟ کیا آپ امامؑ کے رُوحانی فرزند نہیں ہیں؟ آپ کو اگر بھروسہ ہے، اعتماد ہے تو بسم اللہ میدان میں اتریئے اور پھر دیکھیں کہ امام کس شان سے آپ کو قرآن کے علم سے نوازتے ہیں، کیسے کیسے بھید بتاتے ہیں۔امامؑ ہی آپ کو بتائیں گے، کوئی اور نہیں، اِس کے خزانہ دار امام ہیں، اِس کے مالک امام ہیں۔کیا قرآن میں یہ ذکر نہیں ہے کہ خدا نے نور کو بھیجا اور قرآن کو بھیجا (۵:۱۵)۔پہلے اِس میں نور کا ذکر ہے پھر قرآن کا ذکر ہے کیونکہ اپنے وقت میں یہی نور آنحضرتؐ تھے کہ آنحضرتؐ پہلے دُنیا میں آئے، پھر قرآن نازل ہوا، اِس لئے اِس آیت کے اندر جس میں نور کا ذکر ہے اور کتاب کا ذکر ہے تو پہلے نور کا نام لیا گیا، اُس کے بعد کتاب کا۔اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ نور، نور ہے وہ ایک روشن حقیقت ہے، وہ ایک زندہ نور ہے اور کتاب کتاب ہے۔کوئی شک نہیں یہ کتاب آسمانی کتاب ہے، کوئی شبہ نہیں یہ کتاب خدائی کتاب ہے، اللہ کی عزیز کتاب ہے، اللہ کی پیاری کتاب ہے پر اِس کے لئے ایک نور بھی ہے، تو آپ ہی کو سب سے پہلے نور کی بدولت اور نور کے وسیلے سے قرآن کے جو بھید ہیں، قرآن کے جو اسرار ہیں، قرآن کے جو خزانے ہیں وہ آپ کو مل رہے ہیں، اِس کے لئے باور کیا جائے، اِس کے لئے جدوجہد کی جائے۔دُنیا کے اندر کسی بڑے ارادے کے بغیر، بڑی قربانی کے بغیر، وقت کی قربانی کی بغیر کوئی کامیابی نہیں ہے۔کسی بڑے منصوبے میں وقت کی قربانی لازمی ہوتی ہے، اِس کے بغیر کوئی کام انجام

نہیں پاتا۔ اِس کے لئے آپ عزمِ صمیم سے کام لیں اور قرآن کے سلسلے میں کچھ کام کر کے دکھائیں، کچھ کار ہائے نمایاں کر کے دکھائیں اور دکھانا جو ہے وہ رِیا کے طور پر نہیں ہے تاکہ ثابت ہو جائے کہ اسماعیلیوں کے پاس یہ چیز ہے، اسماعیلیوں کے پاس یہ چیز ہے اور اِس سے جماعت کو فائدہ ہو، مذہب کو مضبوطی ہو۔ ہمیں براہِ راست دوسروں سے بحث کرنے کے لئے اجازت نہیں ہے اسماعیلیوں کو۔ امامؑ کی اِس سلسلے میں ایک پالیسی ہے یعنی امام کی ایک حکمت عملی ہے۔ اِس حکمت عملی کے تحت ہم کسی سے دین کے سلسلے میں مناظرہ نہیں کر سکتے ہیں، ہم آزاد نہیں ہیں لیکن ہم خود کو مضبوط بنا سکتے ہیں، اپنوں کو بتا سکتے ہیں اور جب ہم علمی طور پر مضبوط ہو جائیں گے اور ہمارے پاس اعلیٰ سے اعلیٰ کتابیں ہوں گی تو یہی ذخیرۂ علمی دوسروں کے لئے جواب ہوگا۔

ہمیں حاجت نہیں ہے کہ کسی کے ساتھ مناظرے میں پڑیں اور اِس مناظرے میں اپنی عمر کے ایک گرانمائے کو صَرف کریں اور مسلمانوں کی دل آزاری ہو۔ یہ امام نہیں چاہتے اور امام سب کے امام ہیں، سارے مسلمانوں کے امام ہیں اور مسلمانوں میں کتنے لوگ ہیں جو امام کی عزت کرتے ہیں، حرمت کرتے ہیں اور رہنما تسلیم کرتے ہیں اور ایک طرح سے امام بھی مانتے ہیں؟ لہٰذا ہمیں اور کسی سے بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن اِس بات کی سخت ضرورت ہے، اشد ضرورت ہے کہ ہم خود کو علمی طور پر مضبوط کریں، اپنوں کو قرآن سکھائیں، قرآن میں مدد کریں، جماعت کو سمجھائیں اور ہمارے پاس قرآنی علم کا ایک مضبوط ذخیرہ ہو، تو وہ ذخیرہ آج نہیں تو کل لوگوں کے سامنے نمودار ہو جائے گا، لوگ اُس کو دیکھیں گے اور اِس کی وجہ سے امام کی تعریف ہوگی۔ کہا جائے گا انصاف کا ایک زمانہ ضرور آئے گا، ریسرچ کا ایک زمانہ ضرور آئے گا اور دُنیا اُسی سمت کو جارہی ہے اور دُنیا کے اندر جو بڑے بڑے علمی ادارے ہیں وہ صحیح کام کر رہے ہیں اور ریسرچ کے اندر ریسرچ کر رہے ہیں اور نتیجے کے طور پر ایک ایسا وقت آنے کو ہے کہ وہ وقت بڑا اچھا وقت ہوگا، وہ قدردانی کا وقت ہوگا اور وہ علم میں تحقیق کرنے کا وقت ہوگا اور جو آگے بات غلط کہی گئی تھی اُس کی تردید ہوگی۔ اُس وقت اگر آپ کے پاس علم کا کوئی اچھا سا ذخیرہ ہے تو وہ لوگوں کے سامنے آئے گا، لوگ سوچیں گے کہ کیا بات ہے کہ اِن کتابوں میں اور اِس علمی ذخیرے میں ایسی ایسی چیزیں ہیں تو یہ کہاں سے آگئیں؟

آخر سوچتے، سوچتے اِس نتیجے پر ضرور پہنچیں گے کہ اسمٰعیلی مذہب میں جو ہے وہ سچائی ہے، حقانیت ہے، تو میں نے ایک روز آپ کو ایک شاندار حدیث کا خلاصہ بتایا تھا، وہ خلاصہ جو ہے بڑا شاندار ہے۔ اِس لئے آج میں اُس کو دُہراتا ہوں۔ وہ حدیث کا خلاصہ یہ ہے رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے جناب امیر المومنین علی علیہ السّلام کے متعلّق میں ارشاد فرمایا اور خدا سے دُعا کی کہ خداوند! علیؑ جس طرف کو گھومے حق کو، حقیقت کو اُس کی طرف گھما دینا، یہ حدیث ہے ''اَللّٰھُمَّ اَدِرِ الْحَقَّ مَعَہٗ حَیْثُ دَارَ'' اے خدا سچّائی کو علیؑ کی طرف گھما دینا۔ جہاں علیؑ گھومے، جہاں علیؑ جائے حق جو ہے یعنی سچائی جو

ہے، باطل کا جو (opposite) ہے، حق وہ علیؑ کے ساتھ جائے، وہ علیؑ کی ساتھ گھومے۔ دیکھیں! کیا شان ہے امام کی اور اِس دُعا کی کہ دُنیا والے جو ہیں تلاشِ حقیقت کے عنوان سے سرگردان پھرتے ہیں، حقیقت کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں اور یہ ایک بہت مشہور اصطلاح ہے تلاشِ حقیقت، حقیقت کہاں ہے؟ اور لوگ گھومتے ہیں، پھرتے ہیں، سرگردان ہیں، سر پھرے ہوئے ہیں لیکن امامؑ وہ ہے جس کے پیچھے پیچھے حق چلتا ہے، تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ علیؑ نے اپنے وقت میں جو کچھ کہا دوسروں کے مقابلے میں وہ ہی صحیح تھا اور آج علیؑ بحمدللہ کون ہیں؟ زمانے کے امام علیؑ کے نور ہیں، تو امامؑ جو کچھ ارشاد فرمائے گا وہی حق ہے، وہی سچ ہے اور وہی سچائی ہے، تو مجھے شوق تھا یہ جو حدیث ہے اِس کے خلاصے کو آپ کے ذہن میں لاؤں یا آپ کو توجہ دِلاؤں۔ آپ بار بار اِس بات کی طرف توجہ دینا، اِس کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر لینا، یہ بے مثال بات ہے کہ رسولؐ نے یوں دُعا گزاری اور آپ اِس حقیقت کو بھی بخوبی جانتے ہیں کہ رسولؐ وہی دُعا کرتے تھے جو منظورِ خدا ہونے کا امکان تھا یا یوں کہنا چاہئے کہ رسولؐ جو دُعا کرتے تھے جس چیز کے متعلّق وہ چیز پہلے ہی سے مہیّا ہوتی تھی اور یہ دُعا صرف ایک یعنی اعلان کی حیثیت رکھتی تھی، ایک تبلیغ کی حیثیّت رکھتی تھی، تو اِس کے بغیر یعنی کوئی دُعا رسولؐ نہیں کرتے تھے۔

اِس لئے اسماعیلی مذہب کے اندر کتنی حقیقتیں ہیں، کتنی روشن حقیقتیں ہیں اور کیا شان ہے اسمٰعیلی مذہب کی کہ اِس کے اندر جو بھی علم ہے بہت درخشان و تابان ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ مومنین جن کے اندر، جن کے سینے کے اندر ایک جذبہ علم کے لئے، حصولِ علم کے لئے ہے اور علم کے ذخیروں کو بنانے کے لئے جن کو خداوند نے ذوق دیا ہے، شوق دیا ہے وہ بڑے خوش نصیب ہیں اور میں آپ کو یہ بھی بتاؤں، یاد رہے کہ انسان کے اندر جو نیک خواہشات ہوتی ہیں وہ کبھی طاقتور ہوتی ہیں اور کبھی کمزور۔ آپ ہم سے پوچھیں یہ کیوں ایسا ہے کہ خوبیاں ہر وقت خوبیاں ہیں، نیکیاں ہر وقت نیکیاں ہیں لیکن انسان اُن کو ہمیشہ ایک طرح سے کیوں نہیں چاہتا ہے کہ کبھی یعنی پُرزور خواہشات سے چاہتا ہے اور کبھی اُس کی خواہشات میں جو ہے وہ کمزوری آجاتی ہے؟ میں جواباً یوں عرض کروں گا کہ انسان جیسے ہی غفلت میں ڈوب جاتا ہے تو اُس کی نیک تمنائیں جو ہیں وہ کمزور ہو جاتی ہیں اور جب وہ اپنی عبادت و بندگی اور نیکی سے اپنی صلاحیتوں کو اُجاگر کرتا ہے، اچھی صلاحیتوں کو، نیک صلاحیتوں کو تو اُس وقت نیکی کو زیادہ چاہتا ہے اور یوں بھی اِس بات کا بھی تذکرہ کریں کہ انسان کے اندر جو قوتِ ارادی ہے جس کو آپ میں سے جو (psychology) جانتے ہیں، جو انگریزی جانتے ہیں اِس کو آپ حضرات (will power) کہتے ہیں۔ وہ صحیح یعنی کہ (psychology) میں جو اِس (will power) کو جو اہمیت دی گئی ہے وہ بلکل صحیح ہے، تو مذہب میں اور روحانیت میں قوتِ ارادی کی بہت بڑی اہمیت ہے لیکن میں یہ کہوں گا کہ یہ قوتِ ارادی کبھی کمزور ہو جاتی ہے اور کبھی طاقتور ہو جاتی ہے۔ وہی سبب ہے جو میں نے کچھ سیکنڈ پہلے بتایا کہ جب انسان یادِ الٰہی سے غافل ہو جاتا ہے، جب کوئی نافرمانی کرتا ہے تو اِس کی سزا اِس کو یوں ملتی ہے کہ اِس کے اندر جو اعلیٰ صلاحیتیں ہیں جیسے قوتِ

ارادی ہے وہ کمزور ہو جاتی ہے۔ پھر وہ چاہتا ہے کسی نیک کام کو لیکن اُس میں کامیاب نہیں ہوتا ہے، اُس کی صلاحیتیں اِس جرم میں کہ اُس نے خدا کی نافرمانی کی، کمزور ہو جاتی ہیں، تو اِس کے لئے مومن کو چاہئے کہ اپنے اندر دین سے، ایمان سے، علم سے، رُوحانیت سے لگن پیدا کرے اور اگر وہ لگن فی الوقت کمزور ہے تو یہ نہ سمجھے کہ ہمیشہ یوں رہے گا، ایسا نہیں ہے۔ جیسے ہی عبادت میں، نیکی میں، بندگی میں آگے بڑھا جائے گا تو یہ جو چاہت ہے علم کی، دین کی، عبادت کی، رُوحانیت کی یہ ایک زبردست طوفان بن جائے گا اور یہ ہم کو بے چین کرے گا، یہ جذبہ، یہ شوق۔ اِس کے لئے پُر امید ہو کر آپ علم کی طرف توجّہ دیجئے عبادت، بندگی، نیکی، خدمت۔

ہاں! تو خدمت کی اہمیت اپنی جگہ پر صحیح ہے اور خدمت کے بغیر کوئی مومن آگے نہیں بڑھ سکتا ہے بلکہ خدمت بہت ہی اعلیٰ ہے اور خدمت، کون سی خدمت؟ خدمات بہت سی ہیں۔ آپ اُس خدمت کو منتخب کریں جس کی زمانے میں بہت ہی ضرورت ہے، اُس خدمت کو لیں جو ہمہ رس، عالمگیر ہے اور ہر جگہ پہنچنے والی ہے اور مومن کبھی ناکام و نامُراد ہو کر ناسمجھی سے کوئی ایسی خدمت کیلئے کوشش کرتا ہے جس کی ضرورت نہیں ہے یعنی اُس کے کرنے والے بہت بیٹھے ہیں۔ اُس کو سوچنا چاہئے، کسی مارکیٹ میں بہت سے کاروباری بیٹھے ہیں اور ہر طرح کی تجارت چلتی ہے تو ایک دانشمند کاروباری کیا کرتا ہے؟ کیا سوچتا ہے؟ سوچتا ہے کہ مارکیٹ میں کس چیز کی مانگ زیادہ ہے اور کون سی ایسی چیز ہے جس کو سب لوگ چاہتے ہیں اور اگر اُس کے ذہن میں کوئی ایسی تجویز آتی ہے تو اُسی کے مطابق ایک ایسا کاروبار اپنے لئے اختیار کرتا ہے۔ اِسی طرح دین بھی ایک آخرت کی تجارت ہے۔ خداوندِ عالم نے جہاں بہت ساری مثالیں بیان کی ہیں وہاں اُس نے تجارت کی بھی مثال بیان کی ہے۔ آپ دیکھیں قرآن کے اندر بہت سی جگہوں میں تجارت کی مثال ہے، خدا نے کیا زمینداری اور کھیتی باڑی کی مثال بیان نہیں کی؟ خدا نے بہت سی مثالیں قرآن میں بیان کی ہیں، اُن ہی کے سلسلے میں اُس نے تجارت کی مثال بھی دی ہے، تو لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ آخرت کی ایک تجارت ہے۔ اِس تجارت میں یہ سوچنا ہے کہ آپ جن سے جس مال کی تجارت کرنا چاہیں گے کیا اُس کی سب جماعتوں کو، ہر علاقے میں، دُنیا بھر میں ضرورت ہے یا نہیں ہے۔ ہاں! ایسی تجارت علم کی ہے، ایسی خدمت علم کی ہے، کون سا علم؟ علم امامؑ کا جو کامیاب علم ہے اور جو خاص ہے۔ کل ایک عالمِ دین ٹی وی پر کوئی تقریر کر رہے تھے۔ مجھے کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اچھی بات ہے کہ اُس نے یقین کے تین درجوں کا ذکر کیا: علمُ الیقین، عینُ الیقین اور حقُ الیقین لیکن افسوس ہے کہ اُس نے علمُ الیقین کی تعریف یوں کی کہ سنی سنائی بات جو ہے وہ علمُ الیقین ہے لیکن سنی سنائی بات جو ہے وہ روایت والا علم ہو سکتا ہے، کہانی بھی سنی سنائی ہو سکتی ہے، داستان بھی سنی سنائی ہو سکتی ہے اور پھر اُس میں سے یقین کا نام اُس کو کیوں دیا گیا؟ وہ یقین اُس کو کہتے ہیں جو شک کو مارے، شُبے کو دور کرے، اُس کا نام یقین ہے۔ روشنی کس کو کہتے ہیں؟ اُس کو جو تاریکی کو دُور کرے، گرمی کس کو کہتے ہیں؟

اُس کو جو سر دی کو دُور کرے ۔علمُ الیقین سنی سنائی علم، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن یہ میں آپ کو ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں مجھے اُس عالم سے کوئی مخالفت یا دشمنی نہیں ہے، تاکہ آپ امامؑ کے علم کے لئے شکرگزار ہو جائیں ۔ ہمارے یہاں علمُ الیقین کی یہ تعریف ہے کہ وہ علم جو یقین کا درجہ رکھتا ہے وہ شکوک وشبہات کو منطقی طور پر دُور کرتا ہے مگر وہ ہے ظاہری، وہ رُوحانی علم ابھی نہیں ہے۔

رُوحانی علم ہے لیکن آپ کے اعتبار سے وہ ظاہری علم ہے، دیکھیں! لوہار کی مثال آپ نے سنی ہے؟ دیکھا بھی ہوگا لیکن اِس ترقّی کے زمانے میں آپ نے لوہار کو بہت کم دیکھا ہو گا کہ لوہار کیا کرتا ہے؟ لوہے کے ایک ٹکڑے کو بھٹّی میں ڈالتا ہے، اُس کو انگاروں کی طرح سرخ اور لال کرتا ہے۔ وہ ٹکڑا جو لوہا تھا آگ کی شکل اختیار کرتا ہے، اُس کو پگھلاتا ہے اور (hammering) سے اُس کوئی چیز بناتا ہے۔ کلہاڑی بناتا ہے، تیشہ بناتا ہے، چھری بناتا ہے، خنجر بناتا ہے، تلوار بناتا ہے کچھ بھی بناتا ہے۔ اب وہ چیز پانی میں بجھا کے الگ کرتا ہے تو اُس میں جو رنگت تھی وہ تبدیل ہو جاتی ہے، گرمی تھی آہستہ آہستہ وہ زائل ہو جاتی ہے لیکن وہ چیز یا وہ اوزار یا وہ چاقو یا وہ چھری یا وہ خنجر، یقین رکھنا کہ وہ آگ سے گزر کے آپ کو پہنچا ہے، تب ہی تو اِس کو یہ شکل آپ کو ملی ہے۔ اب میں علمُ الیقین کی بات اِس مثال کی مدد سے سمجھاؤں گا، آپ کے پاس جو علمُ الیقین آتا ہے خواہ وہ کسی کتاب سے ہے یا کسی کامل استاد سے ہے وہ عینُ الیقین سے ہو کر آیا ہے، اُسی کی بھٹّی سے ہو کے آیا ہے۔ اِس معنیٰ میں یہ عینُ الیقین ہے لیکن آپ جس سطح سے، جس (level) سے اِس کو پا رہے ہیں اُس (sense) میں یہ عینُ الیقین نہیں ہے کہ آپ اِس کو چھوتے ہیں تو ہاتھ نہیں جلتا ہے کیونکہ اب اِس وقت یہ بھٹّی میں نہیں ہے، بھٹّی سے الگ ہے اِس کو تیار کر کے، بجھا کے ایسا بنایا ہے تاکہ آپ اِس کو اپنی گرفت میں لے سکیں، اگر یہ اصلی حالت میں یہ باتیں ہوتیں تو آپ اِس کو (grasp) نہیں کر سکتے۔

جس طرح ایک شخص جو ہے کسی ایسی کلہاڑی کو استعمال نہیں کر سکتا ہے جو ابھی بھٹّی میں ہے اور لوہار اُس کو پگھلا رہا ہے اور اُس کو بنا رہا ہے یا بنایا ہوا ہے لیکن ابھی بجھا نہیں ہے، بہت گرما گرم ہے اور سخت گرم ہے، تو اُس کو نہ تو کوئی دستہ لگا سکتا ہے، نہ اُس کو استعمال کر سکتا ہے، وہ تو آگ ہے، اِس کو ٹھنڈا ہونے دیجئے۔ یہ جو آپ کو علمُ الیقین کی باتیں آتی ہیں رُوحانیت کی آگ سے ہو کر، اُس کی روشنی سے کوئی شکل اختیار کر کے آپ تک پہنچی ہوئی ہیں، یہ ہمارے نزدیک علمُ الیقین یا کہ یہ عینُ الیقین سے ہو کے آئی ہوئی ہیں لیکن اُس حضرت نے تو بتایا کہ سنی سنائی باتیں جو ہیں علمُ الیقین ہیں۔ جب آپ اپنی آنکھوں سے، اِس ظاہری آنکھ سے اُس کا مشاہدہ کریں گے تو عینُ الیقین ہے۔ وہ شاید یعنی دل کی آنکھ کو باور نہیں کرتا ہے تو اِس واسطے عینُ الیقین ایسے کہا جس طرح کہ وہ اپنی آنکھ سے اِن باتوں کو دیکھتا ہے، تو بہر حال یہ ایک مثال تھی تاکہ آپ اِس علمُ الیقین کو جو اسمٰعیلی مذہب میں موجود ہے، ہر وقت موجود ہے، جس سے تمام شکوک وشبہات کا ازالہ

ہو جاتا ہے، تو اِن کو اچھی طرح سے قدر دانی کے ساتھ لینا اور آج کی باتیں یہیں پر ختم کریں گے۔ بہت ہی مہربانی کہ آپ اِس قدر تعداد میں یہاں جمع ہوئے ہیں اور پُرتکلّف ہو کر آپ نے توجّہ دی، اِن باتوں کو اچھی طرح سے سُنا اور اپنے دل و دماغ میں اِن کو جگہ دی اس کے لئے ہم آپ کے بہت بہت ممنون ہیں، شکرگزار ہیں۔ مولائے زمین و زمان آپ کو دونوں جہان کی کامیابی اور سلامتی عطا فرمائے۔ آمین، یاربّ العالمین! مہربانی، شکریہ۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپ: عطاءاللہ ہونزائی نظرِ ثانی: اکبر علی پُروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق س) کا پُرحکمت بیان

عنوان: گنجِ مخفی = امامِ زمان

کیسٹ نمبر: ۶۰ تاریخ: ۳۱/ دسمبر/ ۱۹۸۱، کراچی

Click here for Audio

دُنیا میں اِس کی آپ کو بہت سی مثالیں ملیں گی کہ بہت سے لوگ علم تک رسا ہو جاتے ہیں، پھر یکا یک کسی ناشکری کی وجہ سے علم کی روشنی اُن سے واپس ہو جاتی ہے، چھن جاتی ہے اور وہ اُس دولت سے محروم ہو جاتے ہیں، تو آج امام جو علم کا سرچشمہ ہیں، امامؑ کی پاک شخصیّت سے جو لوگ عداوت کرتے ہیں یا جس طرح مخالفت رکھتے ہیں اُس کی وجہ سے اُن کو دیا ہوا علم بھی واپس ہو جاتا ہے۔ خداوندِ عالم نے قرآنِ مقدّس کی کئی آیات میں اِس کا اشارہ فرمایا ہے اور ایک مقام پر علم کی تشبیہہ پانی سے دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ: اگر پانی کو زمین سے اُٹھا لیا جائے تو تم اِس میں کیا کر سکو گے؟ (۳۰:۶۷) پانی اگر خشک ہو جائے تو یا اگر زمین کی گہرائی میں چلا جائے تو تم اِس میں کیا کر سکتے ہو؟ یہ اشارہ ہے علم کی طرف اور لوگوں سے علم کے اُٹھائے جانے کے بارے میں۔ روایت میں ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا جس میں کہ قرآن زمین سے اُٹھایا جائے گا۔ اگر اِس پیش گوئی کو عام سطح سے، بغیر حکمت کے اور بغیر تاویل کے لی جائے تو اُس کے مطابق لوگ کچھ اِس طرح سے سوچنے لگیں گے کہ اِس کے لئے ایک خاص وقت آنے کو ہے اور اب ایسا نہیں ہوا ہے اور جب وہ وقت آئے گا تو اُس وقت اور اُس دَور میں جو آسمانی کتاب ہے، جو قرآن ہے تو مصحف کے طور پر یعنی ظاہری جو کتاب ہے اِسی کو اُٹھایا جائے گا، وہ لوگ اِس طرح سے سوچتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت کچھ اور ہے اور وہ یوں ہے کہ اب اِس وقت بھی خداوند عالم نے بحیثیتِ مجموعی (on the whole) قرآن دُنیا سے اُٹھالیا، اِن معنوں میں اُٹھالیا ہے کہ قرآن کا جو علم ہے کہ قرآن میں جو زمانے کے لئے ہدایت ہے اُس سے لوگ استفادہ نہیں کر پا رہے ہیں، اِس لئے کہ جو صاحبِ حکمت ہے، جو صاحبِ تاویل ہے اور جو قرآن کی روشنی ہے اُس کی طرف لوگ پُشت کئے ہوئے ہیں۔ لہٰذا خدا نے بہت سے لوگوں کے پیشِ نظر قرآن کو اُٹھالیا ہے۔

اِس مقام پر تھوڑی سی اور تشریح کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ قرآن کے اندر کئی ایک پیش گوئیاں ہیں، اُن کے وقوع میں آنے کا تعلّق بحیثیتِ مجموعی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ پیش گوئی دُنیا کے ہر ہر فرد پر واقع ہو، بہت سی باتیں ایسی

ہیں جن کا تعلّق بحیثیت مجموعی ہے یعنی کہنے کا مقصد یوں ہے کہ دُنیا کے اندر جہاں بہت سے لوگ قرآن سے غافل ہیں اور تھوڑے سے لوگ ہیں جو مٹھی بھر ہیں تو اُن کی اِس میں بات نہیں ہے لیکن اکثریت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو آج قرآن کی حکمتوں سے، اُس کی ہدایتوں سے بہت سے لوگ محروم ہیں۔ یہ محرومی کچھ خدا کی طرف سے نہیں ہے، کچھ اِن کی قسمت اور تقدیر نہیں ہے، یہ محض اِس لئے ہے کہ اِن لوگوں نے آہستہ آہستہ خود کو محروم کر دیا ہے یعنی قرآن کی ہدایت ملنے کی جو بنیادی شرط تھی اِس سے یہ قاصر رہے، امامؑ کے مقدّس دامن کو ہاتھ سے جانے دیا، لہٰذا بہت سے لوگ دُنیا کے اندر محرومی کا شکار ہو گئے، اِس معنی میں خدا نے قرآن کو اُٹھایا۔ ایک حقیقی مومن اِس طرح سے نہیں سوچتا ہے کہ یہ جو ظاہری قرآن ہے تمام اوراق کے ساتھ اور مادّی طور پر اور اِس کی جو ساخت اور اُس کی جو مادّی شکل ہے اُس کے ساتھ خدا اُٹھائے گا، تو خدا کی ساری پیش گوئیاں جو آنے والے دَور سے متعلّق ہیں حکمت کی زبان میں ہیں اور جو لوگ حکمت کی زبان کو سمجھتے ہیں، جانتے ہیں وہ اِس کے مطلب کو، اِس کے معنیٰ کو سمجھ سکتے ہیں، تو عزیزانِ من! ابھی ہم نے ایک چیز کے لئے سوچا تھا۔ اتنی سی بات کے بعد ہم اُس کی طرف جاتے ہیں، ہم کوشش کرتے ہیں کہ اپنی خودی میں ہم میں سے ہر ایک ڈُوب جائے۔ خودی کے دریا میں ڈُوبے، انا کے سمندر میں ڈُوبے، خیالوں میں ڈُوبے، عبادت میں ڈوبے، تصورات میں ڈُوبے، عاجزی میں ڈوبے اور اپنے آنسوؤں کے سمندر میں ڈُوب جائے۔

۔۔۔۔کے منتظر ہیں، آپ کی دُعاؤں کے ثمرات پا رہے ہیں، مجھے کہنے دیجئے یہ بات سچ ہے کہ میں ایک طریقے سے آپ کے دلوں سے نورِ ایمان کی قوت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ شہد کی مکھی کس طرح شہد بناتی ہے؟ وہ پھلوں سے اور پھولوں سے رَس کو جمع کرتی ہے۔ آپ امامؑ کے باغ کے پھل ہیں اور پھول ہیں، آپ کو باور ہے؟ کیا اِس مقام پر بھی خوشامدی سے کام لینا ممکن ہے یا یہ ایک حقیقت ہے؟ کیا یہ بات تعریفِ بے جا ہو سکتی ہے؟ ایسا نہیں، ایسا نہیں۔ آپ بیشک امامؑ کے باغ کے پھول ہیں اور پھل ہیں، آپ میں جو امامؑ کی محبّت ہے میں اُس کو سامنے رکھتا ہوں۔ آپ میں جو سچّائی ہے، جو دینداری ہے، جو خلوص ہے میں اُس کو لیتا ہوں، اُسی کی بات کرتا ہوں۔ نہ معلوم آپ کس پہلو کی طرف نظر کرتے ہیں، اپنی شخصیت کو دیکھتے ہیں یا کیا لیکن میں ایمان کو دیکھتا ہوں، آپ میں جو ایمان ہے، جو امامؑ کی محبّت ہے، جو سچّائی ہے، جو دینداری ہے، جو اِس مقدّس دین سے آپ کی وابستگی ہے اُسی کو سامنے رکھتے ہوئے میں یہ بات کرتا ہوں اور میری بات صحیح ہے، تو کہنے دیجئے کہ آپ امامؑ کے مقدّس باغ کے پھول ہیں اور پھل ہیں تو کسی شہد کی مکھی کو پھولوں سے رَس جمع کرنا ہے، پھلوں سے رَس جمع کرنا ہے تاکہ اُس سے ایک شہد بنایا جائے، یہ بات ہے۔ اِس لئے میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ رُجوع کریں امامؑ سے۔ میرے نزدیک یہ طریقہ کامیاب ہے، آج نہ معلوم کتنا کام اِس سے لیتے ہیں، زیادہ یا کم، تو یہ بات الگ ہے لیکن یہ اُصول، یہ طریقۂ کار اور یہ وحدت صحیح ہے اور اگر بولنے والا یوں عاجزی اختیار نہ کرے تو پھر کس

طرح (unity) ہوسکتی ہے؟ اور یہ رُوحانیت کا اُصول نہیں ہے کہ جو بولنے والا ہے وہ خود اپنی انا کو دکھائے اور فنا سے فیض نہ لے، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

سب سے بڑی حکمت فنا میں ہے اور فنا کے کئی طریقے ہیں اور کامیاب طریقہ اِس میں عاجزی ہے، انکساری ہے اور مومنین کی تعریف ہے، امامؑ کے بچّوں کی تعریف ہے اور امامؑ کے بچے ہم اور آپ، امامؑ کے مقدّس گھر کے افراد کو نورانی فیملی مانتے ہیں، یہ بات بہت صحیح ہے لیکن اِس کے باوجود یہ تو مثال کی بات ہے یعنی اِس معنیٰ میں مثال کہ وہ سب جماعتوں کے لئے ایک نمونہ ہیں اور نمونہ بجائے خود صحیح ہے، حقیقت ہے لیکن نورانی فیملی کا دائرہ اور بھی وسیع تر ہوتا ہے، یہ کہ امامؑ کے جتنے سچّے رُوحانی فرزند ہیں وہ بھی نورانی فیملی ہیں۔ بظاہر کہنے کو نہیں ہے یہ بات اور شاید لوگ نہیں سمجھیں لیکن جو اہلِ حقیقت ہیں، جو اہلِ ایمان ہیں، جن کو رُوحانی علم سے ایک حصّہ ملا ہے وہ اِس بات کو یقیناً قبول کریں گے کہ امام جن مومنین سے فرماتا ہے کہ تم میرے بہت ہی عزیز رُوحانی فرزند ہو، تو پھر کیا فرق رہتا ہے؟ رُوحانی فرزند اور نورانی فرزند، لفظ میں فرق ضرور ہے کہ ایک کی نسبت نور سے ہے اور دوسرے کی نسبت رُوح سے ہے لیکن میں سوال کرتا ہوں کہ جب امام فرماتا ہے ''روحانی فرزند، میرے روحانی فرزند'' تو اِس میں امام کی کون سی رُوح کی نسبت ہے؟ وہی رُوح نا جو امام میں ہے؟ کیا وہ رُوح نور نہیں ہے؟ امام کی رُوح اور امام کا نور اِس میں کیا فرق ہے؟ کیا آپ اِس میں کچھ فرق پاتے ہیں؟ کچھ فرق آپ کو نظر آتا ہے یا ایک ہی بات ہے؟ الفاظ گو کہ الگ الگ ہیں لیکن حقیقت میں ایک ہی چیز ہے، امام کی رُوح، امام کا نور۔ امام کے نورانی بچّے، امام کے رُوحانی بچّے، اگر آپ تمیز کے لئے، عادت کے طور پر، عاجزی کے لئے اِن دونوں لفظوں کو الگ الگ رکھتے ہیں تو یہ تو مصلحت کی بات ہوگئی اور حقیقت نہیں ہوئی، حقیقت یہ ہے کہ جو امام کے رُوحانی فرزند ہیں اور صحیح معنوں میں اُس کی رُوح سے ہیں، اُس کی مقدّس رُوح کی کرنوں کی حیثیّت سے، وہی افراد امام کے رُوحانی رنورانی فرزند بھی ہیں، تو پھر بات وہاں سے آگے بڑھی تھی کہ جو امام کے نورانی فرزند ہیں یعنی رُوحانی فرزند ہیں تو کیا ہم اُن کی قوتوں سے فائدہ نہ اُٹھائیں؟ اُن کو توجّہ نہ دِلائیں؟ کیا اُن کو اُن کی رُوح کی صلاحیت سے آگاہ نہ کریں؟ کیا ہمیشہ ہم اپنی خودی کی بات کرتے چلے جائیں؟ یہ بات کبھی نہیں ہوسکتی ہے۔ اِس میں ایک مومن کو کیسے مزہ آوے؟ مزہ اِس میں ہے، خوشی اِس میں ہے، لذّت اِس میں ہے کہ اپنی انا کو بار بار مٹائیں، خودی کو فنا کریں اور جو مونو ریالزم ہے، جو یک حقیقت ہے اور جس تصوّر میں مومنین کی سب رُوحوں کا ایک ہوجانا ہے تو اُسی کو مانیں تو تب مزہ ہے، تب خوشی ہے۔

عزیزانِ من! یہ موضوع جو میں نے کہا، مونو ریالزم بہت بڑا موضوع ہے اور یہ تصوّر سب سے اُونچا تصوّر رہے۔ خدا کو تو بہت سے لوگ مانتے ہیں کسی بھی نظریے سے اور بعض لوگ خداؤں کو مانتے ہیں اور خدا کی بات سب کرتے ہیں، کسی بھی نظریے سے، کسی بھی تصوّر سے لیکن خدا کی حقیقت کا جاننا بہت اُونچی بات ہے۔ خدا کو ایک سمجھنا زبان کی نوک سے، یہ بھی

آسان ہے لیکن خدا کس حقیقت میں ایک ہے اور کس طرح ایک ہے؟ آیا ہم خدا کی یگانگت کو، خدا کی وحدانیت کو، اُس کی (unity) کو کچھ سمجھ سکتے ہیں؟ تو اِسی کے لئے ہم کو مونو ریا لزم کا (concept) دیا گیا ہے اور یہ (concept) جو ہے ایک چھپا ہوا خزانہ ہے جس کے متعلق حدیثِ قدسی میں ارشاد ہے یعنی خدا نے جس طرح فرمایا کہ: ''[کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیّاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ] وہ ایک چھپا ہوا خزانہ تھا اور اُس نے چاہا کہ اُس کی شناخت ہو اور اِس شناخت کے لئے اُس نے لوگوں کو پیدا کیا''۔ لیکن پیدا کرنے کے مرحلے میں خدا کا جو مقصد تھا شناخت کا وہ پورا نہیں ہوسکتا، جب تک خدا کی شناخت نہ ہو اور خدا نے جو چاہا تھا یا خدا کے سامنے جو مقصد تھا اُس کو تو پورا ہونا ہے۔ یہ دو طرح سے پورا ہوسکتا ہے یعنی خدا نے جس طرح اپنی شناخت کے پیشِ نظر لوگوں کو پیدا کیا تھا وہ مقصد دو طرح سے پورا ہو جائے گا یا یہ کہ ایک زمانے میں، ایک دَور میں، ایک وقت میں سب لوگ خدا کو پہچان جائیں گے یا یہ ہے کہ کچھ لوگ خدا کو پہچانیں گے اور کچھ لوگ نہیں پہچانیں گے اور جو لوگ خدا کو پہچانیں گے تو یہ ایک نمائندگی کی صورت ہوگی یعنی جو لوگ خدا کو نہیں پہچان سکتے ہیں اُن کی طرف سے بھی اور اپنی طرف سے بھی یہ لوگ خدا کو پہچانیں گے جو پہچاننے والے ہیں، تو خدا کا مقصد پورا ہو جائے گا اور پھر خدا کو یہ لوگ پائیں گے ایک چھپے ہوئے خزانے کی حیثیت سے۔ کون لوگ پائیں گے؟ جنہوں نے خدا کو پہچانا۔

میں نے اِس کی تشریح کی تھی کہ خدا کے چھپے ہوئے خزانہ ہونے کے کیا معنی ہیں اور اُس کی کیا تشریح ہے۔ اب کچھ نئے دوست یہاں بیٹھے ہیں، اِس لئے میں اِس کی ایک بار پھر تشریح کرنا چاہتا ہوں۔ خدا کے مختلف نام ہیں، خدا کے سو نام ہیں، خدا کے ایک ہزار ایک نام ہیں، خدا کے نام اِس سے بھی زیادہ ہیں، ہر نام میں خدا کی ایک الگ شان بتائی گئی ہے، ایک الگ صفت بیان کی گئی ہے۔ اِسی طرح خدا کے جلال والے نام بھی ہیں، جمال والے نام بھی ہیں، شفقت و مہربانی والے نام بھی ہیں اور قہر و غضب والے نام بھی ہیں، عدل والے نام بھی ہیں، جُود و کرم والے نام بھی ہیں اور خدا مالک بھی ہے، آقا بھی ہے، بادشاہ بھی ہے، خالق بھی ہے، رازق بھی ہے، پروردگار بھی ہے، بہت سے نام ہیں اور دوست بھی ہے۔ آپ کسی نام کو زیادہ چاہیں گے؟ اور زیادہ چاہنے کا سوال اِس لئے کہ ظاہر بات ہے کہ خدا جہاں قہار ہے، جبّار ہے، زبردست ہے اُس سے آپ کو ڈر لگے گا اور ہر ایک کو ڈر لگے گا لیکن آپ اُس نام میں خدا کا جلوہ چاہیں گے، خدا کا دیدار چاہیں گے، خدا کی ملاقات چاہیں گے جو دوستی سے متعلّق ہے، ہے نا؟ صحیح! لیکن ایک اور نام میں آپ کو بتاؤں۔ خدا کے نام حدیثوں میں بھی ہیں، سب آسمانی کتابوں میں ہیں، قرآن میں بھی ہیں، اِس کے علاوہ بھی ہیں، فرشتوں میں بھی ہیں، خدا کے بہت سے نام مخفی بھی ہیں۔ مخفی نہ ہوتے تو اسمِ اعظم کا سوال پیدا نہ ہوتا۔ چنانچہ ایک نام ہے ''چھپا ہوا خزانہ''، خزانہ آپ کو کیا کہے گا؟ بادشاہ آپ سے کچھ سوال بھی کرے گا، آپ سے باز پُرس بھی ہوگی بادشاہ کے حضور میں اور آپ سے حساب کتاب بھی لیا جائے گا، بادشاہ کے حضور میں، لیکن جہاں خدا نے خود کو چھپا ہوا خزانہ قرار دیا اور اُس کے حصول کی شرط معرفت بتائی گئی جو

حدیثِ قدسی سے ظاہر ہے تو پھر جو لوگ خدا کو پہچان جائیں گے وہ لوگ خدا کو ایک چھپے ہوئے خزانے کی حیثیّت سے پائیں گے۔ ابھی اِس کے link کو ملانا ہے، کس طرح؟ کیسے؟ یہ جو مونوریالزم کا تصوّر دیا گیا ہے مومنین کو امام نے اور مونوریالزم یہ ہے کہ اُس کے تحت یہ ماننا پڑتا ہے کہ ہماری رُوح کے دو سرے ہیں۔ ایک سرا ایسا ہے کہ کبھی نور کے سر چشمے سے الگ نہیں ہوا، ایک سرا ایسا ہے کہ وہ دُنیا میں آیا ہوا ہے اور جس پر ہماری زندگی کا قیام ہے اور رُوح کا وہ سرا ہماری شخصیّت کو چھو رہا ہے۔ اِس چھونے سے ایک شعور ہم کو ملا ہے، ایک بیداری، ایک زندگی اور دل و دماغ جس طرح سے بھی آپ نام لیں، لیکن چونکہ رُوح کے دو سرے ہیں اور یہ سرا جو اِس دُنیا میں اور ہماری شخصیّت کے اندر کام کر رہا ہے یہ اُس سرے سے بہت دُور ہے لیکن اِس کی مسافت کو ہم عبادت و معرفت سے کم کر سکتے ہیں۔ اِس سرے کو اُس سرے کے بہت ہی قریب لے جاسکتے ہیں۔

منصورِ حلاج نے اپنی رُوح کے اِس سرے کو بلند کیا اِس قدر بلند و بالا کیا کہ اُس کو یقین آیا کہ وہ اپنی رُوح کے اُس سرے سے کبھی خدا سے الگ نہیں ہوا، اِس معنیٰ میں اُس نے ''انا الحق'' کہا۔ اسمٰعیلی مذہب میں رُوحانی ترقی کا تصوّر دیا گیا ہے، رُوحانی بلندی کا تصوّر دیا گیا ہے، آج ہمارا فرض ہے کہ اپنے امامِ عالی مقامؑ نے اِس رُوحانی ترقّی کے سلسلے میں جس قدر بھی مقدّس فرامین فرمائے ہیں اُن سب کو سامنے رکھ کے اُن کا مطالعہ کرنا چاہیئے، اُن کی روشنی لینی چاہیئے، اُن کے جوہر کو سمجھنا چاہیئے، تو جو خدا کو پہچان جاتے ہیں تو اُن پر ایک راز کا انکشاف ہو جاتا ہے، ایک بھید اُن پر کھل جاتا ہے، کیا بھید ہے وہ؟ وہ یہی کہ اُن کو یقین آتا ہے کہ بیشک وہ رُوح کے اُس سرے میں نور کے اُس سورج کے ساتھ مل کر ہیں اور اصل سے واصل ہیں۔ آج ہم اِس دُنیا کے اندر اپنے مذہب کے بزرگوں کے وسیلے سے یہ دُعا لینا چاہتے ہیں یا جب کوئی مومن گزر جاتا ہے تو اُس کے حق میں دُعا مانگی جاتی ہے کہ ''اُس کی رُوح اصل میں واصل ہو''۔ یہ دُعا بہت عالیشان ہے اور اِس میں ایک اُونچی حقیقت کا ذکر ہے، تاہم ذرا گہرائی میں جا کے سوچیں تو ہماری رُوح کا وہ سرا بہت پہلے ہی سے اور ہمیشہ سے اصل سے واصل ہے اور اِس دُعا کا تعلّق زیادہ سے زیادہ ہماری اِس انا سے ہے، رُوح کے اِس سرے سے ہے کہ رُوح کے اِس سرے کو آزادی ملے اور یہ فنا ہو جائے۔ عجیب معاملہ ہے کہ ہمیں چل کر اُس بلندی تک جانا نہیں ہے بلکہ جیسے ہی ہم اپنی اِس خودی کو مٹائیں گے، رُوح کے اِس سرے کو فنا کریں گے عبادت کے وسیلے سے، علم کی روشنی میں تو اُسی وقت ہم یکا یک اپنے آپ کو رُوح کے اُس سرے پر پائیں گے۔ جس طرح ایک شخص عالمِ خواب میں جاتا ہے، نیند کی دُنیا میں چلا جاتا ہے تو پھر وہاں سے کس طرح لوٹ کے آتا ہے؟ چل کے نہیں آتا ہے بلکہ (link) کو توڑنا ہوتا ہے۔ (link) جب ٹوٹ جائے تو وہ یکا یک خود کو عالمِ بیداری میں پاتا ہے۔ عالمِ بیداری سے عالمِ خواب میں چل کر نہیں جاتا ہے، عالمِ خواب سے عالمِ بیداری میں چل کے نہیں لوٹتا۔ عالمِ خواب میں اِس طرح جایا جاتا ہے کہ شعور کا (link) جو ہے

عالمِ بیداری سے ٹوٹ جاتا ہے تو یہ (link) کو، ربط کو اِنسلاک [یعنی وابستگی] کو توڑ نا ہی عالمِ خواب میں جانا ہے اور جیسے عالمِ خواب سے واپس آتا ہے تو کس طرح آتا ہے؟ تو عالمِ خواب سے شعور کا جو سلسلہ ہے، جو شعور کا ربط ہے وہ ٹوٹ جاتا ہے، تو عالمِ خواب سے کوئی چیز عالمِ بیداری میں نہیں آتی ہے اور اگر کوئی چیز آتی ہے تو وہ شعور ہے، ایک یاد داشت ہے اور مشاہدات کی سرگزشت ہے۔ وہ چیز ایک لطیف علم کی صورت میں عالمِ خواب سے عالمِ بیداری میں آسکتی ہے اور کوئی مادّی چیز عالمِ خواب سے عالمِ بیداری میں نہیں آتی ہے۔ اِس طرح جب ہم عالمِ بالا میں جائیں گے تو اُس میں صرف یہ ہوگا کہ ہماری یہ انا یا کہ یہ شعور اِس مادّی دُنیا سے منقطع ہو جائے گا، دُنیا کے ساتھ جو ہمارا ربط تھا وہ ٹوٹ جائے گا اور ہمارے جو (senses) ہیں، جو حواس ہیں وہ کام نہیں کریں گے۔ بس اِسی کے ساتھ ہم یکا یک اپنے آپ کو عالمِ آخرت میں پائیں گے جس طرح کہ آپ کے سامنے ایک (mirror) ہے، ایک آئینہ ہے، دن کے وقت اُس میں سورج کا عکس نظر آتا ہے تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آسمان سے سورج اُتر آیا اور اُس نے اپنے لئے اِس شیشے کے اندر جگہ لی، یہ بات نہیں ہے، یہ ایک (link) ہے، ایک عکس ہے۔ اب آپ چاہتے ہیں کہ شیشے کے اندر جو سورج ہے اُس کو آسمان پر بھیجیں تو آپ اِس کو حقیقتاً نہیں بھیج سکتے، صرف یہ کر سکتے ہیں کہ اِس عکس کا جو سلسلہ ہے اُس کو توڑیں، اُس کو (discontinue) کریں۔ اُس کے لئے آئینے کو ہٹائیں اور اُس کی پشت کو سورج کی طرف کریں تو اِسی کے ساتھ جو عکس تھا وہ غائب ہو جائے گا اور اگر آپ اِس کو سمجھتے ہیں کہ یہ آسمان پر گیا اور سورج سے مل گیا اور اصل سے واصل ہو گیا تو ٹھیک ہے، آپ کسی کو سمجھانے کے لئے اُس کے ذہن کے پیشِ نظر اُس کی سمجھ کے مطابق کچھ اِس طرح تشریح کرتے ہیں تو عیب نہیں ہے لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔ کچھ ایسی چیزیں بھی بیان کی جاتی ہیں کہ وہ حقیقت نہیں ہے، اور (secondary) چیزیں ہیں لیکن جہاں دوسرے الفاظ نہیں ملتے ہیں اور سمجھنے والے اِس کے بغیر نہیں سمجھ سکتے ہیں تو اِس میں جائز ہے کہ ایک تشبیہہ، ایک مثال دی جائے اور ایک چیز کو دوسری چیز میں عبارت کریں یعنی معنیٰ کو (transfer) کریں تو عیب نہیں ہے۔ اِس لئے آپ اگر کہیں کہ سورج کے اندر جو عکس تھا تو وہ آسمان پر چلا گیا اور آسمان میں جا ملا تو یہ بات تشریح کے لئے ہے مگر حقیقت کے لئے نہیں ہے، سمجھانے کے لئے ہے کیونکہ سمجھانا جو ہوتا ہے وہ کسی سیڑھی کے زینوں کی طرح ہے۔

ایک مثال آپ دیتے ہیں جو بہت آسان ہے، اُس کے بعد جب سننے والوں کو علم ملتا ہے تو اِس سے بہتر مثال دیتے ہیں، اِس کے بعد تیسری مثال پیش کرتے ہیں، اِس کے بعد چوتھی مثال پیش کرتے ہیں تو یہ جائز ہے، درست ہے اور میں نے ایک اور مثال پیش کی تھی، مجھے یاد پڑتا ہے۔ بعد میں ذکر کروں گا تو آپ کے ذہن میں دوبارہ آجائے گی، یہ کہ ایک آدمی کی آپ سَو تصویریں لیتے ہیں، تصویریں لیتے ہیں کیمرے سے یا فلم لیتے ہیں۔ میں سوال کرتا ہوں کہ کیا اُس آدمی کی شکل سے، صورت سے، شباہت سے، چہرے سے، شخصیّت سے کوئی چیز مادّی طور پر اِس تصویر میں آتی ہے یا یہ ایک

عکس ہے؟ ایک شبیہہ ہے؟ ایک تشبیہہ ہے؟ ایک مثال ہے؟ آپ باور کریں گے کہ انسان ماڈی طور پر نہیں گھٹتا ہے، یہ ایک سایہ تھا، یہ ایک عکس تھا، اِس عکس کے لینے سے، اِس تصویر کے یا فلم کے لینے سے آدمی سے کوئی چیز الگ ہو کر یہاں نہیں آتی ہے۔ اب اِسی سلسلے میں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ کسی آدمی کی تصویر کو واپس اُس آدمی میں چسپاں کیا جائے اور اُس کی شکل وصورت میں اِس کو چپکا دیا جائے؟ ضرورت بھی کیا ہے اور اِس میں اضافہ بھی کیا ہوگا؟ یہ بات ناممکن ہے۔ آپ باور کرتے ہیں کہ تصویر کو یا فلم کو واپس آدمی میں چسپاں نہیں کیا جاسکتا ہے، چپکا یا نہیں جاسکتا ہے، تو بات سمجھ میں آگئی کہ جو چیز وہاں سے کٹ کر نہیں آئی تھی تو واپس بھی نہیں جاسکتی ہے۔ اِس سے مکمّل طور سے بات سمجھ میں آگئی کہ تصویر جب لی گئی تھی تو کوئی ماڈی چیز وہاں سے اُڑ کر یا کہ الگ ہو کر یہاں نہیں آئی تھی۔ تب ہی تو یہ چیز وہاں نہیں جاسکتی اور اُس میں کوئی چیز کم نہیں ملے گی، بالکل یہی حال ہے کہ ہم دُنیا میں جو اصل مقام سے آئے ہیں ایک تصویر کی طرح آئے ہیں پر دُنیا کی تصویر اور اِس تصویر میں فرق یہ ہے کہ یہ زندہ تصویر ہے، شعور کے ساتھ ہے اور اِس میں ایک انا ہے، ایک رُوح ہے اور کیونکہ تصویروں میں تو بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایک تو ہوتا ہے خاکہ یا (cartoon) ایک ہوتی ہے اچھی تصویر، ایک اُس سے بڑھ کر فلم ہوتی ہے جو ٹی وی وغیرہ پر آپ دیکھتے ہیں، تو اِن تصویروں سے بڑھ کر یعنی یہ تصویر ہے جو ہم اپنی اصل رُوح کی تصویر ہے۔ یہ چونکہ خدا کی بنائی ہوئی چیز ہے لہٰذا اِن سائنسی اور دُنیاوی چیزوں سے یہ بڑھ کر ہے۔ ہے تو تصویر ہی، جو ہماری اصل رُوح ہے اُس کی تصویر تو اِس مقام پر مجھے ایک اچھا سا شعر یاد آیا جو ایک عالی قدر پیر نے فرمایا ہے اور وہ عالی قدر شعر یہ ہے:

زنورِ او تو ہستی ہمچو پرتو حجاب از پیش بردار و تو او شو

تو اُس کے نور سے ایک عکس ہے، ایک تصویر ہے تو درمیان میں جو دُوئی کا جو پردہ ہے اُس کو ہٹا اور اُس کے ساتھ مل جا، اور ملنے کی بات ابھی ابھی ہوئی تھی کہ یہ ملنا ایسا نہیں ہے کہ ہم اِس رُوح کو واپس خدا سے چسپاں کریں بالکل ناممکن ہے۔ ابھی وہی بات ہوئی نا ہم کو بچّوں کی طرح سمجھایا گیا، ہم حقیقت میں اور جو اعلیٰ تعلیم ہے اُس کے سامنے بچّے ہیں۔ اِس لئے ہم کو امامؑ نے، پیر نے ہم کو سمجھایا کہ رُوح واپس جاتی ہے، ٹھیک ہے، یہ ہماری ناسمجھی کی وجہ سے ہے کیونکہ آج اِس محفل میں اور اِس مرحلے میں جو ہم بات کررہے ہیں یہ تو اب کی بات ہے کہ ہم اِس قابل ہوئے اور اِس پہ غور کر سکتے ہیں اور وہ تعلیم جو ہم کو دی گئی وہ مجموعی تعلیم ہے، اُس میں ہمارے ساتھ ہم خود بھی بچّوں کی طرح تھے اور بہت سے لوگ۔ لہٰذا اور پھر کیا کہنا چاہئے؟ بس اِسی طرح ہی سمجھایا جاتا ہے۔ آپ قرآن میں جائیں گے تو قرآن کی تعلیمات کو تدریجی حالت میں پائیں گے یعنی اُس کے اندر زینہ بزینہ تعلیم آگے بڑھتی ہے اور درجات ہیں، لہٰذا یعنی رُوح کے متعلّق جو فرمایا گیا کہ ہماری رُوح جو ہے وہ خدا میں جاتی ہے، یہ رُوح نہیں جاتی ہے، ہماری رُوح پہلے سے وہاں موجود ہے، علم جاتا

ہے۔کیا آپ کو یاد نہیں پڑتا ہے کہ حضرت مولانا امام سلطان شاہ صلوات اللہ علیہ نے اپنے فرامینِ اقدس میں سے ایک فرمان میں ارشاد فرمایا کہ: ''وہ جگہ بہت ہی اُونچی ہے، وہاں تک کوئی چیز نہیں جا سکتی ہے، صرف خیال ہی جا سکتا ہے''[حوالہ]۔ یہاں خیال سے علم مُراد ہے، یہاں خیال سے شعور مُراد ہے، شعور جائے گا۔ ابھی ابھی میں نے عالمِ خواب کی مثال دی تھی نا، عالمِ خواب میں کیا کیا چیزیں آپ نہیں دیکھتے ہیں؟ بہت ساری چیزیں دیکھتے ہیں۔ بہت ساری چیزیں آپ دیکھتے ہیں، اُن میں سے ایک چیز بھی آپ اپنے ساتھ اِس عالمِ بیداری میں نہیں لا سکتے ہیں، صرف شعور لا سکتے ہیں۔ شعور یعنی علم اور کوئی چیز، مادّی طور پر کوئی چیز نہیں لا سکتے ہیں۔ لہٰذا علم جائے گا، خیال جائے گا اور مادّی طور پر کوئی چیز نہیں جائے گی۔ آپ چاہیں تو ایک ایسی عالیشان آیت قرآن کھول کے آپ کو بتائیں گے، اُس کے اندر بالکل یہی حقیقت ہے کہ خداوندِ عالم فرماتا ہے کہ: ''تم ہمارے پاس بالکل اکیلے ہو کر آگئے اور جو چیزیں ہم نے تم کو دی تھیں اُن تمام چیزوں کو تم نے ایک ایک کر کے اپنی پشت کے پیچھے چھوڑا اور جس طرح ہم نے پہلے تم کو پیدا کیا تھا تم اِس طرح میرے پاس آگئے (۶:۹۴)۔ یعنی اِس سے خدا کی مراد ایک ایسی مجرّد اور خالص حقیقت ہے کہ وہ مادّی شکل میں نہیں ہے اور وہ بے مثال چیز ہے اور یہ کہ اِس میں، اِس عالمِ سفلی سے اور رُوح کے اِس سرے سے، اِس مقام سے ہمارا ایک شعور، ایک علم، ایک معرفت بلند ہو جائے گی اور اُس چھپے ہوئے خزانے کے پاس، اُس تک معرفت جائے گی۔

اب میں یہ کہہ رہا تھا کہ خداوندِ عالم کے بہت سے نام ہیں۔ اُن ناموں میں سب سے پیارا اور سب سے اعلیٰ، اور اعلیٰ اِس (sense) میں کہ اعلیٰ سب ہیں، خدا کا جو نام ہے قہر و غصہ والا نام وہ بھی اعلیٰ ہے لیکن بندے کو اُس سے ڈر لگتا ہے۔ بندے کو خدا کا ایک ایسا نام چاہئے جس میں زیادہ سے زیادہ شفقت و مہربانی ہو تو ایسا شفقت و مہربانی والا نام جو ہے وہ چھپا ہوا خزانہ ہے۔ خزانہ حقیقتوں کا، معرفتوں کا، رحمتوں کا، مہربانیوں کا، نوازشات کا اور بھیدوں کا، اسرارِ خداوندی جنہیں کہا جاتا ہے، خدائی بھیدوں کا، معرفت کے بھیدوں کا، علم کے بھیدوں کا، کائنات کے بھیدوں کا اور ہر چیز کے بھیدوں کا خزانہ، جب فرمایا چھپا ہوا اور اُس میں بہت سی باتیں نئی ہوں گی چھپے ہوئے کے (sense) میں۔ اُس خزانے کو پانا سب سے بڑی بات ہے اور سب سے بڑی کامیابی ہے لیکن وہ خزانہ دو طرح سے ملتا ہے یعنی اُس کے حصول کے دو مرحلے ہیں۔ مرحلۂ اوّل میں اُس کو علمُ الیقین کے طور پر پایا جاتا ہے اور مرحلۂ دوم میں عینُ الیقین اور حقُ الیقین کے طور پر پایا جاتا ہے۔ علمُ الیقین کے مقام پر آج اسماعیلیوں کے سامنے وہ خزانہ موجود ہے اور اب اِس وقت بھی اُسی خزانے کی بات ہو رہی ہے جب آپ باور کرتے ہیں اور آپ جب مانتے ہیں تو بحدِّ قوت آپ چھپے ہوئے خزانے کو پا رہے ہیں اور کل بحدِّ فعل اُس کو پائیں گے۔ بحدِّ قوت معنی امکانی طور پر اور روشن امکانات کی صورت میں آپ کے سامنے ہے یعنی آپ اِس بات کو علمُ الیقین کی روشنی میں مانتے ہیں، یقین کی حد میں مانتے ہیں، باور کرتے ہیں اور کل عملاً اُس خزانے کو پائیں گے۔

سب سے اُونچا مضمون رُوح کا ہے، خداشاسی کا ہے، توحید کا ہے، مونوریالزم کا ہے، الفاظ میں نے کئی استعمال کئے ہیں لیکن بات ایک ہی ہے کہ رُوح کی شناخت اگر کوئی معمولی بات ہوتی تو مولا امیرالمومنین علی علیہ السّلام نہ فرماتے کہ: [مَنۡ عَرَفَ نَفۡسَهُ فَقَدۡ عَرَفَ رَبَّهُ] جس نے اپنی ذات کی شناخت حاصل کرلی اُس نے اپنے پروردگار کی شناخت حاصل کر لی"، یعنی رُوح کی شناخت میں پروردگار کی شناخت کیوں ہے؟ اِس لئے کہ پروردگار کا دیدار رُوح کے رُوپ میں ہوتا ہے، رُوح کے رُوپ میں ہوتا ہے اور اُس کی سب سے بڑی تعریف ہے کہ اُس نے جو چیز بنائی ہے وہ ذاتِ یکتا کی نمائندگی کرسکتی ہے، خدا کی مہربانی کی تعریف ہے، تو عزیزانِ من! جب ہماری زندگی کے سرمائے کو اِس دُنیا میں لگانے سے یہ تجارت ہوتی ہے اور اِس عمر کی کھیتی باڑی کا یہ ثمرہ ملتا ہے تو زہِ قسمت جو مومنین ہیں دُنیا کے اندر تو اُن کو دُنیا کی کسی تکلیف کے موقع پر اُف نہیں کرنا چاہیئے۔ ہزار جانیں قربان بھی ہوجائیں اور وہ عظیم سعادت مومن کو ملے تو یہ کاوش کچھ بڑی نہیں ہے اور اِس سودے میں زیان نہیں ہے، سُود ہے اور بڑا اچھا ہے یعنی ہمیں ہزار برس کی عمر عطا ہو اور اُس ساری عمر میں دُنیا کی مشقتیں ہم جھیلتے رہیں اور ایک مصیبت کے بعد دوسری مصیبت آتی رہے تو پھر بھی اگر ہم کو آخرت کی نجات ملتی ہے، اور چھپا ہوا خزانہ ملتا ہے تو یہ کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن ہم ہیں بڑے بے ہمّت اور بے حوصلہ کہ جو آسان سے آسان عبادت ہے پابندگی ہے اور جو کچھ ہم پر بوجھ رکھا گیا ہے وہ البتہ بہت آسان اور ہلکا ہے اُس کو لے کے آگے بڑھنے کی بس کوشش ہی نہیں کرتے ہیں تو ہم نے کیا قربانیاں دیں؟

بزرگانِ دین اور پیروں کی زندگی کے واقعات آپ نے سُنے ہے اور انبیاء علیہم السّلام پر جو تکالیف آئیں اُن کا حال بھی آپ کو معلوم ہے لیکن ہم ہیں کہ بس اپنی دُنیا کے لئے سوچتے ہیں، اور جسم کے آرام کو سوچتے ہیں اور اپنی کوئی ریاضت، کوئی عبادت، کوئی محنت نہیں ہے۔ پھر بھی اگر محروم نہیں ہیں اور ایمان کے رستے پر ہیں تو شکر کرنا چاہیئے اور یہ خداوند کے حضور سے یعنی رُوح کی نعمتیں میسّر ہیں اور تعلیمات کی روشنی ہے جو دینِ حق کی طرف سے ہے تو اُس پر ہمیں شکرگزار ہونا چاہیئے اور جان و دل سے اِس گنجِ مخفی کے لئے کوشش کرنی چاہیئے۔ دیکھیں کہ دُنیا میں کوئی شخص کسی چیز کی تلاش کرتا ہے تو وہ کب کرتا ہے؟ جب وہ سنتا ہے، دیکھتا ہے کہ وہ چیز ایسی اہمیّت والی ہے اور گرانقدر ہے اور بہت ہی مفید اور اچھی ہے، خوب ہے، تو وہ اُس کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ اِسی طرح مومن کا یہ فرض ہوتا ہے کہ حقیقتوں کو ہمیشہ بیان کرے اور اپنی رُوح کے آخری درجے کو سوچیں کہ کہاں تک ممکن ہے۔ نہیں تو ہم عام روایات کے مطابق بہشت میں پھل ہے اور انگور ہیں اور درخت ہیں اور صاف شفاف پانی ہے اور پینے کو شراب ہے، دودھ کی نہریں بہتی ہیں، شہد ہے۔ اگر اِن چیزوں کو مادّی (sense) میں لیں تو ہم میں کیسی ہمت آسکتی ہے، ہمیں تو اہلِ حقیقت کی طرح سوچنا چاہیئے اور اُن حقیقتوں کو حقیقت کے طور سے پیش کرنا چاہیئے تا کہ شاید مومنین میں عالی ہمتی پیدا ہوجائے۔ اگر وہ بہشت اور مرنے کے بعد جو زندگی

ہے وہ دُنیا کی طرح ہے اور یہی نعمتیں ہیں تو پھر کیا ہوا اِس میں؟ یہ بات ہے تو دُنیا کے اندر بہت سے لوگ آج بہشت میں ہیں جن کو مادّی طور پر بہت کچھ آسائش ملی ہے، جن کو بہت ساری دولت میسّر آئی ہے اور وہ ناز و نعمت کے مزے لے رہے ہیں تو پھر مانیں گے کہ وہ بہشت میں ہیں، یہ بات نہیں ہے۔ خدا خود زبانِ قدرت سے جن نعمتوں کی تعریف فرماتا ہے، وہ بہت عالی قدر چیزیں ہیں، وہ بہت عالی قدر چیزیں ہیں۔ جنّت عربی زبان میں باغ کو کہا جاتا ہے تو انسان کی رسائی ایک باغ تک نہیں ہے، انسان کی رسائی، مومن کی رسائی خدا کی خداوندی تک ہے اور جس سلطنت کا قرآن میں ذکر ہے وہ دُنیا کی بادشاہی نہیں ہے وہ رُوح کی بادشاہی ہے، وہ وہی بادشاہی ہے جس کو ہم آج خدا کی بادشاہی کے عنوان سے یاد کرتے ہیں، خدا کی بادشاہی۔ وہی خدا کی بادشاہی مومن کی بادشاہی ہے۔ کیا خدا نے یہ نہیں فرمایا حدیثِ قدسی میں کہ: [عَبۡدِیۡ اَطِعۡنِیۡ اَجۡعَلۡكَ مِثۡلِیۡ حَیّاً لَا تَمُوۡتُ وَ عَزِیۡزاً لَا تَذِلُّ وَ غَنِیّاً لَا تَفۡتَقِرُ] اے ابن آدم! میری اطاعت کر تاکہ میں تجھے اپنے مانند بناؤں گا اور ایسی زندگی عطا کروں گا کہ تُو کبھی نہیں مرے گا۔ ایسی عزّت عطا کروں گا کہ تُو کبھی ذلیل نہیں ہوگا اور ایسی دولت دوں گا کہ تو کبھی مفلس نہیں ہوگا۔ اِس سے بڑھ کر اور کیا ہو کہ حدیثِ قدسی یا صحیح حدیث ہے وہ قرآن کی تشریح کی حیثیّت سے ہے، قرآن کی تشریح اور تاویل کی حیثیت سے ہے۔ اِس لئے مومن کو باور کرنا چاہئے اور اپنے مرتبے کو سوچنا چاہئے اور اِس مرتبے کے لئے ہر وقت کوشش کرنی چاہئے اور اگر سُستی کی گئی تو بہت اِس میں وقت لگے گا اور پھر سُستی کرنے والے کو، غفلت کرنے والے کو جہالت کی نیند سو جانا پڑے گا۔ دیکھیں کہ رسولِ اکرمؐ نے امام کو علم کا سرچشمہ قرار دیا ہے، علم کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ کیا رسولِ اکرمؐ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ: "[اَنَا مَدِیۡنَةُ الۡعِلۡمِ وَ عَلِیٌّ بَابُهَا] آپ کی ذات جو ہے وہ علم کا شہر ہے اور علی اُس شہر کی طرف جانے کے لئے گیٹ ہے۔ کیا دوسری حدیث میں آنحضرتؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ: [اَنَا دَارُ الۡحِکۡمَةِ وَ عَلِیٌّ بَابُهَا] علیؑ عالی حکمت کے گھر کے دروازے کی حیثیّت سے ہیں۔ کیا ایک اور حدیث میں یہ نہیں فرمایا کہ: [مَنۡ مَاتَ وَلَمۡ یَعۡرِفۡ اِمَامَ زَمَانِهٖ مَاتَ مِیۡتَةً جَاهِلِیَّةً] جو امامؑ کی شناخت کے بغیر مرتا ہے وہ ایسے شخص کی طرح مرتا ہے جو کہ زمانۂ جاہلیت میں رسولؐ کی شناخت کے بغیر مرا۔ اِس میں ایسے شخص کی علم سے محرومی کا ذکر ہے تو علم کا سرچشمہ امامؑ ہے۔

اگر ہم ایسے ہونے کے باوجود اِس علم سے غفلت برتتے ہیں اور ناشکری ہیں تو یہ ناشکری بہت بڑی ہوگی، بہت بڑی ناشکری ہوگی۔ اِس کے لئے میں اب اپنی گفتگو کو ختم کرتا ہوں اور مہربانی کہ آپ نے بڑی توجّہ سے نہ صرف باتوں کو سُن لیا بلکہ آپ نے دُعا کی اور آپ کی دُعا کی بدولت یہ گفتگو آگے بڑھی اور کچھ سکون ہوا۔ اِن شاء اللہ، آپ ہمیشہ دُعا کرتے رہیں۔ یا علی مدد۔

ٹائپنگ: ثناء　　نظرِ ثانی: اکبر علی　　پروف: نسرین اکبر